

وہی سٹارکاسیا کالم "موضوع سخن"
 "تربیت ہی بشر کو انسان بناتی ہے...."



اُردو ڈائجسٹ

مارچ ۲۰۱۲ء

مسل اشاعت کے ۵۲ سال

صحافت

کھیل

انکشافات

غیر ملکی ادب

تاریخی حیرتیں

نئی کتابیں

پرنسز وول مائنز

مختصر کہانیاں



وہ آج کی دنیا کسبے
 ہم نے پہلی مرتبہ
 پنجاب کی آنکھوں میں
 آنسو دیکھے، اگرچہ یہ
 آنسو کافی آنکھ کے ہیں

کیسے بنا؟

مؤثر انسان

کیسے بنا؟

صدر مجلس: ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی
مدیر اعلیٰ: الطاف حسن قریشی
مدیر تعلیم: طیب اعجاز قریشی

اردو ڈائجسٹ

مارچ ۲۰۱۲ء، ربیع الثانی ۱۴۳۳ھ جلد نمبر ۵۲ شماره ۳

مدیر: اختر عباس editor@urdu-digest.com

مجلس تحریر: حافظہ افروغ حسن، سید عامر محمود، صفیرہ بانو شیریں، محمود جمال، نوید اسلام صدیقی، سلمیٰ اجمان
مجموعات: لاروق اعجاز قریشی، ذبیحہ انور، عبدالوہاب اہلحد، بلخیس وقتان، عمران قریشی، سید عتیق، عاتق مرزا، سہیل و امجد ملک

مارکیٹنگ/اشتہارات: advertisement@urdu-digest.com

0322-7474010

مینیجر ایڈیٹر: حضرت احمد فیض

ڈائریکٹر مارکیٹنگ: ذبیحہ انور قریشی

0300-4242620

ڈائریکٹر: نجمہ مہد

0300-8460093

0300-9620294

گورنر: نور الدین احمد

info@urdu-digest.com

سالانہ خریداری: subscription@urdu-digest.com

المدون وسیع دن ملک کے خریداری رقم بذریعہ
بینک ڈرافٹ دستیاب اکاؤنٹ نمبر ارسال کریں

پاکستان: عام ڈاک 600 روپے، رجسٹرڈ 750 روپے

بیرون ملک: انگلینڈ، برائیم، ایشیا، افریقہ: \$ 50

یورپ، امریکا، آسٹریلیا: \$ 50
نوٹ: خریداری نمبر ضرور تحریر کیجئے

*URDU DIGEST

Current A/C No. 800380

Bank of Punjab (Samanabad, Lahore.)

Branch Code No. 110

ادارتی آفس: (مکتوبات کے لیے)

325, G-III جوہر ٹاؤن، لاہور

فون نمبر: +92-42-35290738

فیکس: +92-42-35290731

صدر مجلس/سرکولیشن آفس: (سالانہ خریداری کے لیے)

21/19 - ایکڑ اسکیم، مین آباد لاہور - 54500

فون: +92-42-37589957



اللہ کن سے راضی ہوتا ہے

- ★ ”اگر خیرات ظاہر کر کے وہ تو وہ بھی خوب ہے (اگر مقصد دوسروں کو ترجیح دیتا ہو) اور اگر چھپا کر فقیروں کو پہنچاؤ تو وہ بہت بہتر ہے (تاکہ لینے والا نہ شرمائے) اور (اس طرح دینے سے) تمہارے کچھ گناہوں کو بھی دور کر دے گا اور اللہ کو تمہارے سب کاموں کی خبر ہے۔ اللہ سود کو مٹاتا ہے اور خیرات کو بڑھاتا ہے۔“ (بقرہ ۲۷۴-۲۷۵)
- (یعنی سود والے مال میں برکت نہیں ہوتی بلکہ اصل بھی ضائع ہو جاتا ہے۔ خیرات دینے سے مال بڑھتا ہے جس سے خیرات بھی بڑھتی ہے)
- ★ ”جو مال پاک کرنے کے لیے اپنا مال دیتا ہے اور اس پر کسی کا احسان نہیں جس کا بدلہ وے۔ بلکہ اپنے رب کی جو سب سے برتر ہے، رضا چاہتا ہے۔ اور وہ عقیق رب راضی ہو گا۔“ (نمل ۳۱-۱۸)
- ★ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور جو (مال) اپنا نایاب کر کے تمہارے ہاتھ میں دیا ہے اس میں سے (اللہ کی راہ میں) خرچ کرو اور دلوں کے تم میں سے ایمان لائے ہیں اور خرچ کرتے ہیں ان کے لیے ثواب ہے۔“ (احزاب ۷۰)
- ★ ”اور رشتہ داروں اور محتاجوں اور مسافروں کو ان کا حق دو اور بے جا مت اڑاؤ۔ بے شک فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں۔“ (بنی اسرائیل ۲۷-۲۹)
- ★ ”اور اللہ نے رزق میں بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے تو جن لوگوں کو فضیلت دی ہے وہ اپنا رزق ان کو جو ان کی ملکیت میں ہیں، نہیں پہنچاتے کہ سب اس میں برابر ہیں تو کیا اللہ کے فضل سے منکر ہیں۔“ (نمل ۷۰)
- ★ ”اور وہ جو تم میں فضیلت والے اور صاحب ثروت ہیں، رشتہ داروں اور مسکینوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو (کسی بات پر) نہ دینے کی قسم نہ کھائیں اور چاہیے کہ معاف کریں اور درگزر کریں۔ کیا تم اس کو پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمہاری بخشش کرے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔“ (نور ۲۲)



مومن، توقعات، ذمے داریاں

★ ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر ۶ رفق ہیں۔

(۱) جب ملاقات کرے تو سلام کرے، (۲) جب وہ بگائے اس کی دعوت زد نہ کرے، (۳) جب وہ مشورہ چاہے تو نیک مشورہ دے، (۴) جب وہ چپچپے تو آنکھ لگائے کہے، (۵) جب وہ بیمار ہو تو عیادت کرے، (۶) اگر مر جائے تو جنازے میں شرکت کرے۔

★ بدو مومن اپنے دشمن پر ظلم نہیں کرتا۔ دوستوں کی رعایت میں گناہ کار نہیں ہوتا۔ امانت کو ضائع نہیں کرتا۔ لعن طعن اور حسد نہیں کرتا۔ نماز میں خشوع خضوع اور زکوٰۃ کی ادائیگی میں غفلت سے کام لیتا ہے۔ مصیبتوں میں باوقار اور نعمتوں پر شکر گزار ہوتا ہے۔ بخل اس کو نیک کاموں سے نہیں روکتا۔

★ علم و مومن کا دوست ہے اور عقل اس کی راہنما، اس کا ناظم و مہربان، نرمی و مہربانی اس کے ماں باپ اور آشتی و ملائمت اس کے بھائی ہیں۔

★ حکمت مومن کا گمشدہ مال ہے جہاں سے ملے وہ اس کو ملے اور یہ نہ دیکھے کہ کس طرف سے ظاہر ہو رہی ہے۔

★ مسلمان جب کسی مسلمان کی عیادت کرتا ہے تو جب تک وہ واپس نہ آئے جنت میں مقیم رہتا ہے۔

★ مومن کو اس کے ہر خرچ پر ثواب ملتا ہے لیکن جو مٹی اور تعمیر پر خرچ ہو اس پر اجر نہیں ملتا۔

★ خدا ایک مومن صالح کی وجہ سے اس کے سو پڑوسیوں کو بلا سے محفوظ رکھتا ہے۔

★ مومن ایک سوراخ سے دوسرے نہیں ڈسا جاتا۔

★ مومن میں بخل اور بد خلقی جمع نہیں ہوتی۔

★ مومن تلوار اور زبان سے جہاد کرتا ہے۔

الحجاب: حافظ افروغ حسن، مخدوم "رحمۃ اللعالمین کے احسانات"



۴۱۲ فیصد سالانہ کی رفتار سے
ترقی کرنے والی کمپنی

صوفی زار

اس مقام پر کیسے پہنچی؟
اختر عباس

۳۱

کس چیز نے اُسے
دُنیا کا سب سے

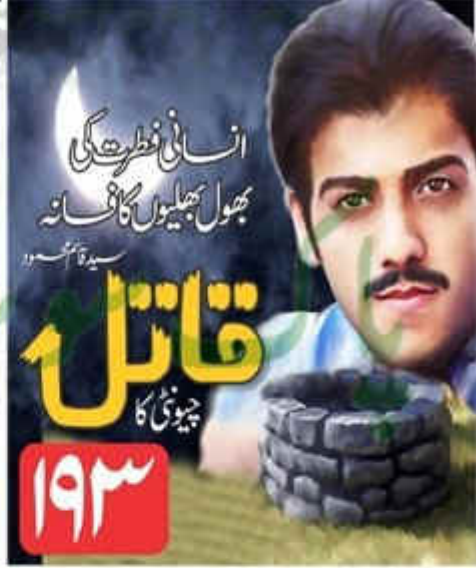
مؤثر انسان

بنادیا؟
سید عاصم محمود

۸۹

اس شارے میں کیا کجیاں ہے

۱۵	الطاف حسن قریشی	کچھ اپنی زبان میں	ادارہ
۱۷	الطاف حسن قریشی	ہم کہاں گھر سے ہیں	نہجہ
۳۱	ظفر خان	میں ابھی نیم پہ یقین رکھتا ہوں	بزنس - رول ماڈل
۴۵	امیر الدین مہر	جن پہ ہے امت کو ہار	اسلامی زندگی کی گزشتہ
۵۲	وسی شاہ	تربیت ہی بشر کو انسان بناتی ہے	موضوع سخن
۶۱	وقار صوفی	یہ "تیس" ہیں کون؟	عالمی منظر نامہ
۶۵	نویہ اسلام صدیقی	سات ملک سات کہانیاں	سٹارلک
۸۹	سید عاصم محمود	گرد ارض کا مؤثر ترین انسان	سرورق کی گزشتہ
۹۷	آمنی طاہرہ	ولچسپ و عجیب واقعات	انوکھے واقعات
۱۰۳	سید عاصم محمود	۲۰۲۳ میں خوش آمدید	مستقبلات
۱۱۱	رضوان علی شاہ	پانچ تاریخی براہمجیاں	عہد و اسرار
۱۱۶	ظفر جمال بلوچ	سرور عطا اللہ میٹنگل سے ملاقات	بدارش بغیر
۱۲۰	نویہ اسلام صدیقی	۲۱ سے ۲۳ مارچ - تین دن	تاریخ
۱۲۵	اختر حسین شیخ	می لارڈ، کوئٹہ صفا کی درست فرماتے ہیں	تازہ بغیر گیس
۱۲۷	سیا شیش	کتابوں سے دوستی	کتاب بینی



اس شمارے میں کیا کہیا ہے

۱۲۹	حبیب اشرف سہمی	آج سے باوا دیا رہی ہے	سفر ممتاز
۱۳۳	انجناز احمد ڈنگہ	کم عمری میں بارت ایک	امتیاز
۱۳۴	میر یار مشتاق	موساد اسرائیل کی پہلی دفاعی لائن	المناسبات
۱۴۱	نویس احمد زبیری	یہ ڈرا جا پان تک	سفر نامہ
۱۴۸	رانا محمد شاہد	کھیلوں کی دنیا	کشمیر کشمکش
۱۵۲	انجنا فتح	ہاں میں نے تمہارے ساتھ جانا ہے	دکھ سہری جاو
۱۵۳	فرید دھام	دو مہروں کے جہاز رنٹائے میں آتی ہے تابی	سرفہ
۱۵۷	رضوان علی	مسلمان پادشاہ گریں گے	ہندوستان سے
۱۵۹	رخسانہ فاضل	دنیا کی پست قامت لڑکی	حیران حیرت
۱۶۱	سید قاسم محمود	جنونی کا قاتل	
۱۶۶	اختر عباس	وارث	
۱۷۱	برنارڈ مالکود	معافی	
۱۸۵	فرید رک فورسٹ	گڑھا	کیرنیاں
۱۹۳	ڈاکٹر انھام منظم	سزا	
۱۹۸	لیونارڈی	رہائی	



ہم نے پہلی مرتبہ
پنجب کی آنکھوں میں
آنسو دیکھے، اگرچہ یہ
آنسو کافی آنکھ کے ہیں

۱۱۶

محنت و بلوغ و اجتناب
سردار عظیم اللہ مینگل
تے ایک بڑے کامدست کا حوالہ



ہماری ایک پنی
خاندان
کے مانند ہے

۲۲۵

اگر کسی کے شریک یا سیری جوج
تے ایک گھر کی سیر اور دلچسپ ملاقات

اس شمارے میں کیا کہیا ہے

۲۰۵	چاؤیدہ بسام	اللہ کی مرضی	گولڈ
۲۰۹	اختر حسین شیخ	مزارِ وفا	القدرت
۲۲۵	راجہ ذہیریں	ہماری کہنی ایک خاندان کے مانند ہے	الربی گرفت
۲۲۹	عمر اور یس	یتیم بچوں کے لیے محبت بھری "آغوش"	جولہ قابل
۲۳۳	عمود احمد شفیق	کشور تابیہ کی "شنا سائیاں"	مستقل کام
۲۳۸	تحفیم من صدیقی	ہم کسی سے کہ نہیں	خصوصی سروے
۲۴۲	صبح جاناو شریں	مشہورہ حاضر ہے	دنیا کی صحت
۲۴۸	فریدہ خانم	خواتین کی بے اختیاری	تحقیق و جستجو
۲۵۳	غابروہ اعجاز ڈنگہ	صحت کی دنیا	بغیر کمی صحت
۲۵۷	عاطف مرزا	قتل کے قدرتی گواہ کیڑے	ایسا وزن سنبھالیے
۲۶۰	فوزیہ عباس	اپنے بچوں کی آنکھوں کا خیال رکھیے	کتاب گھر
۲۶۶	نوشین ہار	وزن کم کریں مگر صحت نہیں	خطرہ
۲۷۲	نویا اسلام صدیقی	مطالعے کی میز پر	درآمد و دستک
۲۷۹	قارین	بہن خیال	
۲۸۵	اختر عباس	ایسا گل میرے گل کا	

حقیقی نمائندگی کا ایک متاثرہ اہم نظام

ہماری سالمیت اور بقا جن خطرات سے دوچار ہے، ہمارے منتخب ادارے جس بے حسی کے ساتھ عوام کے بنیادی مسائل حل کرنے اور قومی زندگی کو اچھے قوانین کا فریم ورک مہیا کرنے میں ناکام چلے آ رہے ہیں، ہماری سیاست میں جو آئے دن خوفناک بحران سر اٹھاتے رہتے ہیں، ہم اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے بجائے اغیار سے ہیک مائٹنے پر فخر محسوس کرنے لگے اور ہمارے معاشرے میں نفرتوں اور تشدد کا زہر سرایت کرتا چلا جا رہا ہے اس کا سب سے بڑا سبب جمہوریت کے نام پر انتخابات کے ذریعے ایک سیاسی مافیا کا ملکی اقتدار پر قابض ہو جانا ہے۔ گزشتہ پانچ چھ عشروں میں انتخابات کا مالک وہ چھوٹا سا طبقہ چلا آ رہا ہے جس نے فوجی طاقت یا ایک غیر منصفانہ اور فرسودہ انتخابی نظام کے بل بوتے پر عوام کی حقیقی نمائندگی کے خواب کو شرمندہ تعبیر نہیں ہونے دیا اور پاکستان کو ہولناک بحرانوں کے گرداب میں دھکیل دیا۔ اس اذیت ناک عذاب سے نجات پانے کے لیے نو جوان ایک حقیقی اور مخلص قیادت کی تلاش میں سرگرداں ہیں مگر خاندانی موروثیت کی بے سادگیوں کے سہارے اپنا تادم جام قائم رکھنے والے سیاسی زعماء اس جستجو کی راہ میں دھڑکنے والے اور کلیدی اہمیت کی انتخابی اصلاحات کے عمل میں رکاوٹ ثابت ہوئے ہیں۔

حال ہی میں سینیٹ کے انتخابات میں سیاسی جماعتوں نے جس غیر اخلاقی جوڑوڑ کا مظاہرہ کیا، اس نے پارلیمنٹ کے ایوان بالا کو ایک بدترین نامزدگی کا نمونہ بنا دیا ہے۔ آئین میں اس ادارے کے لیے جو انتخابی کاغذ متعین ہے، اس کے ارکان رائے دہی کے حق سے محروم کر دیے گئے اور زیادہ تر وہی افراد باقاعدہ انتخاب کے بغیر سینیٹر بنا دیے گئے جو پہلے سے اس ایوان میں موجود تھے یا وہ موروثی سیاسی قیادتوں کے منظور نظر تھے۔ اُن امیدواروں کو صوبائی الیکشن کمیشنوں نے نامزدگی کے کاغذات منظور کرتے وقت یہ بھی نہیں بتایا کہ آپ کے اثاثے کروڑوں میں ہیں جبکہ آپ ٹیکس ہزاروں میں بھی ادائیگی کرتے اور یوں ٹیکس چوری کے مرتکب ہونے کے سبب وہ آئین کی شق ۶۳ کی زد میں آتے ہیں۔ سیاسی جعل سازی پر مبنی اس عمل سے

بے زار قوم کے باشعور طبقے یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ اس ادارے کے براہ راست انتخابات ہونے چاہئیں تاکہ عوام اپنے حقیقی نمائندے ایوان بالا میں بھیج سکیں جو امریکی سینیٹ کی طرح ایک مؤثر کردار ادا کر سکے۔

ہمارے سیاسی قائدین ۲۰ روئیں آئینی ترمیم کی متفقہ منظوری کو ایک تاریخی فتح سے تعبیر کر رہے ہیں، مگر اس ترمیم سے عوام کی حقیقی نمائندگی اور شفاف انتخابات کے تقاضے پورے نہیں ہوں گے۔ سینیٹ کی بھاری اکثریت نے ۳۶ کروڑ کے ترقیاتی فنڈ ز سیاسی بنیادوں پر حاصل کرنے کے بعد کسی غور و خوص کے بغیر انتہائی غلبت میں منظور کر لی ہے اور صرف جماعت اسلامی کے ۲ سینیٹروں نے مخالفت میں ووٹ ڈالے ہیں۔ دراصل آئین میں درج الیکشن کمیشن کی ساخت پر نظر ثانی کی اشد ضرورت ہے جس کے مطابق چیف الیکشن کمشنر اور کمیشن کے ارکان سپریم کورٹ اور ہائی کورٹس کے ریٹائرڈ جج صاحبان ہی سے لیے جاسکتے ہیں۔ وقت نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ نہ رسیدہ ہونے کی وجہ سے اپنی بھاری بھر کم ذمے داریاں خوش اسلوبی سے ادا نہیں کر پاتے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ انتظامی امور کی بجائے آوری کا کوئی تجربہ نہیں رکھتے۔ جبکہ پورے ملک میں بیک وقت قومی اور صوبائی انتخابات کا انعقاد غیر معمولی انتظامی صلاحیتوں کا تقاضا کرتا ہے۔ اس تناظر میں سنجیدہ حلقے شدت سے محسوس کر رہے ہیں کہ الیکشن کمیشن کی بناوٹ کا دائرہ وسیع کیا جائے اور اس میں سول سروس کے اعلیٰ منتظمین بھی شامل کیے جائیں جیسا کہ بھارت میں شروع ہی سے سول سروس کے تجربے کار افراد ہی بڑی کامیابی اور ہنرمندی سے آزادانہ اور منصفانہ انتخابات منعقد کراتے آئے ہیں۔

اب قومی حلقوں میں یہ سوچ بھی پرورش پا رہی ہے کہ عوام کی حقیقی نمائندگی کو یقینی بنانے کے لیے مناسب نمائندگی کا نظام بہت بہتر ثابت ہو سکتا ہے کہ اس میں ووٹ ضائع نہیں ہوتے اور چھوٹی سیاسی جماعتوں کو بھی نمائندگی کا موقع مل جاتا ہے۔ اگر جرمنی میں رائج مناسب نمائندگی کا نظام اپنایا جائے تو اس میں انتخابی حلقے بھی قائم رہتے ہیں اور سیاسی جماعتوں کو قابل اور تجربے کار شخصیات کو بھی پارلیمنٹ میں بھیجنے کا موقع مل جاتا ہے۔ اس نظام کی رو سے آدھی نشستیں انتخابی حلقوں کے لیے مخصوص ہوتی اور ڈالے ہوئے ووٹوں کے تناسب سے آدھی نشستیں سیاسی قیادتیں نامزد کرتی ہیں جن کی فہرستیں پہلے سے متعارف کرا دی جاتی ہیں۔ مجوزہ ناموں پر قومی بحث میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ ان کا استحقاق کیا ہے۔ عوامی باز پرس کے خوف سے سے سیاسی فہرستیں مرتب کرتے وقت اس امر کا پورا پورا خیال رکھا جاتا ہے کہ ان میں کوئی ایسا نام شامل نہ ہونے پائے جو سیاسی اخلاقیات پر پورا نہ اترتا ہو۔ اس نظام کے تحت دو تین جماعتوں کی آمریت قائم نہیں ہو سکتی اور قومی فیصلوں میں زیادہ سے زیادہ سیاسی عناصر شامل ہوتے ہیں اور ملک کے اندر مخلوط حکومتوں کا کلچر فروغ پاتا ہے جس میں حقیقی مفاہمت اور قوت برداشت کا جو ہر غالب رہتا ہے۔

الطاف حسن قندہا



ہم کہاں کھڑے ہیں



انجیل سن قریبی کے سہم سے

آنے والے حالات کا تجزیہ

مستقبل کے نازک مرحلے

ہم پر مشکل وقت آن پڑا ہے جسے حوصلہ و دانش مندی اور ایشارے عظیم امکانات میں تبدیل کیا جاسکتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے اندھیری رات میں چمکنے والے ان گنت ستارے اپنے خون سے محسوس پیدا کرتے ہیں

زندہ

تو میں آفات اور مسائل سے گھبرانے کے بجائے ان کے اسباب کے سائنٹیفک تجزیے اور ان کے حل پر اپنی توجہ مرکوز رکھتی ہیں۔ قیام پاکستان کے وقت برصغیر کے مسلمانوں کو آگ و خون کے دریا عبور کرنا پڑے تھے اور ابھی سے اس کے وجود کو طرح طرح کے خطرات لاحق ہیں۔ اس کا نظریاتی تشخص اس کا اسٹرٹجک محل وقوع، اس کی ایشیائی صلاحیت، اس کی عظیم ماہی طاقت اور اس کی بیش بہا افرادی قوت اسے عالمی برادری میں ایک ممتاز مقام عطا کرتی ہیں جبکہ بین الاقوامی ہمارے لیے ایک چیلنج کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ یہ نیا ملک جن علاقوں پر مشتمل تھا، دو سیاسی، اقتصادی اور سماجی اعتبار سے بے حد پیچیدہ اور جاگیردارانہ نظام کے قبضے میں تھا جس نے جمہوری مزاج، جمہوری روایات اور جمہوری اداروں کو نشیمن اور مضبوط ہونے نہیں دیا۔ بدقسمتی یہ کہ خاندانی موروثیت نے سیاسی جماعتوں پر بھی غلبہ حاصل کر لیا۔ دو سیاسی قیادت جس نے قیام پاکستان کی جدوجہد میں کلیدی کردار ادا کیا تھا، دو ابتدائی چند برسوں ہی میں دنیا سے رخصت یا دُریوں اور سرداروں کی ریشہ وانیوں کے سامنے بے بس ہو گئی۔ اس قومی حادثے اور بھارت کے معاندانہ رویے کے باوجود ہمارا ملک ترقی اور خوشحالی کی راہ پر چلتا رہا جبکہ ہماری قوم دیانت و ارقیادت سے محروم رہنے کے باعث بہت پیچھے رہ گئی۔ آج ہمیں جن بڑے بحرانوں کا سامنا ہے ان کا بڑا سبب عوام کی بدحالی ہے چارگی اور تعلیم کی کمی جبکہ خواص کی بے بسی خود غرضی اور حد سے بڑھی ہوئی مفاد پرستی اور اخلاقی پستی ہے۔ ان گنت سیاسی اور نفسیاتی بیماریوں کے سبب ملکی معاملات پر سیاست دانوں کی گرفت کمزور ہونے سے فوج کو بار بار

اقتدار میں آنے کا موقع ملا۔ فوجی سوچ سیاسی سوچ سے یکسر مختلف ہے کیونکہ سیاسی عمل مشاورت کو فروغ اور فوجی اقتدار آمریت اور مرکزیت کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ ہماری ۶۵ سالہ تاریخ میں فوج کو براہ راست تیس برس سے زائد حکومت کرنے کا موقع ملا ہے جبکہ پچیس پر وہ فیصلہ سازی پر اثر انداز ہونے کی مدت اور بھی طویل ہے جس میں زیادہ تر تنظیمیں اور تاریخ شکن بحران آتے رہے۔ فوجی آمریت نے ہمارے معاشرے کا سیاسی، اخلاقی اور سماجی تار پود کھینچ ڈالا، طاقت کے استعمال کا چلن عام کیا اور اس چلن کا اس قدر غلبہ ہوا کہ ہماری سول بیوروکریسی اور ہماری سیاسی قیادتیں بھی آمرانہ طور و طریق سے فیصلے کرنے لگیں۔ یہی ذہنیت آج بھی کارفرما ہے جو مسائل کے ادا کو ہوا دے رہی ہے۔

آج بلوچستان ایک انتہائی کمبیر مسکے کی شکل اختیار کر چکا ہے اور بین الاقوامی توجہ کا مرکز بننا چاہا ہے۔ پاکستان کا دوسرا بڑا بحران پاک امریکا تعلقات میں کشیدگی سے پیدا ہوا ہے جو خطرناک علاقائی اور عالمی مضمرات کا حامل ہے۔ سول اور فوج کے مابین سننے ہوئے روابط بھی داخلی اور خارجی چیلنج بنتے جا رہے ہیں۔ میمواییشن بھی اسی چیلنج کا شاخسانہ ہے جس نے قومی سلامتی کے مسائل جنم دیے ہیں۔ لاپتہ افراد کی تعداد میں روز افزوں اضافے سے جہاں پورے ملک میں ایک بابا کار بھی ہوئی ہے وہاں بلوچستان کا زخم گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ ایگزیکٹو اور عدلیہ کے مابین بھی رسائی جاری ہے جس نے جناب وزیراعظم کے مستقبل پر بڑے بڑے سوالات اٹھا دیے ہیں۔ مزید برآں شدت پسندی اور دہشت گردی نے پاکستان کا چہرہ مسخ کر ڈالا ہے اور عالمی برادری میں اسے ملامتوں اور فزقوں کا سامنا ہے۔ ملکی وسائل کا ایک بڑا حصہ دہشت گردی کے خلاف جنگ پر اٹھ رہا ہے اور امریکا نے سپورٹ فنڈ اور کیری لوگرل کے تحت دی جانے والی امداد سے ہاتھ کھینچ لیا ہے۔ کرپشن اور بد انتظامی نے گزشتہ چار برسوں میں آٹھ ہزار ارب سے زائد روپے چاٹ لیے ہیں جبکہ احتساب کے فقدان سے حکومت کی مشینری رنگ آلود ہو چکی ہے اور ڈیپوری سسٹم بدترین نا انصافی اور بد انتظامی کا شکار ہے۔ توانائی کے بحران سے لوگ بیروزگار ہو رہے ہیں اور غربت عام آدمی سے جینے کا حق چھین لینے پر مبنی ہوئی ہے۔ عوام اپنے حکمرانوں سے شدید بیزار ہیں اور ایک قلعہ اور دیانت دار قیادت کے لیے دعائیں مانگ رہے ہیں۔

مسائل اور مشکلات سے خوفزدہ ہمارے بعض دانش ور پاکستان کے بارے میں نا اُمیدی پھیلانے والی کتابیں شائع کرتے رہتے ہیں۔ ان میں جناب رونیداد خان کی تصنیف ”وہ خواب جو بے کیف ہو گیا“ جناب طارق علی کی ”ایک ریاست کی موت“ جناب احمد رشیدی کی ”انتشار کی طرف نزول“ اور جناب شیر باز خاں مزاری کی ”پاکستان: حقیقت جینی کی طرف سفر“ قابل ذکر ہیں۔ اس کے برعکس ”ان دنوں پچھلے کتابیں منظر عام پر آئی ہیں جو مسائل میں گھرے ہوئے پاکستان کی جوہری قوت اور اس کی عظمت کی گواہی دیتی ہیں۔ ان میں محترمہ فرزانہ سخی کی تازہ تصنیف ”پاکستان کی معنویت“ اور اناطول لیون کی فکر انگیز کتاب ”ایک سخت جان ملک“ حقائق اور مسائل کا سامنا کرنے کا حوصلہ عطا کرتی اور قارئین کے اندر شہسواروں کے ساتھ یہ شعور ابھارتی ہیں کہ پاکستان میں زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی ہجرا نہ صلاحیت پائی جاتی ہے۔ اناطول نے پاکستانی معاشرے کی سخت جانی کا راز اس کے مضبوط اور مستحکم خاندانی نظام کی ایک جہتی میں دریافت کیا ہے جو ریاست کو کام ہونے سے محفوظ رکھے ہوئے ہے۔

ہیڈر سیاسی رہنما یہ کہنے میں قدرے حق بجانب ہیں کہ بلوچستان میں مشرقی پاکستان جیسے حالات پیدا کیے جا رہے ہیں اور ہمارے حکمرانوں نے تاریخ سے کوئی سبق نہیں سیکھا اور وہی غلطیاں دہراتے چلے آ رہے ہیں جن کے باعث ہمارا ملک

۱۹۷۱ء میں دولت ہو گیا تھا۔ ستوپ ڈھاکہ کی اصل وجہ مغربی اور مشرقی پاکستان میں اعتماد کا فقدان تھا جو دشمنی کی حدوں کو چھوئے لگا تھا۔ اس بے اعتمادی کا بیج مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے ان بیوروکریٹس نے بویا تھا جو مشرقی بنگال کو اپنی کالونی سمجھتے اور اس صوبے کے شہریوں سے غلاموں جیسا سلوک روا رکھتے تھے۔ دوسرا بڑا مسئلہ آئینی حقوق اور منصفانہ سیاسی نمائندگی کا حصول تھا۔ مشرقی بنگال کی آبادی مغربی پاکستان سے زیادہ تھی جو اسے قومی اسمبلی میں اکثریت کا حق دیتی تھی۔ وزیراعظم محمد علی بوگرانے غیر معمولی سیاسی بصیرت اور باطنی گفت و شنید سے ایک ایسا آئینی فارمولہ وضع کر لیا تھا جس کے مطابق ایوان زیریں میں مغربی بنگال اور ایوان بالا میں مغربی پاکستان کی اکثریت تھی اور اہم قومی امور کا فیصلہ دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس میں کیا جانا تھا۔ یہ آئین تیسری خواندگی کے بعد ۲۵ دسمبر ۱۹۷۳ء کو نافذ ہونا تھا مگر یہ ساری محنت ایک بہت بڑی سازش کی نذر ہو گئی۔

جنرل ایوب خاں پہلی دستور ساز اسمبلی میں دستور پر بحث کے وقت لندن کے ایک آرام وہ ہوٹل میں اپنے طور پر پاکستان کے دستور کے خدوخال مرتب کر رہے تھے۔ اس میں ون یونٹ کا قیام اور مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان براہری (جیری) کا اصول جو یز کیا گیا تھا۔ فوجی قیادت کی طرف سے اشارہ یا کر فوج زدہ گورنر جنرل غلام محمد ملک نے ۲۳ اکتوبر کی شام دستور ساز اسمبلی تو ڈھالی جو ہماری تاریخ کا ایک سیاہ باب ثابت ہوا۔ مختلف مراحل طے کرنے کے بعد اسی بنیاد پر دوسری دستور ساز اسمبلی نے نیا دستور منظور کیا جو ایوب خاں کی آئینی اسکیم کے اندر فراہم کی گئی تھی۔ مشرقی پاکستان کے عوام نے قوم کے وسیع تر مفاد میں ۸ سال کے شدید انتظار کے بعد دستور کے نفاذ پر بہت خوشی کا اظہار کیا مگر انہیں اپنی اکثریت چھین جانے کا ہمیشہ بہت قلق رہا تھا۔ دو سال بعد جب جنرل ایوب خاں کی حمایت سے صدر اسکندر مرزا نے ۱۹۵۶ء کا دستور ہی ختم کر ڈالا تو وہ بنیاد بھی منہدم ہو گئی جس پر ایک ساتھ رہنے کا عمرانی معاہدہ وجود میں آیا تھا۔ اس حادثے کے بعد مشرقی پاکستان میں آئینی اور سیاسی حقوق کی پامالی کا احساس مختلف خشکیوں اختیار کرتا اور تلخ دگی کے رجحانات تقویت پاتے رہے۔ دونوں بازوؤں کے درمیان جدائی کا فیصلہ کن مرحلہ اس وقت آیا جب ۱۹۷۰ء کے انتخابی نتائج سے قومی اسمبلی میں مشرقی پاکستان کو اکثریت حاصل ہو گئی تو بیٹھی خاں نے اس کا اجلاس غیر معینہ مدت کے لیے ملتوی کر دیا اور اس اقدام کے خلاف عوام اُٹھ کھڑے ہوئے۔ بغاوت فرو کرنے کے لیے طویل عرصے تک فوجی آپریشن جاری رہا جس میں فوج کو شکست ہوئی اور پاکستان دولت ہو گیا۔

جنرل ایوب خاں کے دستوری نقشے پر عمل پیرا ہونے سے مغربی پاکستان میں بھی سنگین مسائل پیدا ہوئے۔ ون یونٹ کے قیام سے فائدہ کم اور نقصانات بے حساب ہوئے۔ وسیع و عریض مغربی پاکستان کو ایک انتظامی یونٹ میں تبدیل کرنے اور لاہور کو اس کا صدر مقام بنادینے سے عوام کی گونا گوں مشکلات اور پنجاب کے خلاف نفرتوں میں بے پناہ اضافہ دیکھنے میں آیا۔ پنجاب جس کا مغربی پاکستان اسمبلی میں حصہ آبادی کے لحاظ سے ہاؤنٹی صد بنتا تھا نے ایثار کا ثبوت دیتے ہوئے ۴۰ فیصد پر قناعت کی لیکن وہ چونکہ اختیارات کے منبع کی حیثیت اختیار کر گیا تھا اس لیے خیر سے لے کر مکران کے ساحل تک اس کے خلاف شدید بے زاری اور عداوت کے جذبات پیدا ہوئے۔ صوبوں کو اپنی شناخت اور اپنے اختیارات کے چھین جانے کا بہت غم تھا چنانچہ ان کے اندر مزاحمتی تحریکیں زور پکڑتی گئیں۔ بلوچستان میں بار بار بغاوتیں ہوئیں اور فیلڈ مارشل صدر ایوب کی حکومت نے بغاوت کے بنیادی کردار نوروز خاں کے ساتھ قرآن حکیم پر حلف

انھانے کے باوجود اس کے ساتھی سولی پر لٹکا دیے۔ ون یونٹ کے زمانے ہی میں سندھ کے نوجوان اپنی تہذیبی شناخت اور سیاسی حقوق کی جنگ میں شامل ہوئے اور پنجاب کی بالادستی کے خلاف شعلے اُگنے لگے۔ صوبہ سرحد میں پختون مصیبت میں غیر معمولی شدت آئی اور مرکز گریز رجحانات روز بروز طاقت ور ہوتے گئے۔ ۱۹۶۸ء میں جب ایوب خانی حکومت کے خلاف ایک بااثر پولو فان اٹھا تو اس میں انہی مصیبتوں اور نظرتوں کے تمام صحرانے شامل تھے۔ جزل یگی خاں جب ۱۹۶۲ء کا دستور روٹ کر برسرِ اقتدار آئے تو انہوں نے ون یونٹ توڑنے اور بیرونی کا اصولی احترام کرنے کا اعلان کیا جس پر پورے ملک میں خوشی کی لہر دوڑ گئی، مگر پنجاب جسے ایک سامراج کے طور پر ۱۵ سال تک پیش کیا جاتا رہا تھا اس کے مضمر اثرات آج بھی ہماری سیاسی انقیاسات میں غالب ہیں اور بلوچستان کے بحران کو اکبراً کرنے میں ایک بہت بڑا منفی کردار ادا کر رہے ہیں۔

بادی انظر میں بلوچستان اور مشرقی پاکستان کے حالات میں خاصی مشابہت پائی جاتی ہے جو انتہائی سنجیدہ غور و فکر اور مؤثر اقدامات کا تقاضا کرتی ہے۔ مشرقی پاکستان آبادی کے لحاظ سے پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ تھا جبکہ بلوچستان کو رقبے کے لحاظ سے یہی اعزاز حاصل ہے۔ مشرقی پاکستان کی طرح بلوچستان کے ساتھ بھی سول اور ملٹری ہیرو و گریسی کے ہاتھوں بڑی زیادتیاں اور نا انصافیاں ہوتی رہی ہیں جن کے خلاف اب جذبات کا ایک آتش فشاں پھٹ پڑا ہے۔ دونوں صوبوں کے حالات کے درمیان یہ مشابہت بھی پائی جاتی ہے کہ مشرقی پاکستان کی اسمبلی کی طرح بلوچستان کی اسمبلی بھی بے اختیار اور بڑی حد تک غیر مؤثر ہے۔ اقتصادی لحاظ سے مشرقی پاکستان بھی پس ماندہ تھا اور بلوچستان بھی در ماندگی کی تصویر بنا ہوا ہے حالانکہ وہ قدرتی وسائل سے مالا مال ہے۔ وہاں مسائل کا فوجی حل تلاش کرنے کی ضد میں حالات قابو سے باہر ہوئے تھے اور یہاں بھی طاقت کے بے جا اور ظالمانہ استعمال سے معاملات بگڑتے جا رہے ہیں۔ مشرقی پاکستان میں ایک بیرونی طاقت نے ملکی باہمی کو جنم دیا تھا جبکہ بلوچستان میں بھی بیرونی طاقتیں بلوچ گوریلوں کی پشت پر ہوسکتی ہیں۔

ان چند مماثلتوں کے باوجود ۱۹۷۱ء اور آج کی صورت حال میں کئی اعتبار سے بہت زیادہ اختلاف پایا جاتا ہے۔ سب سے بڑا فرق جغرافیائی وحدت اور علاقائی تسلسل کا ہے۔ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے مابین ایک ہزار میل کا فاصلہ تھا اور ان کے درمیان بھارت واقع تھا۔ اس جغرافیائی دوری کی وجہ سے عوام کے مابین مضبوط رابطے قائم نہ ہو سکے۔ زبان کا اختلاف بھی راستے میں حائل رہا۔ دو اطراف سے بھارت میں گھرے ہوئے مشرقی پاکستان کے لیے خود کفیل دفاعی انتظامات بھی بڑے دشوار تھے۔ اس کے برعکس بلوچستان پاکستان کے ساتھ جغرافیائی وحدت میں جکڑا ہوا ہے جدید ذرائع مواصلات نے فاصلے کم کر دیے ہیں اور لوگ آپس میں گارو بار بھی کر رہے ہیں اور وسیع تر سیاسی مل میں بھی شریک ہیں۔ الیکٹرانک میڈیا نے قومی یک جہتی کو بہت فروغ دیا ہے اور خدمتِ خلق کے متعدد ادارے باہمی رشتوں میں استحکام پیدا کر رہے ہیں۔ دوسرا بڑا فرق یہ ہے کہ بلوچستان میں بلوچوں کے علاوہ پشتون اور آباد کار بھی رہتے ہیں جو تعلیم یافتہ ہونے کی بدولت خوشحال بھی ہیں اور اپنے صوبہ کی معیشت میں زبردست کردار ادا کر رہے ہیں۔

ایک سو دس کے مطابق بلوچستان کی کل آبادی بہتر لاکھ نفوس پر مشتمل ہے جس میں ۳۰ لاکھ بلوچ، ۲۷ لاکھ پشتون اور ۱۵ لاکھ آباد کار اور سندھی قبائل ہیں جن کا بڑا حصہ اپنا مستقبل پاکستان کے بندوبست محفوظ سمجھتا ہے اور اپنے حقوق سیاسی جدوجہد کے ذریعے حاصل کرنے پر یقین رکھتا ہے۔ زیادہ تر بے چینی ۳۰۰۰ املاک میں سے فقط چار پانچ املاک

کوئی سستی، ڈیرہ بجتی، خضدار اور تربت کی چند تحصیلوں میں پائی جاتی ہے۔ ان پر پھر پور توچہ مرکوز کر دینے اور جائز مطالبات کسی میل و جہت کے بغیر تسلیم کرنے سے مذاکرات کی راہ نکل سکتی ہے اور ناراضی اور برگشتہ بھائیوں کو وکیل سے قائل کیا جا سکتا ہے۔ مشرقی پاکستان اور بلوچستان کی صورت حال میں ایک اور بنیادی فرق یہ بھی ہے کہ مشرقی پاکستان میں آئینی اور سیاسی حقوق کی جنگ لڑنے والوں کو شروع ہی سے عوام کی تائید حاصل تھی۔ وہاں ۱۹۵۴ء میں پہلے انتخابات ہوئے جن میں حکمران مسلم لیگ عبرت ناک شکست سے دوچار ہوئی اور اسے صرف ۹ نشستیں مل گئیں۔ اس کے بعد جتنے بھی انتخابات ہوئے ان میں عوامی لیگ کی طاقت میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس کے برعکس بلوچستان میں ۱۹۸۵ء سے لے کر اب تک جتنے بھی انتخابات ہوئے ہیں ان میں نام نہاد قوم پرست جماعتوں کو ۵۰ فیصد نشستیں بھی نہیں ملیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ عوام کی بھاری اکثریت مسلح جدوجہد اور ملحد کی پسند پر تقانات کے حق میں نہیں۔ آج زرعی حقائق یہ ہیں کہ شورش پسندوں کے سرغنہ اپنے علاقوں میں نہیں جاتے کہ انہوں نے اپنے لوگوں پر جبر و استبداد کی انتہا کر دی تھی۔

قیام پاکستان سے پہلے بلوچستان دو حصوں پر مشتمل تھا۔ ایک حصہ برٹش بلوچستان کہلاتا تھا جو برطانوی حکومت کے زیرِ تسلیم تھا۔ اس میں پشتون، کاکڑ قبیلے کے علاوہ مری اور بگٹی قبائل کے علاقے بھی شامل تھے جن کے سیاسی امور کوئٹہ میونسپل کمیٹی اور پشتون اور بلوچ سرداروں کی نمائندہ تنظیم ”شاہی جرگے“ کی مشاورت سے چلائے جاتے تھے۔ دوسرا حصہ ۴ ریاستوں کی کنفیڈریشن پر مبنی تھا جس میں قلات، لسبیلہ، خاران اور مکران شامل تھے۔ تفصیل پاکستان کے وقت برٹش بلوچستان میں ۲۹ جون ۱۹۴۷ء کو ہونے والے ریفرنڈم میں کامل اتفاق رائے سے پاکستان میں شمولیت کا فیصلہ ہوا۔ اس فیصلے میں نواب اکبر بگٹی کے چچا نے بھی حصہ لیا تھا۔ پاکستان بن جانے کے بعد ان ریاستوں کا معاملہ سامنے آیا جن کے برطانوی حکومت کے ساتھ نیم واطعی خود مختاری کے معاہدے تھے۔ خان آف قلات کے قائد اعظم سے اچھے مراسم تھے جسے انہوں نے پاکستان میں شامل ہونے کا مشورہ دیا۔ اس نے سختی و دربار کے موقع پر فروری ۱۹۴۸ء میں پاکستان سے الحاق کے اعلان کا وعدہ کیا، مگر وہ بیماری کا غرر کر کے غائب ہو گیا۔ لسبیلہ، خاران اور مکران کے نوامین جو کنفیڈریشن میں شامل تھے وہ ریاست قلات کے وزیر اعظم شمس الدین کی بدانتظامیوں اور دست درازیوں بے حد متحضر تھے اور ان کے خلاف ”شمس گردی“ کے نام سے کتاب بھی شائع ہو چکی ہے۔ یہ تینوں نواب بہت پہلے پاکستان سے الحاق کرنا چاہتے اور قائد اعظم سے ملاقات کے خواہش مند تھے۔ قائد اعظم کی یہ خواہش تھی کہ الحاق کا اعلان خان آف قلات کے ساتھ کیا جائے، لیکن جب خان آف قلات نے وعدہ خلافی کی تو قائد اعظم نے تینوں ریاستوں کے نوامین کو کراچی میں ملاقات کا وقت دیا جس میں انہوں نے پاکستان سے الحاق کا اعلان کر دیا تھا۔

بلوچستان کی ساحلی پٹی کے پاکستان سے الحاق کے بعد خان آف قلات کے لیے الحاق کی دستاویز پر دستخط کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ چنانچہ اس نے ۲۷ مارچ ۱۹۴۸ء کو پاکستان سے الحاق کا باقاعدہ اعلان کر دیا۔ قلات ۱۸۷۶ء کے معاہدے کے تحت برطانوی زیرِ حفاظت ایک باجگزار ریاست تھی اور وہی ریاستوں کے بارے میں ۱۸ جولائی ۱۹۴۷ء کو برطانوی سیکرٹری فار اسٹیٹ نے پالیسی بیان دیا کہ انہیں آزاد ممالک کے طور پر تسلیم نہیں کیا جائے گا اور وہ اپنی جغرافیائی اور مذہبی وابستگی کے حوالے سے پاکستان یا بھارت سے الحاق کر سکتی ہیں۔ اس قطععی اعلان کے بعد خان آف قلات کے لیے اپنی آزاہیثیت برقرار رکھنا اب ممکن نہیں رہا تھا اور پاکستان سے الحاق اس لیے ناگزیر ہو گیا تھا

کہ ریاست کی ۹۸ فیصد آبادی مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ الحاق کے دوسرے روز پرنس عبدالکریم ناراض ہو کر افغانستان چلا آیا جس نے اقوام متحدہ میں پاکستان کی رکنیت پر اعتراض کیا تھا۔ دراصل یہ بھائیوں کی تحت نشینی کا قضیہ تھا۔ پرنس عبدالکریم افغانستان سے ایک چھوٹے سے لشکر کے ساتھ واپس آیا اور شورش پیا کرنے کی اپنی ہی کوشش کی جسے ایک مختصر سے فوجی آپریشن سے ناکام بنادیا گیا۔ دراصل ریاست قلات کے حکمران پٹھان تھے اور ان کی قلمرو میں بلوچوں کی تعداد دو تہ کے برابر تھی اور بڑے بڑے بلوچ قبائل اس ریاست سے باہر آباد تھے جن میں بگتی، مری اور ڈوکی قبائل ذکر ہیں۔ پھر یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ خان قلات احمد یار خاں وزیراعظم بھٹو کے دور میں بلوچستان کے گورنر بھی رہے جو اس کا قیام ثبوت تھا کہ ان کا ہفاق کے ساتھ کوئی تنازع نہیں تھا اور وہ پاکستان کے ساتھ اپنی ریاست کے الحاق پر پوری طرح مطمئن تھے۔ ان کے بیٹے سلیمان داؤد نے گزشتہ چند سال سے یہ تنازع کھڑا کر دیا کہ پاکستان نے ریاست قلات پر زبردستی قبضہ کیا تھا اور وہ اس کی آزادی کا اعلان کرنے میں حق بجانب ہیں۔ وفاق نے انہیں ایک معقول راستہ اختیار کرنے پر آمادہ کرنے کی علانیہ اور در پردہ کوشش کی لیکن وہ سرکشی پر اتر آئے اور ناراض ہو کر ملک سے باہر چلے گئے۔

شاہد بلوچستان کی داستان الم بڑی دردناک اور بے حد اضطراب انگیز ہے مگر بحران کی گہرائی تک پہنچنے کے لیے ہم ۱۹۷۰ء کے بعد کے چند اہم واقعات کا ذکر ضروری سمجھتے ہیں جب اسے پہلی بار صوبے کا درجہ حاصل ہوا۔ انتخابات ہوئے تو اے این بی برسر اقتدار آئی سردار عطاء اللہ مینگل نے حکومت بنائی اور بلوچ قیادت نے ۱۹۷۳ء کے آئین کی منظوری میں قابل قدر حصہ لیا، صرف جناب خیر بخش مری نے آئین پر دستخط نہیں کیے تھے۔ شروع شروع میں وزیر اعلیٰ عطاء اللہ مینگل نے آبادکاروں کے ساتھ معاندانہ طرز عمل اپنایا، مگر انہیں جلد احساس ہو گیا کہ ان کا دروایوں سے صوبے کو نقصان پہنچ رہا ہے، تو انہوں نے آبادکاروں کو بے دخل کرنے کی پالیسی ختم کر دی۔ بد قسمتی سے مسٹر بھٹو جن کی سیاسی تربیت فوجی آمر جنرل ایوب خاں کی آغوش میں ہوئی تھی وہ اختلاف رائے برداشت نہ کر سکے اور انہوں نے سردار عطاء اللہ مینگل کی وزارت پر طرف کر ڈالی اور نواب اکبر خاں بگتی کو بلوچستان کا گورنر مقرر کر دیا۔ اس اقدام کے رد عمل میں بلوچ مزاحمت کار پہاڑوں پر چلے گئے اور حکومت کو ان کے خلاف بہت بڑا فوجی آپریشن کرنا پڑا جس میں ۲۰ ڈیوڑھن حصہ لے رہے تھے۔ عالمی میڈیا میں اس آپریشن کے بارے میں سنسنی خیز خبروں کا سلسلہ کئی سال جاری رہا۔ انہی دنوں پاکستان میں عراقی سفارت خانے نے اسلحہ کی پٹیاں پکڑ لی تھیں اور حکومت نے الزام لگایا کہ یہ اسلحہ روس کی طرف سے بلوچ بانیوں کے لیے بھیجا گیا تھا۔ اس پر وہ پینلڈ سے کے بعد بلوچ لیڈر شپ کی گرفتاریاں قلم میں آئیں اور اس کا حیدر آباد جیل میں شامل شروع ہو گیا۔ اسی دوران ۱۹۷۴ء میں یہ المیہ بھی پیش آیا کہ عطاء اللہ مینگل کے صاحبزادے اسد مینگل کراچی میں جناب سردار شیر یاز خان مزاری کے گھر سے گرفتار کیے گئے اور انہیں دلائی کیپ میں بے حد تشدد سے موت کی نیند سلا دیا گیا۔ یہ تمام واقعات بلوچستان میں ایک تصادم کی فضا پیدا کر رہے تھے اور زخم گہرا ہوتا جا رہا تھا۔

جنرل ضیاء الحق برسر اقتدار آئے، تو انہوں نے عام معافی کا اعلان کرتے ہوئے سارے مقدمات واپس لے لیے اور حیدر آباد جیل ختم کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بلوچستان میں امن قائم ہو گیا اور زندگی معمول پر آگئی۔ جنرل رحیم الدین خاں جو صوبے کے گورنر مقرر ہوئے، تو انہوں نے ترقیاتی منصوبوں کا ایک جال بچھا دیا اور انہی کے زمانے میں پہلی بار کوئٹہ شہر کو گیس فراہم کی گئی اور انفراسٹرکچر کی تعمیر پر بھرپور توجہ دی گئی۔ جنرل ضیاء الحق کے ۱۱ برسوں میں بلوچستان

قومی یک جہتی کے فروغ میں بہت مثالی کردار ادا کرتا رہا جس کے نتیجے میں قوم پرست عناصر قومی و حارے میں آگئے۔ ایک مرحلے پر نواب اکبر بھٹی نے صدارت کے انتخابات میں حصہ بھی لیا تھا۔ اس کے علاوہ ۱۹۹۰ء میں نواب خیر بخش مزاری جو غالباً ۱۹۷۳ء میں کاہل چلے گئے تھے اور سوویت یونین کی شکست کے بعد ان کے لیے وہاں قیام عذاب جاں بن گیا تھا تو آئی ایس آئی نے انہیں طیارہ بھیج کر وطن واپس بلایا اور ان کی خاطر مدارات کا بہت خیال رکھا۔ مگر اُن کے ہوائی اڈے پر اترتے ہی بی ایس او کے نو جوانوں نے پاکستان کا پرچم چلایا اور نواب نے اس رقم کی فوری ادائیگی کا مطالبہ کیا جو انہیں ”معاش“ کے نام پر بھارت سے فراہم کی جاتی تھی۔ ۱۹۹۷ء کے انتخابات میں سردار اختر مینگل مسلم لیگ (ن) کی حمایت سے کامیاب ہوئے اور بلوچستان کے وزیر اعلیٰ بنے۔ سیاسی عمل سے پنجاب اور بلوچستان میں اس قدر قربت پیدا ہوئی کہ جب ۱۹۹۷ء میں موثرے کا افتتاح ہوا اور وزیر اعظم میاں نواز شریف اُس کے راستے لاہور روانہ ہوئے تو اُن کی کارسردار اختر مینگل چلا رہے تھے۔ جمہوریت کے فروغ سے فاصلے سمیت اور دل قریب آتے گئے۔ مگر جنرل پرویز مشرف کی فوجی مہم جوئی نے پورا منظر نامہ ہی بدل ڈالا، جمہوریت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچانے کے علاوہ قومی وحدت پر کاری ضرب لگا دی اور پاکستان کا وقار اور خود مختاری امریکا کے ہاتھ فروخت کر ڈالی۔ امریکی جنگ کو اپنی جنگ قرار دینے سے پاکستان میدان کارزار بن گیا اور خود شخص متعلو میں ہزاروں سولین اور فوجی شہید ہوئے۔ ان کی حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی اور خود مری کا سب سے بڑا نقصان بلوچستان کو پہنچا جس کی تلافی اب شاید آسانی سے کی جاسکے گی۔

جنرل پرویز مشرف ہر مسئلے کا فوجی حل چاہتے تھے۔ اُن کا زعم تھا کہ بندو کی طاقت سے بلوچستان کے سرداروں کا قلع قمع کر کے عوام کو با اختیار بنایا جاسکتا ہے۔ وہ اپنے اس خیال کا برملا اظہار بھی کرتے۔ غالباً ۲۰۰۴ء کا ذکر ہے کہ کونسل آف نیو نیچر زائیڈ ایریز نے انہیں لاہور میں ظہرانے کی دعوت دی جس میں قومی مسائل زیر بحث آئے۔ ڈیرہ گتھی میں بد امنی کا ذکر چھڑا تو انہوں نے کسی تاہل کے بغیر کہا کہ ہم ان سرداروں کو اس طرح ہٹ کریں گے کہ انہیں کچھ پتہ ہی نہیں چلے گا کہ اُن کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا۔ غالب گمان یہ ہے کہ اُن کی سوچ کے عین مطابق سیاسی سالہ خیف و زار بلوچ سردار نواب اکبر بھٹی غار کے اندر ہم سے اڑا دیے گئے جہاں وہ اپنے حریف قبیلے کے علاقے میں پناہ لیے ہوئے تھے۔ جنرل صاحب نے اسی رات اس عظیم کارنامے پر فوجی افسروں کو مبارک باد پیش کی۔ ہم نے اس وقت لکھا تھا کہ بلوچ نو جوانوں کو آزاد دی کی جنگ لڑنے کے لیے ایک بوڑھے سردار کی لاش میسر آگئی ہے اور اس بار مزاحمت کا رنگ یکسر جدا ہو گا جو پہلی سالمیت کے لیے ایک بڑے خطرے کی شکل اختیار کر جائے گا۔ انہی کے دور میں مزاحمت کا رونا پنا ہونے لگے جن کی تعداد بعض تحقیقاتی اداروں کے مطابق سیکڑوں کی حد سے گزر کر ہزاروں تک جا پہنچی ہے۔ لوگوں نے دیکھا کہ خیر ایجنسیوں کے کارندے ٹاپینڈیڈ شہریوں کو گھروں، دکانوں اور دفتروں سے اٹھالے جاتے اور انہیں غائب کر دیتے ہیں۔ معروف قانون دان جناب علی احمد کرد لاپتا افراد کی بازیابی کے لیے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاتے اور انصاف کی بجھک مانگتے رہے۔ مگر ظلم کا باز اگر مری رہا۔ صوبے کو سیاسی تباہی سے دوچار کرنے کے لیے پرویز مشرف نے یہ کیا کہ ۲۰۰۸ء کے انتخابات میں جعل سازی کے ذریعے بلوچستان اسمبلی میں ایسے افراد پہنچا دیے جو عوام کے حقیقی نمائندے نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جو اسمبلی وجود میں آئی اور جو حکومت قائم ہوئی اُس نے بلوچستان کے معاملات سدھارنے میں کوئی دلچسپی نہیں لی اور اُن کی سازی توجہ کوٹ مارا اور سالانہ ۲۵ کروڑ کی ترقیاتی گرانٹ پر نگہی رہی۔ اس پر امن و امان تباہ و برباد ہوتا رہا۔

قمل و نارت کا مکرمہ و تحصیل جاری رہا مارکٹ کنگلگ ہوئی اور تلی اور لیاں بلوچستان پاکستان کا مسئلہ غیر ایک بن گیا ہے۔

بلوچستان میں خرابی اور تعمیر کے کام ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ ایک طرف قتل اور نارت کری جاری ہے اور دوسری طرف چھانڈیوں کے بجائے تعلیمی شہر آباد کیے جا رہے اور نو جوانوں کے لیے روزگار کے مواقع پیدا ہونے لگے ہیں۔ قبائلی جھگڑوں کی وجہ سے مری قبیلے کے علاقے پیمالا ٹنگ میں ساٹھ سال سے ٹوٹنے کی کانیں بند پڑی تھیں 'افوج' کی مصالحت کو کوششوں سے ان میں دوبارہ کام شروع ہو گیا ہے اور ان کی آمدنی کے ایک حصے سے بلوچ طالب علم پاکستان بھر کے اعلیٰ تعلیمی اداروں سے فیس یا بھرتہ ہیں۔ ترقیاتی منصوبوں کے لیے ۱۶۰ ارب کے وسائل فراہم کیے جا چکے ہیں اور سوئی گیس کی واجب الادا رپلی بھی ادا کی جا رہی ہے۔ صوبائی خود مختاری کا دیرینہ بنیادی مطالبہ تسلیم کر لیا گیا ہے اور تمام زیر زمین قدرتی وسائل پر صوبوں کا حق تسلیم کر لیا گیا ہے۔ لیکن غور طلب امر یہ ہے کہ بلوچ نو جوان پھر بھی پھر سے ہوئے ہیں اور عسکریت پسندی کی طرف مائل ہیں۔ ان کی بنیادی شکایت یہ ہے کہ بلوچستان کے بارے میں فیصلے عوام سے مشورے اور منظوری کے بغیر کیے جا رہے ہیں 'فوج اور خفیہ ایجنسیاں ان پر حکمرانی کر رہی ہیں اور ان کی نسل کشی ہو رہی ہے۔ ان شکایات کے ازالے میں ہمارے ارباب اختیار نے مجرمانہ غفلت سے کام لیا ہے اور حالات میں بہتری لانے کے نہایت قیمتی مواقع ضائع کر دیے ہیں۔ مشرقی پاکستان کی تاریخ میں ایک ایسا موڑ آیا تھا جب مذاکرات کے لیے فضا قدرے سازگار ہو چلی تھی، مگر جنرل یحییٰ خان نے مصالحت کا ہاتھ بڑھانے کے بجائے غرابت سے کام لیا جس کے بعد ملکی حالات پوائنٹ آف نو ریٹرن تک پہنچ گئے۔ ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کے آپریشن کے دوران قومی اسمبلی میں عوامی لیگ کی بھاری اکثریت بھارت فرار ہو گئی تھی اور جلاوطن حکومت قائم کر لی تھی، لیکن درپردہ مصالحتی کوششوں کے نتیجے میں عوامی لیگ کی قیادت واپس مشرقی پاکستان میں آجائے اور مذاکرات کی میز پر بیٹھنے کے لیے آمادہ ہو گئی تھی، لیکن جنرل یحییٰ خان کی جولائی ۱۹۷۱ء کی تقریر نے تمام کوششوں پر پانی ڈال دیا جس کے باعث بھارت کو فوجی مداخلت کا جواز حاصل ہو گیا تھا۔

پرویز مشرف نے بھی بلوچستان کی تاریخ کے ایک انتہائی نازک موڑ پر اسی قسم کی خرد مافی کا مظاہرہ کیا۔ ۲۰۰۳ء کی بات ہے جب نواب اکبر بگٹی اور وفاقی حکومت کے مابین تعلقات بڑے کشیدہ ہو گئے تھے۔ چودھری شجاعت حسین چند ماہ کے لیے وزیر اعظم بنے، تو انہوں نے بلوچستان پر پارلیمانی کمیٹی قائم کرنے کا اعلان کیا جس کا مینڈیٹ حالات کے سدھار کے لیے آئینی اور سیاسی سفارشات پیش کرنا تھا۔ جناب ویم سجاد اور جناب مشاہد حسین سید نے بڑی دماغ سواری اور اپنی وقت نظر سے تجاویز مرتب کیں اور عمل درآمد کے لیے جنرل پرویز مشرف کو ارسال کر دیں۔ اسی دوران وزیر ہمتی میں امن و امان کی صورت حال بہت خراب ہو گئی۔ اس کڑے وقت میں چودھری شجاعت اور مشاہد حسین سید 'نواب اکبر بگٹی سے ملنے گئے اور طویل گفت و شنید کے بعد معاملات طے پا گئے، اکبر بگٹی اسلام آباد آنے کے لیے رضامند ہو گئے اور وہ کوئٹہ ہوائے اڑے پر کئی گھنٹے خصوصی طیارے کا انتظار کرتے رہے۔ طیارہ نہ آنے کی وجہ سے معاملات بہت بگڑ گئے اور جنرل مشرف نے طاقت استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا اور نواب اکبر بگٹی شہید کر دیے گئے۔ اس حادثے کے رد و عمل میں بلوچ نو جوانوں نے علم بغاوت بلند کر دیا۔ اس کے بعد ہی براہدراغ بگٹی، ہریہارمری اور خان آف قلات نے سرکشی اختیار کی اور ان کے حمایتیوں نے ایسی فضا پیدا کر دی جس میں پاکستان کا پرچم لہرانا اور پاکستان کا قومی ترانہ بجانا اپنے آپ کو جلاکت میں ڈالنے کے مترادف ہوتا چلا گیا۔ مجھے وہ منظر آج بھی یاد ہے کہ میں ۱۴ اگست ۱۹۷۱ء کو ڈھاکہ میں تھا

اور یوم پاکستان کے موقع پر پاکستان کا پرچم پورے شہر میں صرف دو چار مقامات پر لہرا تا ہوا نظر آیا تھا۔

حالات کو آخری سطح تک پہنچنے سے روکنے کے لیے ہمارے حکمرانوں کو غیر معمولی سنجیدگی اور دور بینی کا ثبوت دینا اور وقت کی نزاکت کا پورا احساس رکھنا ہو گا۔ مارچ ۲۰۰۸ء میں پیپلز پارٹی کی حکومت قائم ہوئی اور ستمبر میں جناب آصف علی زرداری صدر منتخب ہوئے جنھوں نے بلوچ سردار ہونے کے حوالے سے باضی کی غلطیوں پر بلوچستان کے عوام سے معافی مانگتی تھی اور وزیر اعظم سید يوسف رضا گیلانی کی طرف سے آل پارٹیز کانفرنس بلانے کا اعلان ہوا تھا، مگر مسائل کی تک پہنچنے اور بلوچ قیادت سے مذاکرات کی راہ ہموار کرنے کے لیے ان دونوں اعلیٰ شخصیتوں نے بلوچستان میں چند روزہ قیام بھی پسپہ نہیں کیا۔ پھر ایک شام بلوچستان کے اسٹیک ہولڈرز سے مشاورت کے بغیر ”آئنا حقوق بلوچستان چیلنج“ کا اعلان کر دیا گیا جس کے ۲۹ نکات میں سے بیشتر روشن مستقبل کی نوید دیتے تھے مگر بلوچستان میں اسے اپنانے کے لیے کوئی قابل ذکر گروپ آمادہ نہیں تھا۔ سب سے بڑی خرابی اس کے نام کے اندر مضمر تھی۔ آئنا حقوق بلوچستان کے نام سے یہی تاثر قائم ہوا کہ اس بد نصیب صوبے کو حقوق دینے کا پہلی بار آئنا ہوا اور اس سے پہلے وہ بے گوش اور بے اختیار علاقہ تھا۔ حکومت اگر اس چیلنج پر عمل درآمد میں واقعی سنجیدہ ہوتی تو بلوچستان میں اس کام کے لیے ایک خصوصی نمائندہ و مقرر کرتی جو اسٹیک ہولڈرز کے تعاون سے ترقیاتی منصوبوں کی نگرانی کرتا اور سیاسی مشاورت کو فروغ دیتا۔ محض شعبہ بازی کا نتیجہ یہ نکلا کہ بلوچستان کے عوام شدید احساس محرومی کا شکار ہیں۔ وفاق کی طرف سے جو بھی وسائل فراہم کیے گئے وہ ارکان اسمبلی، بیوروکریسی اور بڑے چھوٹے سرداروں کی جیبوں میں چلے گئے۔

بلوچستان کے مسئلے کی تکلفی سب سے پہلے جناب نواز شریف نے مخصوص کی۔ وہ کراچی میں سردار عطاء اللہ مینگل سے ملے اور ان سے بگڑے ہوئے حالات میں قائدانہ کردار ادا کرنے کی استدعا کی۔ سردار صاحب نے اعتراف کیا کہ ان کے ہاتھ سے معاملات نکل چکے ہیں اور اب مذاکرات پہاڑوں کا رخ کرنے والے ناراض نوجوانوں سے کرتا ہوں گے۔ اسی کے بعد میاں صاحب کو سندھ میں چند اور بلوچ زعماء سے ملے اور پاکستان سے محبت کرنے والے عناصر سے تاریخ کے نازک موڑ پر استقامت سے کام لینے کی دعوت دی۔ وہ بلوچستان پر آل پارٹیز کانفرنس بلانے کا عندیہ بھی دے چکے تھے مگر ۲۰ روپے آئینی ترمیم کے جھجیلوں میں پھنس گئے۔ امریکی کانگریس میں بلوچستان کی آزادی اور عظیم بلوچستان کی قرارداد پیش ہونے پر ہمارے بلند قامت وزیر اعظم نے انگریزی کی اور ۲۴ رسالہ بعد آل پارٹیز کانفرنس بلانے کی دوبارہ تجویز پیش کی ہے جسے قوم پرست قیادت نے مسترد کر دیا ہے اور جناب نواز شریف نے ۲ بنیادی شرائط مانگی ہیں کہ مذاکرات کی کامیابی کے لیے اعتماد سازی کے اقدامات ضروری ہیں جن میں نواب اکبر خاں بھٹی کے قاتل جہاز پرویز مشرف کی گرفتاری اور لاپتہ افراد کی بازیابی سرفہرست ہیں۔ ان دونوں مطالبات پر پورے بلوچستان کی سیاسی اور مذہبی قیادت کا اتفاق پایا جاتا ہے اور انہیں نظر آتا ہے کہ دفاع پاکستان کونسل نے ۲۷ فروری کو بلوچستان میں آل پارٹیز کانفرنس بلانے کا جو اعلان کیا ہے اس میں غالباً کبھی اسٹیک ہولڈرز شریعت کریں گے اور سب سے بڑے زعموں پر مہر جم رکھنے کی تدبیر کریں گے۔

آزاد بلوچستان کی امریکی کانگریس میں قرارداد پر ہمارے دفتر خارجہ کے علاوہ تمام سیاسی اور دینی جماعتوں نے شدید رد عمل ظاہر کیا ہے۔ قینوں صوبائی اسمبلیوں نے مذمت کی قراردادیں منظور کی ہیں، مگر بلوچستان اسمبلی کی خاموشی پر قومی حلقے

حیرت زدہ ہیں۔ ہمارے کبھی فی وی چینلو مختلف پہلوؤں سے بلوچستان کی صورت حال کا جائزہ لے رہے ہیں اور گہرے مسئلے کا حل زیر بحث لا رہے ہیں۔ اصل ضرورت یہ ہے کہ پنجاب کی طرف سے بلوچستان کے عوام کے ساتھ گہری وابستگی کا اظہار کیا جائے۔ وفاقی حکومت کی سطح پر نمائشی اعلاات کے بجائے عملی اقدامات کی ترجیحات طے کی جائیں اور تاریخ کی روشنی میں غلط فہمیوں کا پردہ چاک کیا جائے۔ معافی مانگنے، غیر سنجیدہ مکالموں اور سیاسی ڈراموں کا وقت گزر چکا ہے۔ ہمارے وزیر اعلیٰ بلوچستان کی ناراض قیادت کو دیرینہ مذاکرات کی دعوت دیتے رہے مگر اس کے ساتھ رابطوں کے لیے سرے سے کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ شاید اب انہیں معاملات کی سنگینی کا احساس ہوا ہے مگر مشکل یہ آن پڑی ہے کہ ٹپوں کے نیچے سے بہت پانی بہہ چکا اور اعتماد کے رختے ٹوٹتے جا رہے ہیں۔ ہمارے داخلی معاملات میں غیر ملکی طاقتوں کے مداخلت ہونے سے حالات ایک خطرناک رخ اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ جن پر قابو پانے کے لیے اجتماعی وائٹ اور مضبوط قوت ارادی برائے کار لانا ہوگی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مطالبات کا ایک انبار لگتا جا رہا ہے، لیکن اصل بات باہمی اعتماد کو فروغ دینے کی ہے۔ اعتماد سازی کے لیے جزل پرویز مشرف کے خلاف ریاست کی طرف سے ایف آئی آر کا اندراج اور ان کی انٹربول کے ذریعے گرفتاری ناگزیر معلوم ہوتی ہے۔ اسی ایک اقدام سے حکومت کی سنجیدگی اور کومٹ منٹ کا صحیح پیغام جائے گا۔ اسی طرح خفیہ ایجنسیوں کا سیاسی کردار ایک قلم ختم کرنا اور سول اداروں کو آزادی اور ذمہ داری سے اپنے فرائض ادا کرنے کے مواقع فراہم کرنا وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ یہ شکایت عام ہے کہ حکومت بلوچستان بالکل بے اختیار ہے جس پر غیر منتخب اداروں کی طرف سے فیصلے مسلط کیے جا رہے ہیں۔ بلاشبہ سیاسی طور پر آفت زدہ صوبے میں فوج کا بہت زیادہ عمل دخل رہا ہے، جسے سرحدوں کے قلعہ نگار سمجھ دیکر دینے سے شہریوں کا اعتماد بحال ہوگا۔ خوش قسمتی سے جزل کیانی ایک متوازن اور صحت مند سوچ کے مالک ہیں اور وہ ڈیڑھ سال پہلے ہی فوجی آپریشن ختم کرنے اور آئندہ نئی چھاونی کی تعمیر سے دست بردار ہو جانے کا اعلان کر چکے ہیں۔ انہوں نے یہ مژدہ بھی سنا یا تھا کہ جن علاقوں میں چھاونیاں بنانے کے منصوبے تیار تھے وہاں تعلیمی ادارے قائم کیے جائیں گے۔ عسکری قیادت نے یہ عندیہ بھی دیا تھا کہ فوج میں ہر صوبے کی آبادی کے تناسب سے جوان بھرتی کیے جائیں گے تاکہ صحیح معنوں میں وہ ایک قومی فوج بن جائے۔ بلوچستان کے حصے میں ۲۰ ہزار افراد آئے ہیں جن میں سے ۱۵ ہزار جوان بھرتی کیے جا چکے ہیں اور مزید ۵ ہزار اسی سال ریکروٹ کیے جائیں گے۔ ان بڑے مثبت اقدامات سے ایک روشن مستقبل کی تعمیر عمل میں آ رہی ہے، مگر حالات ہماری حکومتوں کی بے انصافی بے تدبیری اور طاقت آزمائی کے سبب جس تک آپہنچے ہیں وہ برق رفتار اور ایقان افرو ز حکمت عملی کے متقاضی ہیں۔ ہمیں سب سے پہلے پوری دیانت داری سے اپنی غلطیوں کا اعتراف کرنا اور باطنی اور حال کے نقصانات کے ازالے کے لیے غیر معمولی ایثار اور سیاسی پیش قدمی سے کام لینا ہوگا۔ اسلام آباد کے تحت نشین سکرانوں نے بلوچستان کے حقوق بُری طرح پامال کیے ہیں جن کا زنجی حساب دینا ہوگا اور اپنا مائنڈ سیٹ بدلنا ہوگا۔ اس مائنڈ سیٹ کی تبدیلی ہی سے باہمی اعتماد نشوونما پائے گا۔ اعتماد کے رشتے فوری طور پر مضبوط کرنے کے لیے آئی ایس آئی کے علاوہ تمام خفیہ ایجنسیوں کو براہمدار کی بہمن اور بھانجی کے قاتلوں کا بڑی جانفشانی سے سراغ لگانا اور انہیں انصاف کے کٹہرے میں لانا ہوگا۔ بلوچ خواتین کی بلاکٹ کا جو جو نہیں منظر سامنے آیا ہے، وہ شدید ترین مذمت کے علاوہ پاکستان دشمن اور سفاک دہندوں کو

کلیئر کردار تک پہنچنا بلوچ بھائیوں کے دشمنوں پر مہم رکھنے کے لیے بے حد مددگار ثابت ہوگا۔

بلوچستان میں پاکستان سے محبت کرنے والوں اور اس کا مستقبل سنوارنے کا عزم رکھنے والے بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ بکیتی، مری اور منگل، ریسائی، گسپی، جوگیزی اور زہری قبائل میں ہزاروں نوجوان اپنے وطن کی قدر و قیمت سے پوری طرح آگاہ ہیں اور بزنس قبیلہ پاکستان کے ساتھ تعلق کی ایک روشن تاریخ رکھتا ہے۔ جناب محمود خاں اچکزئی مولانا عبدالغفور حیدری، حافظ حسین احمد، ڈاکٹر عبدالملک، سردار ثناء اللہ زہری پاکستان کی سوچ کو پروان چڑھانے میں بہت اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ مولانا فضل الرحمن کی جمیعت علمائے اسلام ایک بہت بڑی سیاسی اور مذہبی طاقت ہے اور جماعت اسلامی کا بھی اپنا ایک مضبوط حلقہ موجود ہے۔ پیشکش پارٹی سرداروں کے خلاف اور عوام کے حقوق کے لیے بہت سرگرم ہے جبکہ پختونخواہ عوامی ملی پارٹی بڑے اثر و رسوخ کی مالک ہے۔ ان تمام قوتوں کو یکجا کرنے اور مشاورت کا دائرہ مزید بڑھانے کی اشد ضرورت ہے۔ گوریلوں کی تعداد ایک ڈیڑھ ہزار بتائی جاتی ہے جن میں ۱۰۰۰ تہذیب اور سڑک جنگ منصوبہ بندی کے ذریعے راولپنڈی پر لایا جاسکتا ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ شورش پسندوں کے ہر بڑے لیڈر بلوچستان کے سب سے دولت مند افراد میں شمار ہوتے ہیں جن کو عوام کی غربت اور بدحالی کا کم کھایا جا رہا ہے۔ بلوچ عوام کے وہ حقوق جو ماضی میں چھینے جاتے رہے ہیں انہیں احساسِ ندامت اور فراخ دلی سے لوٹا دینا لازم آتا ہے۔ اس میدان میں سیاسی رہنماؤں کو وقت ضائع کیے بغیر پیش قدمی کرنا ہوگی اور فوج اور خفیہ ایجنسیوں کو سیاسی معاملات سے بے دخل کر دینا ہوگا، البتہ انہیں قومی سلامتی کے تحفظ کے لیے پوری طرح چوکس رہنا اور عوام کے امن و امان کو برقرار رکھنا ہوگا۔ بدلے ہوئے حالات میں دہشت گردوں اور تجزیہ کاروں کی گرفتاری، تشکیک، پراسیکیوشن اور گواہوں کی شہادت کے مناسب قوانین پارلیمنٹ کو جلد منظور کرنے اور آرمی ایکٹ میں نئے تقاضوں کے مطابق ترامیم کرنی چاہئیں تاکہ خفیہ ایجنسیوں کو حد و حد میں رکھا جاسکے اور پولیس کو اپنی ذمہ داریاں پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ ادا کرنے کا پابند بنایا جاسکے۔

بلوچستان میں انسانی ہلاکتوں کے مہیب سلسلے سے امریکی کانگرس میں ۳۰ اراکان پارلیمنٹ نے جو آزاد اور عظیم بلوچستان کے بارے میں قرارداد پیش کی ہے، وہ ہمارے لیے ایک چیلنج بھی ہے اور اپنے اندر بنیادی تبدیلی لانے کا نادر موقع بھی۔ چیلنج اس معنی میں کہ یہ ایک بہت کارآمد سیاسی حربہ ہو سکتا ہے جسے مسز اندرا گاندھی نے مشرقی پاکستان پر حملہ کرنے سے پہلے آزمایا تھا اور بڑی طاقتوں کے دباؤ و دھمکیوں میں جا کر پاک فوج کے ہاتھوں بنگالیوں کی نسل کشی کی دہائی دی تھی۔ اس زہریلے پڑاؤ میں کھنڈے نے اس وقت عالمی برادری میں پاکستان کو تنہا کر دیا تھا، لیکن اب اصل حقائق سامنے آنے لگے ہیں اور ہتھیار دہشت کے محقق اور مؤرخ کتابوں پر کتابیں شائع کر رہے ہیں کہ ۳۰ لاکھ انسانوں کا قتل اور لاکھوں خواتین کی بے رحمی بہت بڑا مبالغہ اور ایک بے حقیقت تھا جبکہ بنگالیوں نے غیر بنگالیوں پر ناقابل بیان ظلم و جبر کیا۔ بدقسمتی سے پاکستان اس وقت دنیا کو باور کرانے میں ناکام رہا تھا کہ فوجی آپریشن میں قانونی اور اخلاقی ضابطوں کا خیال رکھا گیا تھا۔ بلوچستان کے حوالے سے سکورٹی اور انٹیلی جنس اداروں کو اپنی پوزیشن پر ناقص صاف کر دینی چاہیے تاکہ عالمی رائے عامہ گمراہ نہ ہوئے۔ پاکستان کو اقوام متحدہ کے ساتھ یقین دلانا ہی ہے کہ اس کا قرارداد سے کوئی تعلق نہیں اور وہ بھاری اکثریت سے مسترد ہو جائے گی۔ یہی امریکی اعلیٰ عہدے دار بھی کہہ رہے ہیں کہ ہم پاکستان کی خود مختاری اور علاقائی سالمیت کا بہت احترام کرتے اور اس کے ساتھ روابط ہمارے لیے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

موجودہ حالات میں ان یقین دہانیوں کی بڑی قدر و قیمت ہے۔ ان کا فائدہ ضرور اٹھانا چاہیے، مگر ان پر مکمل اعتبار کرنے سے پہلے بہت کچھ سوچنا ہوگا کہ یہ قرار دواوی روز کیوں پیش کی گئی جس وقت اسلام آباد میں پاکستان، ایران اور افغانستان کی سربراہ کا فرانس منعقد ہوئی تھی اور پاکستان کی طرف سے یہ اعلان کیا جا رہا تھا کہ ایران پر حملے کے لیے وہ اپنی سرزمین استعمال نہیں ہونے دے گا اور کیس پاسپ لائن کا منصوبہ ضرور مکمل کیا جائے گا۔

اس ضمن میں حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ ہمارے حکمرانوں کو مسئلے کی یقینی کا احساس ہو گیا ہے اور بڑی سیاسی اور دینی جماعتیں بلوچ عوام کے ساتھ وسیع پیمانے پر یک جہتی کا اظہار کر رہی ہیں۔ اس ماحول میں علیحدگی کے امکانات حد درجہ محدود ہو گئے ہیں۔ یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ علیحدگی پسند عناصر کو عوام کی حمایت حاصل نہیں جو نا انصافیوں کے گہرے زخم کھانے کے باوجود پاکستان کے بندوبست میں اپنا مستقبل محفوظ سمجھتے ہیں۔ بلوچ حلقوں میں یہ سوال بھی زیر بحث آ رہا ہے کہ آزادی حاصل کرنے کے بعد اسے قائم بھی رکھا جاسکے گا یا کسی بڑی طاقت کی غلامی قبول کرنا پڑے گی۔ بلوچوں کے بزرگ لیڈر سردار عطاء اللہ مینگل نے بی بی سی کو انٹرویو دیتے ہوئے اپنے مسلح نوجوانوں سے بھی یہی سوال کیا تھا اور وارننگ دی تھی کہ تم کسی اور طاقت کے غلام بن جاؤ گے۔ تمام جمیدہ بلوچ لیڈروں نے اس حقیقت کا ادراک کیا اور وہ اپنے باغی نوجوانوں سے اتفاق نہیں کر رہے۔ پاکستان کی ریاست اگر اپنی ذمے داریاں ٹھیک طور پر خیال کرتی اور اپنے شہریوں کی جان مال اور آبرو کے تحفظ میں کامیاب رہتی اور اپنی صلاحیتوں کی نشوونما کے لیے سازگار ماحول اور مصفاہ نظام فراہم کرتی ہے تو علیحدگی کی کوئی تحریک کامیاب نہیں ہو سکے گی اور عظیم تر بلوچستان کا واحد کبھی حقیقت کا روپ نہیں دھار سکے گا۔ کیونکہ ایرانی بلوچ مذہبی اعتبار سے بڑے انقلابی ہیں جبکہ پاکستانی بلوچ سیکولر مزاج نظریات کے حامل ہیں۔ پاکستان کو ہمیشہ مسائل کے تصور سے نکلنے کے لیے امریکا سے براہری اور خود مختاری کی بنیاد پر از سر نو تعلقات استوار کرنا، سول ملٹری روابط کو ہموار اور متوازن بنانا، ایلیٹز کی نو اور عدلیہ کے درمیان غیر ضروری چپقلش پر قابو پانا اور کرپشن اور بدترین بد انتظامی کے قلع قمع پر نہایت سنجیدگی سے توجہ دینا ہوگی۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ کہ سیاسی جماعتوں اور قومی سلامتی کے اداروں کو قانون اور اخلاق کی عملداری کے تحت لانا ہوگا۔ عدلیہ عوام کے مفاد میں بڑے دور رس فیصلے کر رہی ہے جن سے لاپتہ افراد کے در پر وہ معاملات بھی سامنے آ رہے ہیں اور انتخابات کے ذریعے عوام کی حقیقی نمائندگی کا حصول بھی ممکن دکھائی دیتا ہے۔ ہم یقیناً بالغ نظری، میانہ روی، ایثار کشی اور احترام باہمی کے ذریعے مشکل وقت کو نئے امکانات میں تبدیل کر سکتے ہیں اور ایک ایسا بندوبست وجود میں آ سکتے ہیں جس میں شہریوں کے لیے بے حد کشش پائی جاتی ہو۔ امریکا اور بھارت نے بلوچستان پر بہت کام کیا ہے اس لیے ہمیں کسی خوش فہمی میں رہنے کے بجائے جلد سے جلد معاشرتی عدل کا اہتمام اور جمہوری سیٹ اپ میں عوام کی فعال شرکت کی ضمانت دینا ہوگی۔ پاکستان کی ان حقیقی ضمانتوں کے ساتھ لیڈروں کا زور ٹوٹ جائے گا اور انہیں عالمی قانون اور عظیم ریاست کے سامنے سر نہر کرنا پڑے گا کیونکہ فی وی جینٹلو پر ان کا بھرم کھل چکا ہے اور یہ حقیقت سامنے آ چکی ہے کہ ان کے مطالبات میں کوئی تاریخی حقیقت نہیں اور وہ باہر کی طاقتوں کا آلہ کار بنے ہوئے ہیں، تاہم شائستگی اور محتانت کے ساتھ گفتگو کا دروازہ ناصرف کھلا بلکہ اپنی حدود میں رکھنا ہوگا ورنہ یہ ڈر ہے کہ ان کی بے سرو پا باتوں سے رد عمل کے طور پر پختون حقوق کی نئی بحث بھی شروع ہو جائے گی۔





”ہم یہاں بیٹھ کر
امریکیوں کے
برابر کماتے ہیں“

۳۱۲ فیصد سالانہ کی رفتار سے ترقی کرنے والی پاکستانی کمپنی
”صوفی زار“ کے سربراہ ظفر حسان کی باتیں

ہے۔ اسے سال یونیورسٹیوں میں پڑھانے کے دوران مغربی، امریکی، یورپی جس جس مصنف کو بھی پڑھا اور پڑھایا، کچھ باتوں پر سب کا اتفاق پایا۔ بڑے بڑے خواب دیکھو، خود پیسے مت کماؤ، پیسے کسے کمانے پر لکھو۔ کاروبار کو ہر صورت میں اقدار (Ethics) کے ساتھ لے کر چلو۔ اقدار کے بنا کوئی کامیابی نہیں ملتی۔ تخلیقی ذہن کے ساتھ سوچ، مینیجر مت بنو، بزنس ایڈر بنو، رول ماڈل بنو، وٹرن کے ساتھ اگر وٹیز نہ ہو گیس تو سب

مغرب کی کاروباری کامیابیوں کی داستانیں پڑھ کر خوشی سے زیادہ ایک بے نام سی کیفیت کا تجربہ ملتا ہے جو تاجر سے بہت دور نہیں رہتا ہے۔ آخر ان میں ایسا خاص کیا ہے کہ جسے دیکھو زمین سے اٹھتا ہے اور چند ہی سالوں میں آسمان کو چھونے لگتا ہے۔ پھر اپنی کامیابیوں کی داستانیں سناتے، چھپواتے اور منوانے کی راہ پر نکل کھڑا ہوتا ہے اور رول ماڈل ٹھہرتا

اہل



ختم ہو جائے گا۔ انسانوں کی عزت کرو، ان کو اپنا اثاثہ جانو، خوب پرصو، نیا سیکھو، پھر بڑھاؤ اور گرد دکھاؤ۔

دل کی بات کہوں تو ان میں کوئی بھی بات جھوٹی یا بے وزن نہیں۔ اہم اس لیے کہ کہنے والے کر کے دکھا رہے ہیں اور اپنی باتیں منوار ہے ہیں۔ سوچا ہماری سیاسی بے چینیوں اپنی جگہ پر انتظامی کمزوریاں بھی بہت مگر یہ اپنا ملک، یہ اپنے لوگ خدا نے تو رزق فرماتے ہیں ذرا کی نہیں رکھی۔ ہم ہی ہمیشہ چوک جاتے ہیں۔ جہاں تنقید کرنی چاہیے وہاں پاؤں پڑ جاتے ہیں۔ جہاں تعریف کا موقع آتا ہے وہاں کیڑے نکالنے لگتے ہیں۔ اس لیے جو حاصل کرنا چاہیے جو سیکھنا چاہیے ان سے محروم رہ جاتے ہیں۔

زندگی تنقید کرنے سے خوش حال ہونے والی ہوتی تو تنقید نگار ادب اور نقطہ چیں زندگی میں بہت کامران ٹھہرتے۔ مگر دونوں ہی کچھ عرصے بعد بچپانے نہیں جاتے۔ اردو ڈائجسٹ میں چند ماہ سے پاکستان کی نئی بزنس ویسپائزر کے سرکردہ لوگوں کو ڈھونڈنے اور آپ سے ملانے کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا۔ اب وہ باقاعدہ بزنس رول مائز کی تلاش بن گیا ہے اور خود ہمارے لیے حیرت کے ساتھ ساتھ خوشی لا رہا ہے۔ پاکستان کی تیزی سے ترقی کرنے والی ۲۵ شفاف کمپنیوں کا تذکرہ اس جتنجو کو اور ہمیں بزرگ کیا۔

دنیا نے کمپیوٹر کی ایک بہت بڑی کمپنی ڈیل (Dell) کے سربراہ، مائیکل ایس ڈی کی ایک چھوٹی سی بات نے توجہ پکڑا کہ ”کامیابی چاہیے یا کوئی مختلف اور منفرد کام کرنا ہو تو سب سے پہلا کام یہ کریں کہ دکان سے خرید لیا ہوا نقشہ (Map) چھینک کر اپنا نقشہ خود بنائیں۔“

اس ماہ کے مہمان و ظفر خان سے ملنے روانہ ہوئے تو میں انٹرویو کے سوالات کا نقشہ چھاڑ چکا تھا۔ ہمارا نو عمر

فونو گرافر عریان ایک رات پہلے ظفر خان کی سو سے زیادہ تصاویر بنا لیا تھا۔ ان تصاویر کو ذہن سے جھٹکا اور ڈینس فیزم کے کارنر پہ واقع اس پلازے پہ نظریں جمادیں جس کے نیچے ٹیکس اینڈ ٹیکس تھی اور اوپر کے دونوں فلور پہ ”صوفی زار“ کے دفاتر۔ یہ کلیفورنیا میٹ پاکستانی کمپنی ہے

جس کے سی ای او ظفر خان ہیں۔ انھوں نے کلیفورنیا انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی سے انجینئرنگ کی، ان کے والدین اور اعزاء اقارب سب وہیں آباد ہیں۔

۲۰۰۳ء میں انھوں نے ایک ڈرامائی فیصلہ کیا اور اپنی اہلیہ کو ساتھ لے کر پاکستان آ گئے۔ اسی سال انھوں نے ایک اور منفرد کام کیا، صوفی زار کا آغاز کیا۔ یہ کمپنی کرنی کیا تھی مجھے بہت دیر سمجھ نہ آ سکی۔ طیب صاحب کا خیال تھا کہ ای مارکیٹنگ کرنی ہے۔ عاطف کا اصرار تھا یہ نیٹ پہ Optimization کرنی ہے۔ حیرت اس بات پہ تھی کہ ۲۰۰۷ء میں اس نے ایم آئی ٹی ایسٹریٹیشن ایوارڈ بھی جیت لیا جو بڑی وقعت کا حامل ہے پھر دنیا کے قابل اعتبار ترین تعلیمی اداروں میں سے ایک ایم آئی ٹی کے ۳ پرو فیسروں نے صوفی زار کا ایڈوائزربٹے کا فیصلہ کیا۔ اس کمپنی کا گروتھ ریٹ ۳۱۲ فیصد سالانہ ہے۔ کبھی بھی تو ۸۰۰ فیصد سے بھی زیادہ۔ کمپنی نے ۲۰۰۹ء میں ۱۰ ملین ڈالر کمائے۔ ۲۰۱۰ء میں صوفی زار پاکستان کی ۲۵ حیرت فکار کمپنیوں کا حصہ بنی تھی۔

ظفر خان سے ملاقات تیسرے فلور پہ ہوئی۔ ایک چھوٹا سا دفتر جس پہ کاغذ چپکا تھا ”Z“۔ ساتھ میں پورے ہال میں بڑی تعداد میں لڑکیاں کام کر رہی تھیں۔ کل ۵۰ کے قریب لوگ تھے۔ ٹیپ ریکارڈ آن کرنے سے پہلے میں نے حیرت سے اپنی کرسی کی طرف دیکھا۔ وہ لکڑی کی تھی۔ غور کیا تو ہر کرسی کی سیٹ، یا فوم غائب تھا۔ میری حیرت دیکھ کر بولے یہ آرام دہ ہیں اور بانی ڈیزائن ایسی ہیں۔ لمبی نشست میں بھی تھکائی نہیں ہیں۔ میں افسانے دل سے بیٹھ کر گیا مگر آخر تک نہیں جان سکا کہ لکڑی آرام دہ کیسے ہو سکتی ہے۔

ظفر خان پاکستان آنے سے پہلے چین/ہانگ کانگ میں کام کر چکے ہیں۔ چینی زبان انہیں خوب آتی ہے۔ یہ انہوں نے تعلیم کے دوران سیکھی۔ جب ۱۰ سال پہلے امریکا میں اس کے پرو فیسر نے انہیں کہا کہ جرمین مت سیکھو، ماسی کی بات اور زبان ہے۔ آنے والا وقت چین کا



زیادہ بونس دیں، تو لوگ تنخواہ سے زیادہ کام کرتے ہیں

یورپ کی ہیں۔ چونکہ ہماری عظیم دوسرے کچھ کی ہیں، اس لیے ہم جانتے تھے کہ ہمارے بچوں کے نام ایسے ہوں جو دونوں کچھ میں کامیاب ہوں۔ ہم نے بچوں کی پیدائش سے پہلے ہی ان کے نام سوچے ہوئے تھے۔ ایک نام ہم نے صوفیہ اور دوسرا نذر سوچا ہوا تھا۔ اس طرح ہم نے نذر کا "نر" اور صوفیہ کا صوفی لے کر اپنی کمپنی کا نام Sofizar رکھا۔ صوفیہ چھوٹی ہے اور نذر بڑا بیٹا ہے۔

س: شادی کب ہوئی؟

ج: شادی ۲۰۰۳ء میں ہوئی اور کمپنی بھی ۲۰۰۳ء میں قائم ہوئی۔ شادی کے اگلے ہی دن ہم نے یہ کمپنی قائم کی۔ بعد کے سالوں میں ہمارے ہاں ایک اور بیٹا پیدا ہوا جس کا نام ذکر یا رکھا، جس کے نام سے ذکی فارم بنایا۔ میری بیگم نو مسلم ہیں اور وہ ۹/۱۱ کے بعد مسلمان ہوئی تھیں۔

س: آپ کی وجہ سے مسلمان ہوئیں یا حالات دیکھ کر مسلمان ہوئیں؟

ج: میری بیگم وکیل ہیں۔ چونکہ ۹/۱۱ کے بعد اسلام کے خلاف بہت باتیں ہوئیں۔ اس لیے میری بیگم نے اپنے طور پر اسلام کے متعلق بہت تحقیق کی اور انھوں نے کہا کہ یہ تو بہت اچھا مذہب ہے۔ وہ پھر عیسائی سے مسلمان ہوئیں۔

س: آپ سے ملاقات کہاں ہوئی؟

ج: میں سوئٹزرلینڈ میں کام کرتا تھا اور وہ وہیں وکیل تھیں۔ میری ملاقات ان سے کسی دوست کے ذریعے

ہے۔ چینی زبان سیکھو اور غلطی سے جیسے مانتے والے شاکرہ کی طرح استاد کی بات دل سے مان لی اور پھر سالوں بعد خوب فائدہ اٹھایا۔

صوفی زار کی ۳ ویلیوز ہیں جو میں نے وہاں پہنچنے سے پہلے دہرائی تھیں۔ آج کی دنیا میں جس ادارے کا کھانا ہوا وژن اور سوچنی کبھی ویلیو نہیں، وہ بزنس ادارہ بہر حال نہیں اور کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

☆ Integrity and Ethics

☆ Utmost respect for Employees

☆ Innovation not Irritation

☆ Stay unsatisfied

آئیے! ملتے ہیں ظفر خان سے۔ ایک نئے بزنس رول ماڈل سے سوال ہمارے جواب ان کے نتائج آپ خود نکالے۔ س: اتنا بڑا ادارہ، اتنے ڈھیر سے کام، ۱۰۰ء کے لگ بھگ عملہ، آپ کتنے گھنٹے روزانہ کام کر لیتے ہیں؟

ج: میں روزانہ ۱۲ سے ۱۴ گھنٹے کام کرتا ہوں لیکن یہ وضاحت کر دوں کہ میں اس عرصے کے دوران کوئی ایک کام نہیں کرتا۔ مختلف کام انجام دیتا ہوں۔ اس وقت ہمارے ۲ کاروبار، ۴ دفاتر ہیں۔ کچھ گھنٹے میں اپنے فارم پر گزرتا ہوں اور کچھ گھنٹے دفتر میں صرف کرتا ہوں۔ ہمارا کاروبار ترقی کر رہا ہے جس کے باعث ہمارے پاس جگہ کم پڑ گئی ہے، اس لیے ہم مزید جگہ حاصل کرنے کی کوشش میں ہیں۔ ہم اپنی کمپنی میں بہت سے لوگ بھی بھرتی کرنے والے ہیں کیونکہ ہم موبائل سیمز کے ایک نئے کاروبار کی شروعات کر رہے ہیں۔ ہماری ترقی کے مزید امکانات موجود ہیں اور ہم ترقی بھی کر رہے ہیں۔

س: تو اس سال آپ کی گروتھ ۴۲ فیصد سے بڑھ جائے گی؟

ج: ان شاء اللہ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ گروتھ اس سے بھی زیادہ ہو۔

س: آپ Sofizar لفظ کیسے ادا کرتے ہیں؟

ج: ہماری شادی پاکستان میں ہوئی تھی مگر ہماری بیگم

ذکی فارم پر حیرتوں کا سامنا

کھیتوں کے سچ میں ہنا ہوا فشن فارم نہ صرف صاف ستھرا تھا بلکہ اُس کے چاروں طرف پودے بھی لگے ہوئے تھے اور فارم کے کنارے پھیلنے والے لیے زیادہ آکسیجن کی فراہمی کے لیے "سولر پینل" نصب تھا، جس کی مدد سے بننے والی بجلی کی مدد سے پانی کے اندر اضافی آکسیجن جاری تھی۔ فیرموی سبزیوں کے لیے صاف ستھری گیارہاں اور ان کے اوپر نقاست سے لگی ہوئی پلاسٹک شیلیں پودوں کو سردی سے بچانے اور زیادہ پیداوار دینے کے لیے مدد فراہم کر رہی تھیں۔ ملازمین کو اپنے کھانے پکانے کے لیے بائو گیس اور گیس سے چلنے والے چولہوں کی سہولت بھی تھی۔



ہو جاتی ہیں ان کی پارنرشپ ہو جاتی ہے؟
ج: بالکل درست۔

س: پہلی ملاقات میں ان کی کیا خوبی آپ کو بھائی؟
ج: دیانتداری۔ جو بات کرتی ہیں، اپنے اندر سے کرتی ہیں۔ ایمانداری اور خلوص سے کرتی ہیں۔ عام طور پر ہم مسلمان روایتی طور پر مسلمان ہوتے ہیں بعض کو ان کے والدین نے سکھایا ہوتا ہے اس پر عمل کرتے ہیں۔ میری بیگم نے سوچ سمجھ کر اور تحقیق کے بعد اسلام قبول کیا۔ حالانکہ سارے لوگ ان کے مخالف تھے اور انہوں نے یہ فیصلہ اپنی مرضی سے کیا۔ میری بیگم چونکہ وکیل ہیں، اس لیے انھوں نے پورے اسلامی قانون کو پڑھا اور محسوس کیا کہ اسلام میں عورتوں کے لیے سب سے زیادہ آزادی

ہوئی۔ انھوں نے ان کا تعارف مجھ سے کروایا کہ یہ مسلمان ہیں اور چاہتی ہیں کہ ان کی شادی کسی مسلمان ہی سے ہو۔ پھر ان دوستوں سے ہمیں ملایا۔ میں نے اپنے والدین سے اجازت لی۔ انھوں نے اجازت دے دی اور یوں ہماری شادی ہو گئی۔

س: Love in first sight والا معاملہ تو نہیں ہوا؟
ج: ایسی چیز نہیں تھی۔

س: کیوں اچھا لگے یہ تعلق بنانا؟
ج: ہماری گپ شب ہوئی۔ اسلام اور زندگی کے بارے میں ہمارا تکتہ نظر کافی ملتا جلتا تھا۔ اس طرح ہم اکٹھے ہو گئے۔

س: عام طور پر کہا جاتا ہے کہ جن لوگوں کی اقدار ملتی



مجھے اپنے کمپیوٹر
پر صبح، دوپہر،
شام ہر گائے کے

دودھ کی مقدار کا علم ہو رہا ہوتا ہے

ج: اصل میں اچھی قسم پر یقین رکھتا ہوں کہ آپ کے مینیجر بہترین لوگ ہونا چاہیں۔ آپ ان پر اعتماد کریں ان کی نگرانی کریں۔ ان کے کام میں مداخلت نہ کریں۔ ان میں آہستہ آہستہ اعتماد پیدا ہونا چاہئے گا۔ انہیں بہت اچھی تنخواہ دیں۔ ان کا اتنا اچھا خیال رکھیں۔ انہیں اس قدر بونس دیں پھر وہ اپنی تنخواہ سے کہیں زیادہ کارکردگی دکھائیں گے۔ اگر آپ ان کے کام میں مداخلت کریں گے تو ان کے کام میں اعتماد پیدا نہیں ہوگا۔ میں ایک دو نشتے کے لیے امریکا چلا جاتا ہوں لیکن ٹیم منجھٹ کے ذریعے تمام کام بخوبی چلتا رہتا ہے۔ ہم نے اپنے فارم میں ہر گائے کی دودھ کی پیداوار کا سافٹ ویئر بنایا ہوا ہے جس کے ذریعے صبح، دوپہر، شام ہر گائے کی دودھ کی پیداوار کے بارے میں مجھے معلوم ہوتا رہتا ہے۔ ہر گائے کو ایک خاص نمبر دیا گیا ہے اور صبح، دوپہر، شام ہر ایک گائے کی ایک وقت کی پیداوار معلوم ہوجاتی ہے۔

س: آپ نے اپنے ناپ مینیجر کو کہاں سے ڈھونڈا؟

ج: میں نے انہیں شروع میں بطور کنسلٹنٹ رکھا، ان کی کارکردگی کا جائزہ لیا یہ لوگ مختفی تھے انہیں اپنے پاس ملازم رکھ لیا۔

س: فارم کا کاروبار کس طرح شروع کیا؟

ج: میں نے پہلے چھوٹے پیمانے پر کام شروع کیا اور مقامی جانوروں کو استعمال کیا۔ اس کے بعد ہم نے آسٹریلیا سے گائیں منگوائیں۔ ہم نے اپنے فارم پر گایوں کو مناسب

اور تحفظ موجود ہے۔

س: انہیں اتنے سالوں میں ظفر خان کی کون سی بات اچھی لگی؟

ج: یہ تو آپ ان سے ہی پوچھ لیجیے۔

س: اتنے سالوں کے تعلق کی خوبصورتی اور مضبوطی کی وجہ کیا تھی؟

ج: باہمی احترام۔ انہیں یہ بات بھی محسوس ہوتی ہے کہ میں بہت زیادہ فعال اور کام کرنے والا شخص ہوں اور دوسروں کا خیال رکھنے والا بھی ہوں۔

سنجے ہم دونوں کے ساتھ مانوس ہیں۔ ہم چاہتے تھے کہ ہمارے بیٹے ایک اسلامی ملک میں رہیں۔ میری بیگم یورپ سے ہیں لیکن وہ حجاب پہنتی اور بچوں کو بھی اسلامی ماحول میں دیکھنا چاہتی ہیں۔ آپ توقع نہیں کر سکتے کہ میری بیگم اس وقت کہاں ہوں گی۔ وہ اس وقت واپڈا کے دفتر میں ہیں اور بلز کے بعض معاملات دیکھ رہی ہیں۔

ہمارا ایک اصول ہے کہ ہم رشوت نہیں دیتے۔ ہمارے فارم باؤس کا بجلی کا بل بہت زیادہ آگیا تو ہم نے رشوت دینے کے بجائے حکومتی دستاویزات کی بنیاد پر قانونی شکایت کے ذریعے واپڈا احکام سے اپنا حق وصول کیا اور زائد رقم واپس لی۔ یہ سب کام میری بیگم ہی نے کیا۔ بات یہ ہے کہ ہمارے ملک میں تمام قوانین موجود ہیں۔ لیکن عام آدمی ان کا مطالعہ نہیں کرتا۔ اس لیے لوگ اپنے حقوق سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ہماری پالیسی یہ تھی کہ نہ تو ہم نے رشوت دینی ہے نہ ہی ہم نے فون کروانا ہے اور پاکستان میں کام آئی ۲ ذریعوں سے ہوتے ہیں۔ اس دوران ہم پر دباؤ ڈالنے کی بہت کوشش کی گئی لیکن ہم نے حوصلہ برقرار رکھا۔ اس طرح برکی کے گاؤں والے بھی جب اس صورت حال سے دو چار ہوتے ہیں تو میری بیگم کے پاس آتے ہیں اور وہ ان کا مسئلہ حل کرا دیتی ہے۔

س: آپ کے یہ دونوں کاروبار یکسر مختلف ہیں۔ آپ ان دونوں میں کس طرح توازن قائم کرتے ہیں؟ کیسے کامیابی سے چلاتے ہیں؟

صاف ستھرے اور علحدہ علحدہ شیڈ

۶۰ سے زائد آسٹریلیئن گاٹیوں کا شیڈ نہ صرف صاف ستھرا تھا بلکہ تازہ ہوا کے لیے اس میں بڑے بڑے چٹھے لگے تھے، جو گرمیوں میں شاور کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ صاف ستھرا چارہ ٹانکڑ پر دھرا تھا، جس تک گائے کا صرف منہ پہنچتا تھا، پاؤں نہیں۔ آرام کرنے کی جگہ ریت اور مٹی بچھی تھی اور یہ کھانے کی جگہ سے کچھ دور تھی۔ اصول یہ ہے کہ گائے کو آرام کا جس قدر زیادہ وقت ملے گا اسی قدر وہ زیادہ بنے گا۔

ہر گائے کے کان میں ایک ٹیگ (Tag) پرویا ہوا تھا، جس پر اس کا وہ نمبر درج تھا، جس سے اس کا کمپیوٹر میں اندراج ہوتا ہے۔ دودھ دینے والی گاٹیوں کے ۲ بڑے شیڈ تھے جبکہ ان سے کافی دور چھوٹے پیچڑوں، ان سے بڑی ہوتی پیچڑیوں اور گائے بننے کی پیچڑیوں کے شیڈ الگ الگ تھے۔ بالکل نوزائیدہ بچوں کے لیے لوبے کے محفوظ ڈبے تھے تاکہ ان سے تھوڑے بڑے پیچڑے ان کو تنگ نہ کریں۔ ان میں سے اکثر بچوں کا باپ ایک ویوٹیکل آسٹریلیئن نیل تھا، جس کی مالیت ۱۰ لاکھ سے زیادہ کی تھی۔ فارم کے مینیجر جو ایک ویٹری ڈاکٹر ہیں نے بتایا کہ ایسے مخصوص بیلوں کی قیمت ایک کروڑ تک جا پہنچتی ہے۔ فارم پر ہر گائے ۲ بار مصنوعی نسل کشی (جیکے کی مدد سے) کے عمل سے گزرتی ہے جس میں ۹۹ فیصد تک مادہ بچے پیدا ہوتے ہیں۔



۴۰ ہیکڑ پر گائے فارم اور بھایا رستے پر سبزیاں لگائی ہوئی ہیں۔ ہمارے پاس ۶۰ ہیکڑ بھی ہیں جنہیں کھلے کہا جاتا ہے۔ ہمارا اصول یہ ہے کہ ہم جو چیزیں پیدا کریں اپنے، گاؤں والے اور ارد گرد رہنے والوں کے استعمال کے لیے ہوں۔ Community Supported Agriculture پر یقین رکھتے ہیں۔ ہم نے وینس میں ایک سٹور بھی بنایا ہے جہاں دودھ فروخت ہوتا ہے۔ سبزی کا ایک پیکٹ ۳ روپو کا ۱۰۰ روپے میں دیتے ہیں۔ ہمارا مقصد زیادہ منافع نہیں

ماحول مہیا کرنے کے لیے بہت بڑے بڑے چٹھے لگائے ہوئے ہیں۔ جن کے باعث انہیں گرمی محسوس نہیں ہوتی۔ ہم چاہ رہے ہیں کہ ہم اعلیٰ معیاری کام کریں۔ ہم شیڈ کی دن میں تین دفعہ صفائی کرتے ہیں۔ ہماری قدر یہ ہے کہ کوئی چیز ضائع نہ ہو۔ گورنمینٹ انم Asset ہے۔ اسے ہم یونہی ضائع نہیں کرتے۔ اس سے ہم پائیدگی بناتے ہیں جو بجلی بنانے کے کام آتی ہے۔ بھایا فصلوں کے لیے کھاد کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ۱۵۶ ہیکڑ میں سے ۳۰ سے



ہم سالانہ تین ارب

روپے کمالیتے ہیں

ج: ہم ۲۰۱۱ء میں پاکستان کی تیزی سے ترقی کرنے والی ۲۵ رانسر پرینور میں شامل ہوئے۔ ہم MIT کا بزنس ایکسلریشن کا اعزاز بھی نومبر ۲۰۰۷ء میں جیت چکے ہیں۔ س: پاکستان آنے کا فیصلہ اصل محرک کیا تھا؟

ج: میرے والدین امریکا میں ہیں۔ میرا تمام خاندان امریکا میں ہے مجھے یہ شوق تھا کہ ہم اسلامی ملک میں رہیں۔ مجھ سے زیادہ میری بیوی کو زیادہ شوق تھا کہ ہم یورپ میں بیویوں رہیں بلکہ اسلامی زندگی گزارنے کے لیے کسی اسلامی ملک میں رہیں۔ میری بیگم کسی بھی اسلامی ملک جانے کو تیار تھیں۔ مگر میں نے کہا کہ پاکستان چلتے ہیں۔ میرے والدین بھی ملنے آتے ہیں۔ میرے والد چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ ہیں لیکن دو کہتے ہیں کہ تم وقت ضائع کر رہے ہو۔ کیونکہ دو اعداد و شمار کے آدمی ہیں۔ میری والدہ بھی حیات ہیں۔ میری بہن شاعرہ ہیں جن کا کلام چھپ چکا ہے۔ میرے بھائی سافٹ ویئر کا کام کرتے ہیں۔

س: اپنی اود اپنے کاروبار کی ترقی کا راز بتائیں گے؟
ج: میرا اس بات پر یقین ہے کہ دیانتداری اور اقدار (Ethics) کے بغیر کاروبار ممکن ہی نہیں۔ میرے کاروبار کی ترقی کا راز اخلاقی اقدار ہیں۔ میرا اصول ہے کہ نہ میں خود غلط کام کروں اور نہ دوسروں کو غلط کام کرنے دوں۔ ایک وقت آیا کہ ہمارا منافع بہت کم ہو گیا اور میں نے امریکا جانے کا فیصلہ کر لیا لیکن پھر یہ سوچا کہ میرے پاس لوگ بہت اچھے نوکریاں چھوڑ کر آئے ہیں۔ اگر میں چلا گیا تو ان

بلکہ صارفین کو معیاری مصنوعات فراہم کرنا ہے۔ میں نے اپنے دونوں کاموں کے لیے ایک ٹیم رکھی ہوئی ہے جس کی نگرانی میں خود کرتا ہوں۔

س: جب صوفی زار کا کاروبار شروع کیا آپ نے دفتر کہاں بنایا؟

ج: سب سے پہلا دفتر اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں بنایا۔ جب کاروبار بڑا ہوا تو اوپر کی منزل لے لی۔ پھر ایک اور گھر کرائے پر لے لیا۔ اب ہم مزید جگہ کی تلاش میں ہیں۔ مجھے ڈرائنگ روم سے بہت اہمیت ہے اس لیے میں نے کوشش کی کہ دفتر نزدیک ہو۔

س: صوفی زار کا اصل بزنس کیا ہے؟

ج: ہماری ویب سائٹ پر Seller اپنی چیزیں بیچتے ہیں۔ ہم اپنی کمیشن رکھ لیتے اور Seller کو رقم ادا کر دیتے ہیں اور پھر Seller خریدار کو سامان بھجوا دیتا ہے۔ دراصل زکی فارم اور صوفی زار کا کوئی مقابلہ نہیں۔ دراصل زکی فارم کا کاروبار خدمت خلق کے طور پر کر رہے ہیں۔ وہاں سے ہم جتنا ایک ماہ میں کماتے ہیں یہاں سے ہم ایک دن میں کمالیتے ہیں۔ جب ہم نے زکی فارم کا کاروبار شروع کیا تھا تو ہمارا خیال تھا کہ ہمارے بچوں کو خالص غذا ملے گی۔

مزید براں میرے خیال میں پاکستان کا مستقبل ہمارے لوگ Human Capital ہے۔ ماشاء اللہ ہمارے لوگ اتنے ہی ذہین ہیں جتنے امریکی۔ اسے ہم Flat World Concept کہتے ہیں کہ ہم پاکستان میں بیٹھ کر وہی کام کر سکتے ہیں جو ہم امریکا میں کر سکتے ہیں۔ ہم امریکیوں کے برابر کمال سکتے ہیں اور اپنی مصنوعات دوست ہمسایوں کو فروخت کر سکتے ہیں۔ یہ خیال مجھے اس لیے آیا کہ ہم نے ایک Fraud Detection Software بنایا۔ جس کے ذریعے اصلی اور جعلی خریدار اور Seller کی نشاندہی ہو سکتی تھی۔ Online Selling کے ذریعے ہم تین ارب روپے سالانہ کمالیتے ہیں۔

س: آپ آل ورلڈ نیٹ ورک کی نظر میں کب آئے؟

دیکھنے کی عادت تھی۔

س: آپ کے دوستوں کا حلقہ کیا ہے؟

ج: میرے دوست بھی سافٹ ویئر کمپنیوں کے مالک owners ہیں۔

س: کبھی کس وجہ سے اپنے Believes پر ڈمگاے؟

ج: پولیس اور وایڈ ان کی وجہ سے بہت مشکلات پیش آئیں۔ لیکن جب آپ ایک مزید اپنی Dedication اور دیانتداری کے ساتھ معاملات حل کر لیتے ہیں تو پھر ذرا جھجک شعور جو جاتی ہے اور آپ کے کام بھی درست طور پر ہونے لگتے ہیں۔ شروع میں ہر شخص یہی کہتا ہے کہ آپ وقت ضائع کر رہے ہیں۔ پھر مٹلیس دیتے ہیں کہ جس کام کو چیف مفسر بھی نہیں کروا سکا وہ آپ نے کر دیا۔ دراصل میری بیوی میری طاقت ہے۔ وہ مجھ سے بھی زیادہ اس بات پر قائل ہے کہ لحاظ کام نہیں کرنا بلکہ صحیح کام کرنا ہے۔ میں جب بھی ڈمگاتا ہوں تو میری بیوی مجھے حوصلہ دیتی ہے۔

کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ میں نے اٹھاتی رویہ اپنایا ہے۔ یعنی اپنے فائدے کے ساتھ ساتھ دوسروں کا فائدہ بھی۔

ہم نے اپنا یہ اصول بنایا کہ رشوت دے کر کام نہیں کرنا۔ ہم نے اتنی رقم کا پتروں خرچ کر دیا جتنی رقم ہم رشوت کے لیے دے سکتے تھے۔ مگر کام لحاظ نہیں کیا۔ کیونکہ لوگوں کو مثال مٹی چاہیے کہ پاکستان میں صحیح طریقے پر بھی کام ہو سکتا ہے لیکن اس کے لیے پوری توجہ اور دیانتداری کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ برکی گاؤں کے لوگ ہم سے خوش ہیں۔

س: سچے کہاں پڑھ رہے ہیں؟

ج: بیٹا اپنی سن میں اور بیٹی کنڈرگرسپس میں ہے۔ میں بھی اتنی سن سے تعلیم حاصل کر چکا ہوں۔ پھر امریکہ اور کیلیفورنیا سے۔ میرے والدین پشاور میں تھے اور میں نے او لیول کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے لاہور آنے کی خواہش کی۔ مجھے شروع ہی سے Out of the box

پاکستان کے لوگ مغربی کلچر اپنا رہے ہیں اور نہیں جانتے کہ ریشیا کے لوگ یہ کلچر اپنا کر کس قدر نقصان اٹھا چکے ہیں

یوکرائن (سابق روس) سے تعلق رکھنے والی اہلیہ رخسانہ خان کی باتیں



میرا تعلق یوکرائن سے ہے۔ یوکرائن وسطی اور مشرقی یورپ میں واقع ہے۔ میں اس وقت پیدا ہوئی جب یہ ملک سوویت یونین کا حصہ تھا۔ ۱۹۹۱ء میں آزاد ہوا۔ میں نے ممبئی لاہ میں ماسٹر کیا۔ پوسٹ گریجویٹیشن بین الاقوامی پبلک لاہ میں حاصل کی۔ یوکرائن میں انٹرنس اور



میری بیوی کو بہت شوق تھا زندگی کسی

اسلامی ملک میں بسر کرنے کا

معلمہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ان کی اقدار کیا ہیں۔ ہماری کوشش ہوتی ہے کہ ہمارے ملازمین ہمارے پاس پانچ دس سال رہیں اور ہم ان سے بھرپور فائدہ اٹھائیں۔ ہم وہ ملازم رکھتے ہیں جو کھینے میں ہوشیار اور مستعد ہوں اور مستقبل میں کمپنی کا اثاثہ بن سکیں۔ کیونکہ ان کی گروتھ ہی ہماری گروتھ ہے۔

س: یہ خیال آپ کو کیسے آیا؟ کاروباری لوگ تو عام

س: آپ کی عظیم اسلامی ملک کا تصور لے کر آئی تھیں تو یہاں آکر انہوں نے کیسا محسوس کیا؟

ج: وہ بہت خوش ہیں۔ انھوں نے اپنی دنیا تخلیق کر لی ہے۔ پاکستان میں ہونے والے خود کش دھماکوں کی وجہ سے ہم بہت پریشان تھے کہ ہمارے بچے کسی بھی وقت حادثے کا شکار ہو سکتے ہیں۔ اس لیے ہمیں امریکا واپس چلے جانا چاہیے۔ لیکن اب حالات اچھے ہیں اور اب ہم اپنی خوشی سے یہاں رہ رہے ہیں۔ میں وہ بارہ کہتا ہوں کہ میری بیوی ہی میری طاقت ہے۔

س: اکثر کہا جاتا ہے کہ ہمارے نوجوانوں خصوصاً تعلیم یافتہ نوجوانوں کا Believe System بہت کمزور ہے۔ آپ کیا کہتے ہیں؟

ج: اسے Generalize نہیں کیا جاسکتا۔ جب ہم اندر دیکھیں اور ٹیسٹ لیتے ہیں تو ہر قسم کے سوالات پوچھتے اور مجموعی نتیجہ اخذ کرتے ہیں تو ان سوالات کے ذریعے یہ

آجستہ آجستہ میں اسلام کی طرف مائل ہو گئی۔ میں سمجھتی ہوں کہ اسلام پہلے سے موجود مذاہب کی قدرتی Continuation ہے۔

میرا تعلق ذریعہ گھرانے سے تھا۔ میں ان چیزوں سے ابتدا سے ہی واقف تھی۔ ظفر کی بھی جائوروں میں دلچسپی تھی۔ فارم باؤس شروع کرتے وقت ہمارے ذہن میں دو چیزیں تھیں، ہم یہ چاہتے تھے کہ ہمارے گھر میں جو غذا آئے وہ معیاری ہو۔ دوسری ظفر آئی کی کے ملاوٹوں کی ایسے سسٹم میں بھی کام کرنا چاہتے تھے جو یہاں فقر اندازہ ہو رہا تھا۔ ہم نے ایک نئی قسم کی فارمنگ شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہم چاہتے تھے کہ بڑے کھلے لوگ فارمنگ کے شعبے میں آئیں اور دوسرے لوگوں کے لیے مثال بنیں۔

میں نے ایک چیز نوٹ کی ہے کہ جو چیزیں ہم کھاتے ہیں وہ کیسے اگائی جاتی ہیں۔ یا جو چیز ہم کھاتے ہیں ان کا معیار کیا ہے۔ ہم ان باتوں پر بالکل توجہ نہیں دے رہے۔ اس معاملے میں ہم ان پڑھ لوگوں کے نرم و کرم پہ ہوتے

ٹرانسپورٹ سمیت کئی کمپنیوں میں کام کیا۔ اس کے بعد اقوام متحدہ میں اپنے ملک کی ٹرانسپورٹ انڈسٹری کے نمائندے کی حیثیت سے بھی کام کرنے کا موقع ملا۔ ظفر خان سے ملاقات سوئٹزرلینڈ میں ہوئی۔ ہماری شادی ارشد خدیجہ میرمن تھی۔

جب میں پیدا ہوئی تو میرا ملک سیکولر ملک تھا لیکن مذہبی لوگوں کی تعداد بھی اچھی خاصی تھی۔ میرے دادا مذہبی آدمی تھے۔ مذہب کی ابتدائی باتیں میرے سینے کا موقع ملا۔ پھر میری دلچسپی مذہب کی تاریخ اور فلاحی میں بھی بڑھنے لگی۔ میں نے یونیورسٹی کے زمانے میں سچائی کی تلاش کا سفر شروع کیا۔ صوفی ازم میں بھی دلچسپی رہی۔ مشرق کے مختلف فکری نظاموں کا بھی مطالعہ کیا۔ ہمارے ہاں اسلامک گھڑل سنٹر بھی تھا۔ میں وہاں باقاعدگی سے جانے لگی۔ یہاں لائبریری میں بھی وقت گزارتی رہی۔ سنٹر میں اردن، کویت، سعودی عرب، مصر اور مختلف ملکوں سے لوگ آتے تھے۔ ان سے بھی بات چیت جاری رہی۔ اس طرح

www.Paksociety.com

لے لیے Clear Core Values مقرر کریں اور ان پر عمل بھی کیا وہ کامیاب رہیں۔ اس طرح ہم نے بھی اپنے لیے بنیادی اقدار مقرر کریں اور انہیں اپنے ہاں رائج کیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر بطور سی ای او میں ان اقدار پر عمل نہیں کروں گا تو دوسرے بھی نہیں کریں گے۔

س: آنے والے سالوں کے لیے کیا منصوبے ہیں؟

آپ کون سا نیا کاروبار شروع کرنے والے ہیں؟

ج: موبائل سیمز۔ میرے اس کاروبار کی بنیاد Flat World Business ہے۔ یعنی میں اپنے آدمیوں کے ذریعے پاکستان میں بھی وہی کچھ کما سکتا ہوں جو امریکا میں۔

س: ملازمین کے لیے ریوارڈ سسٹم پر یقین رکھتے ہیں؟

ج: میں ریوارڈ سسٹم پر بہت زیادہ یقین رکھتا ہوں۔ آپ کا فائدہ بھی ہوتا ہے جب آپ کے ملازمین کا فائدہ ہوتا ہے۔ یہ نہایت عملی بات ہے۔ ہمارے ہاں جب کوئی

میں چاہتی ہوں کہ وہ اپنے ہاتھوں سے زراعت کے پھولے چھونے کام خود کر سکیں۔ مستقبل میں اپنی زندگی کے بارے میں خود فیصلہ کریں۔

یوکرائن میں بھی فمیلی سسٹم مضبوط ہے۔ میری والدہ ہر سال ہمیں ملے پاکستان آتی رہتی ہیں۔ ہم بھی ہر سال یوکرائن جاتے ہیں۔ میری والدہ کو جو چیز اداں کرتی ہے وہ یہاں کی غربت ہے۔ یوکرائن جب سوویت نظام کا حصہ تھا تو اس کی یہ بات اچھی تھی کہ حکومت تعلیم، رہائش اور لوگوں کی دیگر بنیادی ضرورتوں کا خیال رکھتی تھی۔

یوکرائن کی زبان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ پانچویں زبان سے قربت رکھتی ہے۔ لوگ اس حوالے سے تحقیق بھی کر رہے ہیں۔ پنجاب کا لفظ ہمارے ہاں بھی پایا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں Pyatirichcha کا لفظ بولا جاتا ہے جس کا مطلب ہے ۵ دریاؤں کی سرزمین۔

پاکستان میں لوگ مغربی فکیر کو اپنا رہے ہیں لیکن سوویت یونین کے لوگوں نے بھی مغربی فکیر کی نقالی کی اور

لوگ صرف اپنے لیے سوچتے ہیں۔

ج: میں اپنے لیے بھی سوچتا ہوں اور ان کے لیے بھی سوچتا ہوں۔ اگر ان کا فائدہ نہیں سوچوں گا تو جسے ہم نے تربیت دی ہے وہ ہمیں چھوڑ کر چلا جائے گا۔ ہمیں اس کا سوچنا چاہیے کہ اگر ہمارا فائدہ ہو رہا ہے تو پھر اس شخص کا بھی ہونا چاہیے۔ ہم بھی لاکھ ٹرم سوچتے ہیں جس طرح آرڈر ڈائجسٹ کی عمر ۱۵ سال ہے اور اس کے لیے بھی لاکھ ٹرم منصوبہ بندی کی گئی ہوگی۔ ہمارا موقف یہ ہے کہ بیسٹ ٹرینڈ لوگ ہمارے لیے اچھی خدمات فراہم کریں گے۔

س: جب کمپنی کر دھ میں ہوتی ہے تو توجہ آمدن پر ہوتی ہے۔ اس دوران آپ نے اپنی اقدار اور وژن کو اسٹیبلش کیا۔ یہ ارادی تھا یا اتفاقاً؟

ج: یہ سب ارادی تھا۔ میں نے Jim Collins کی کتاب Built to Last پڑھی جس میں مختلف کمپنیوں کا تقابل کیا گیا تھا۔ اس میں بتایا گیا کہ جن کمپنیوں نے اپنے

ہمارے قادم پر اب طالب علم بھی آتے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ ان کو بتایا جائے کہ کوئی پیشہ حق نہیں۔ ہاتھ سے کام کرنے والوں کو بھی عزت دینی چاہیے۔

میں دین کو زندگی سے غلطہ نہیں سمجھتی۔ میں چاہتی ہوں کہ طالب علموں کو بتایا جائے کہ صفائی کا خیال رکھا جائے اور وہ کوئی ہنر (Skill) سیکھ کر باعزت زندگی گزاریں۔ دین، نماز، روزہ اور صدقہ خیرات کے علاوہ ایک طرز زندگی کا بھی نام ہے۔

پاکستان میں تعلیمی نظام میں سماجی کام (Community Work) کا کوئی تصور نہیں۔ تعلیم ایسی ہونی چاہیے کہ طالب علم اپنے فائدے کے علاوہ اپنی کمیونٹی کے بارے میں بھی سوچیں اور سماجی بھلائی کے چھوٹے چھوٹے کاموں پر بھی توجہ دیں۔ ہمارے بچوں کو جانور اور قادم اچھے لگتے ہیں۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ دیگر سرگرمیوں میں بھی حصہ لیتے ہیں۔ گالف اور کرائے بھی کھیلتے ہیں۔ بچے اچھے اداروں میں پڑھ رہے ہیں لیکن



سارے لوگ
مخالف تھے،

میری بیوی نے

سوچ سمجھ کر اسلام قبول کیا

اور بغیر ٹھکانی کے کام کرتے ہیں۔ وہ اپنی مرضی اور خوشی سے ہر کام وقت پر انجام دیتے ہیں۔ اس طرح ریورڈ سسٹم سے کام چور ملازم بھی نہایت محنت سے کام کرتے ہیں کہ پیداوار زیادہ ہو اور انھیں انعام ملے۔

میں اپنے ملازمین سے خوش اخلاقی سے پیش آتا ہوں اور وہ بھی میرے وفادار ہوتے ہیں۔

ہمارے فارم پر کل ۲۰ ملازمین ہیں۔ باغبان بھی

ملازمین کا مہمانی حاصل کرتا ہے تو اسے پوسٹ دیا جاتا ہے اور یہ چیز سکریں پر رکھائی جا رہی ہوتی ہے۔ پھر سب ملازمین دیکھتے ہیں کہ کس کی کارکردگی اچھی ہے اور کس کی کم۔ زیادہ کارکردگی والا ملازم خوش ہوتا ہے اور کم کارکردگی والا شرمندہ ہوتا ہے اور زیادہ اچھی کارکردگی کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ انسان میں یہ شعور ذہنیت ہوتی ہے سوچتا ہے کہ کوئی یہ نہ دیکھ سکے کہ مالک کتنے پیسے کمارا ہے۔ ہمارے ماں ایسا نہیں۔ سب کو سکریں سے پتا چل جاتا ہے کہ کبھی کوئی آمدنی ہو رہی ہے۔ پھر نئی کامیابی حاصل کرنے پر ملازم کو ۵ فیصد پوسٹ ملتا ہے۔ ملازمین کا احترام ہماری بنیادی اقدار کے مین مطابق ہے۔ اگر ہم ملازمین کی عزت کریں گے تو وہ بھی ہمارے لیے اچھا کام کریں گے۔

ہمارے فارم پر جب بھی دودھ کی پیداوار میں ۱۰۰ لیٹر کا اضافہ ہوتا ہے تو پھر ملازمین کو پوسٹ دیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ملازمین وقت پر کام کرتے ہیں

تعاونی طریقے سے ۲ لاکھ روپے ان لوگوں سے واپس لیے۔ پاکستان میں پولیس، عدالتوں اور واپڈا جیسے اداروں میں رشوت اور سفاک کالچر ہے۔ ان اداروں میں لوگوں کو احترام نہیں ملتا۔ لوگ اپنے حقوق سے بھی بے خبر رہتے ہیں۔ اس لیے انھیں زیادہ مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مجھے کئی اداروں میں جانا پڑتا ہے۔ غیر ملکی ہونے کے باعث فائدہ بھی ہوتا ہے لیکن اس بات کا دکھ ہوتا ہے کہ یہاں کے شہریوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہوتا۔ اب میں Energy Efficient خرچ کرنا چاہتی ہوں جو بجلی، گیس جیسی توانائی کی ضروریات کے لیے حکومتی اداروں کا ہمتا نہ ہو۔ اپنے فارم پر نیم بائو گیس سے اپنی ضروریات کے لیے بجلی پیدا کر رہے ہیں۔ یہاں کی تعمیر کے طریقوں کو تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے گھر اور پلازے ایسے ہیں جن میں گرمیوں میں ٹھنڈا رکھنے کے لیے اسے ہی پر انحصار کرنا پڑتا ہے اور سردیوں میں ہیٹر استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ اپنے طریقہ تعمیر کو تبدیل کر کے

نقصان اٹھایا۔ یہاں کی ایک تبدیلی اچھی ہے کہ اب لوگ ماحولیاتی تحفظ کے بارے میں بات کرنے لگے ہیں اور کئی اچھے منصوبے بھی شروع کیے جا رہے ہیں۔ برا بھلا ہور کی باتیں بھی سننے میں آ رہی ہیں۔ ہمارے پوکرائن کے لوگ بہت مخمقی ہوتے ہیں۔ یہاں کے لوگ مظلوم بنے رہتے ہیں۔ خود کو بے بس سمجھتے ہیں۔ حکومتوں کو طاقتور سمجھتے ہیں۔ اگر وہ محنت سے اپنی تقدیر بدلنے کی کوشش کریں تو سب کچھ ممکن ہے۔ ہم قدرت کی نعمتوں کی قدر نہیں کرتے۔ وسائل کو دانشمندی سے استعمال نہیں کرتے۔ اس حوالے سے آگہی پھیلانے کی ضرورت ہے۔ جب لوگوں کو بہتر روزگار ملے گا تو وہ ماحول کے تحفظ جیسے معاملات کے بارے میں ذمے دار بنیں گے۔ پاکستان میں چیزوں کو استعمال کے بعد Recycle کرنے پر توجہ نہیں دی جاتی۔ کوڑا کرکٹ کو مناسب طریقے سے ٹھکانے نہیں لگایا جاتا۔

ایک مرتبہ واپڈا کے ساتھ مسئلہ بنا تھا تو میں نے

جیں۔ ڈاکٹر بھی اور دوسرے عملہ بھی ہے۔ ہم چاہ رہے ہیں کہ ہم یہیں اپنا کھر اور دفتر بھی بنائیں۔ اس گاؤں میں بچوں کے لیے قرآن پاک کی تعلیم کا انتظام کریں۔ بچیوں کے لیے کشیدہ کاری کا سکول کھولیں اور جو ڈکرائے جیسی صحت مند سرگرمیاں شروع کرنے کے لیے انٹرکٹنگ میاں لائیں۔

گفتگو یہاں تک پہنچی تو فیصلہ ہوا کہ پہلے فارم ہاؤس چلا جائے۔ جو کچھ کر رہے ہیں ذرا لگے ہاتھوں مشاہدہ بھی ہو جائے۔ ایک مشاہدہ کرنے گئے اور مشاہدات کی پوری دنیا دیکھ آئے جس میں کئی چیزیں پوشیدہ تھیں۔

ظفر سے ملاقات کے دوران میں یہی سوچتا رہا کہ ہمیں پرنس میں جن رول ماڈلز کی ضرورت ہوتی ہے، وہ ہمارے آس پاس ہی کہیں موجود ہوتے ہیں۔ ہم بے وجہ سات سمندر پار انہیں ڈھونڈتے اور سرائے اپنی عمر عزیز کے گتے ہی سال مضاعف کر بیٹھتے ہیں اور وہ کامیابی بھی نہیں پہنچ پاتے۔ جس کے خواب دیکھتے آنکھیں ملے لگتی ہیں اور تعبیر نظر نہیں آتی۔

مخبر میں فارم کا کاروبار اس لیے کرنا چاہتا ہوں کہ ہمیں اور دوسرے لوگوں کو معیاری اور خالص کھانا مل سکے۔ ہم نے برک نامی گاؤں کے طالب علموں کو گاؤں کی صفائی پر لگایا، درخت بھی لگوائے۔ پھر ہم نے ۳۲ پرائمری سکولوں کے درمیان کندی جگہ کو صاف کروایا تاکہ بچاریاں نہ پھیلیں۔ ہمارے گاؤں کے لوگ ہم سے بہت خوش

وینز کی تجدید کروانی پڑتی ہے۔ ہم جیسی خواتین کو یہاں Visa پر رہنا پڑتا ہے۔ گرین کارڈ جیسی سہولت میسر نہیں۔ اگر ہمارا یہ مسئلہ حل ہو جائے تو ہر سال ہم یہاں سکون کے ساتھ رہ سکتی ہیں۔ اس طرح ہمیں وینز کے ختم ہونے کا ڈر نہیں ہوگا۔

یوکرائن میں جو پاکستانی جا کر آباد ہوتے ہیں انہیں گرین کارڈ کی سہولت حاصل ہوتی ہے۔ ڈینٹس میں میری طرح یوکرائن کی کافی لڑکیاں بیاہی ہوئی ہیں۔ ہم اکثر شام کو ملتی اور باتیں کرتی ہیں۔

میری والدہ بھی ان دنوں پاکستانی آئی ہوئی ہیں۔ انہیں بھی یہ ملک اور یہاں کے لوگ اچھے لگتے ہیں۔ یہاں آکر میں نے واجبی اردو کے ساتھ ساتھ خوش رہنا سیکھ لیا ہے۔ یہاں زندگی پر سکون ہے۔ یوکرائن میں گھڑی کی سوہوں کے ساتھ ساتھ متحرک رہنا پڑتا ہے۔ یہاں آپ اس پابندی سے آزاد ہیں۔

ہم اپنی توانائی کی ضرورتوں کو پورا کریں گے۔ ٹیوب ویل کے گرم پانی سے ہم پورے گھر کا ٹیپرچر نارمل رکھیں گے اور اس پر خرچ بھی کچھ نہیں ہوگا۔

ہم صبح جلدی اٹھنے کے عادی ہیں۔ صبح میں بچوں کو سکول چھوڑنے کے بعد فارم پر چلی جاتی ہوں۔ وہاں تین چار گھنٹے گزرتے ہیں۔

میری خواہش ہے کہ لاہور کے لوگ صبح جلدی اٹھیں، دکانیں اور کاروبار بھی صبح جلدی مل جائیں تاکہ ہم جیسی خواتین صبح جلدی خریداری کر سکیں اور بعد میں آرام کے ساتھ بچوں کے لیے بچ بناسکیں۔

ہم لوگ ہر بجے شام کا کھانا کھا لیتے اور ۸ بجے سو جاتے ہیں۔ یہ صحت بخش معمول سب کو اپنانا چاہیے۔ میں بریانی، شامی کتاب جیسی ڈشیں بناتی ہوں۔ ہمارے یوکرائن میں کھانوں میں مرچیں کم ہوتی ہیں۔ یہاں کے کھانوں پر مرچوں کا اثر غالب رہتا ہے۔ سب سے بڑا مسئلہ جو ہمیں درپیش ہے کہ ہر سال

وقت اور طریقہ کار کی پابند

آسٹریلین گائیاں

ایک لڑکا مسلسل چارہ ترتیب سے رکھ رہا تھا۔ جونہی ۳ بجے ایک بٹن دبائے سے شیڈ کا ہائیڈرولک دروازہ اپنے آپ کھلا اور تمام گائیاں سکون سے چلتی ہوئی کچھ دور اس جگہ پر ترتیب سے کھڑی ہو گئیں جہاں ان کا دودھ دھویا جاتا تھا۔ یہ ایک ناقابل تصور اور ناقابل یقین منظر تھا اگر آنکھوں سے خود نہ دیکھا ہوتا تو بھی یقین نہیں آتا تھا۔ ایک ڈاکٹر نے ان کے تھنوں پر مشقی ہاتھ چڑھا دیے جنھوں نے فوری طور پر دودھ نکالنا شروع کر دیا۔ اس مشین کے اندر یہ نظام موجود ہے کہ ایک مرتبہ دودھ نکلتا اور ایک مرتبہ تھن کو سہلایا جاتا ہے۔ جس سے گائے کو بہت سکون اور تحفظ کا احساس ہوتا ہے۔ ہر گائے کی ۳، ۳ رمت میں ملکیت مکمل ہو گئی۔ ہر گائے کے ساتھ ایک چھوٹی سکرین والا مونیٹر لگا ہوا تھا جس پر دودھ کی مقدار اور وقت آ رہا تھا۔ یہی اندازہ و شمار فلٹر کے لیپ ٹاپ پر بھی جا رہے تھے۔ یہ ایک حیران کن منظر تھا۔ نہ کسی کا تھن کو ہاتھ لگا، نہ کسی نے دودھ کو چھوا۔ یہ ان چھوٹے دودھ اپنے آپ پائپوں سے چلر تک پہنچ گیا۔ جونہی ملکیت مکمل ہوئی دودھ دھونے والا آلہ اپنے آپ ایک خلا میں گر گیا۔ ڈاکٹر نے فوری طور پر تمام تھنوں کو ایک دوا لگائی اور بتایا کہ دودھ میں سب سے جلدی بیکٹیریا پیدا ہوتا ہے اور خدا کی قدرت یہ ہے کہ دودھ دینے کے بعد بھی گائے کا تھن آدھے گھنٹے تک کھلا رہتا ہے۔ جس کی وجہ سے اس میں بیکٹیریا پیدا ہونے کا خطرہ بہت بڑھ جاتا ہے۔ یہ دوائی فوری طور پر تھن کا منہ بند کر دیتی ہے جس سے ان کے تھن میں انٹیکشن یا بیکٹیریا پیدا ہونے کا امکان ختم ہو جاتا ہے۔ دودھ دوہنے کے بعد دیر بعد سارے پائپ پر پش اور پانی سے اپنے آپ دھل جاتے ہیں تاکہ اگلے وقت تک پائپوں میں پرانے دودھ کا موجود کوئی قطرہ دودھ کی کوالٹی خراب کرنے کا باعث نہ بن سکے۔



تصاویر: محمد عرشیان طبیب

شریک گفتگو: طبیب انجناز قریشی، عارف مرزا

ملاقات: اختر عباس

تاریخ اسلام

اسلامی زندگی کی کہکشاں

جن پر ہے

اُس کو ناز

ان عظیم القدر خلفائے مسلمین کا بے بدل تذکرہ
جنہوں نے تاریخِ اُف فی میں پہلی بار وضع جیانے پر
رفسادِ عامہ کے منصوبے شہرِ وح کیے
اور آنے والے حکمرانوں
کے لیے مشعلِ راہ بن گئے

امیر الدین مہر

www.Paksociety.com

مدینہ

منورہ میں ایک نابینا عورت
رہتی تھی جس کے گھر یلو کام
کان کرنے حضرت عمرؓ

آتے تھے۔ چند روز بعد
انھیں معلوم ہوا کہ ان سے پہلے کوئی اور شخص آکر عورت
کے تمام کام کر جاتا ہے۔ انھیں یہ معلوم کرنے کا اشتیاق
ہوا کہ یہ شخص کون ہے؟ ایک شب وہ چھپ کر بیٹھ رہے۔
یہ دیکھ کر ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہ شخص حضرت
ابوبکر صدیقؓ تھے جو غلط ہونے کے باوجود چھپ کر نابینا
عورت کے گھر آتے اور اس کے گھر یلو کام کر جاتے تھے۔

ابتداءً اسلام میں سب سے زیادہ شفقت و رحمت
والے سیدنا ابوبکر صدیقؓ ہی تھے۔ آپؓ ایک دیانت دار
تاجر اور کپڑوں کا کاروبار کرتے تھے، اس لیے جلد ہی
مال دار بن گئے۔ آپؓ شروع سے حلیم الطبع، نرم دل،
غریبوں اور مسکینوں کا خیال کرنے اور اللہ کی راہ میں خرچ
کرنے والے تھے۔ جب اسلام لائے تو ان کے پاس
چالیس ہزار درہم نقد تھے جو سارے اللہ کی راہ میں خرچ
کر دیے۔

غلاموں کی آزادی

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے مکہ مکرمہ میں ان غلاموں کو
خرید کر آزاد کیا جن پر کفار بے حقد علم اور جبر کیا کرتے تھے
تاکہ وہ دوبارہ کافر ہو جائیں۔ ان غلاموں میں حضرت
بائل بن رباح، عامر بن فہیرہ، ابوقحیفہؓ، حضرت لبنہؓ،
حضرت زبیرؓ، حضرت محمدؓ اور ام حبیبہؓ رضوان اللہ علیہم
شامل ہیں۔ سیرت نگار لکھتے ہیں کہ یہ نام ایسے غلاموں
کے ہیں جو مشہور تھے، ان کے علاوہ بھی انھوں نے
بے شمار غلام آزاد کیے۔

ابن دُغْنہ کی گواہی

آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کو حبش کی طرف ہجرت
کا حکم دیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ آنحضرت ﷺ کی جدائی
گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ چونکہ یہ ہجرت مصائب و شدائد
سے بچنے کے لیے نہیں بلکہ آزادی کے ساتھ عبادت الہی

کرنے اور دعوت و تبلیغ کی غرض سے تھی، اس بنا پر حضرت
ابوبکر صدیقؓ نے بھی حبشہ کی جانب ہجرت کا راہہ کر لیا۔
لیکن ابھی برک الغنا وجود نہ سے یمن کی جانب ہارون کی
مساقت پر ہے، پہنچتے تھے کہ قبیلہ قارہ کے سردار، ابن دُغْنہ
سے ملاقات ہو گئی۔ ابن دُغْنہ نے پوچھا "ابوبکر کہاں کا
راہو ہے؟"

حضرت صدیقؓ نے کہا "میری قوم نے مجھے کے
سے نکال دیا ہے، اس لیے چاہتا ہوں کہ سیاحت کروں اور
اپنے رب کی آزادی سے عبادت کروں۔"

ابن دُغْنہ ہوا "تم جیسے شخص کو کیسے شہر بدر کیا جاسکتا
ہے اور نہ تمھیں وہاں سے لگنا چاہیے۔ تم غریبوں کو مالی
اعداوہ دیتے اور صلہ رحمی کرتے ہو۔ اپنا بھوکا سہارا ہو اور
حق کی راہ میں آنے والے حوادث کا مقابلہ کرتے ہو۔ چلو
میں تمھیں اپنی پناہ میں لیے واپس لے لے چلتا ہوں۔
وہاں تم اپنے رب کی آزادی سے عبادت کرنا۔"

چنانچہ ابن دُغْنہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو اپنے ساتھ
لے لے آیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے اوصاف کا حوالہ
دے کر قریش سے کہا "غضب خدا کا تم ایسے شخص کو شہر
میں رہنے نہیں دیتے۔"

قریش نے کہا کہ اگر وہ چھپ کر عبادت کریں تو وہ
ان سے تعرض نہیں کریں گے۔ سو حضرت ابوبکر صدیقؓ کچھ
دن تک تو پوشیدہ عبادت کرتے رہے لیکن آخر ان سے ربا
نہ گیا اور گھر کے صحن میں مسجد بنائی۔ آپؓ نماز پڑھتے اور
قرآن مجید کی بلند آواز میں تلاوت کرتے، تو قریش کی
عورتیں، لڑکیاں اور چھوٹے لڑکے گرد جمع ہو جاتے اور اثر
لیتے۔ قریشیوں نے ابن دُغْنہ سے شکایت کی کہ ابوبکر
معاہدے کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ ان سے کہو کہ اگر
انھیں تمھاری پناہ میں رہنا ہے تو معاہدے کے مطابق
عبادت اور تلاوت چھپ کر کریں۔ اگر وہ رضامند نہ ہوں
تو تمھاری پناہ سے دست کش ہو جائیں۔ ابن دُغْنہ نے
حضرت ابوبکرؓ سے یہی بات کہی۔ آپؓ نے فرمایا:
"مجھے تمھاری پناہ کی ضرورت نہیں، اب میں اللہ کی

جنگی حالات میں رحمت و شفقت

حضرت ابو بکرؓ نے جہاں زمانہ امن اور عام حالات میں انفرادی و اجتماعی رحمت و شفقت کا مظاہرہ کیا، وہیں حالت جنگ میں بھی انسانی جانوں کے احترام، سلامتی اور حفاظت کی تاکید فرمائی۔ ایک لشکر روانہ کرتے وقت آپؓ نے فوجیوں کو اہم نصیحتیں کیں۔ ان میں سے چند کا تذکرہ درج ذیل ہے:

"اے لوگو! ذرا رکو، میں تم کو ۱۰ اوصیتیں کرنا چاہتا ہوں۔ انہیں اپنے دل میں جگہ دو۔ (۱) خیانت نہ کرنا (۲) دھوکے سے مال نہ کھانا (۳) اپنے امیر کی نافرمانی نہ کرنا (۴) کسی کا مثلہ (انسانی جان کی بے حرمتی) نہ کرنا (۵) کسی بچے، یوزرے یا عورت کو قتل نہ کرنا (۶) مجبور یا دوسرے پھل دار درخت نہ کاٹنا (۷) خدائی ضرورت کے سوا بکری، گائے یا اونٹ ذبح نہ کرنا (۸) تمہارا گزر ایسے لوگوں پر ہوگا جو دنیا چھوڑ کر عبادت گاہوں میں گوش نشین ہو گئے ہیں۔ وہ جس اللہ کی رضا کی خاطر خلوت میں بیٹھے ہیں، اس کی خاطر انہیں ہاتھ نہ لگانا (۹) تم کو ایسے لوگ بھی ملیں گے جو قسم قسم کے طعام تم کو پیش کریں گے، بار بار ایسے طعام کھا کر اللہ کو بھول نہ جانا (۱۰) تم کو ایسے لوگ بھی ملیں گے جن کے سر کے بال درمیان سے کٹے ہوئے ہوں گے اور درگرد چوئیاں چھوڑ رکھی ہوں گی، ایسے لوگوں کو تگواروں سے زار دینا لیکن قتل نہ کرنا۔ اب اللہ کا نام لے کر آگے بڑھو، اللہ تعالیٰ آپ کو نیزوں اور تگواروں سے محفوظ رکھے۔" (البدایہ النہایہ)

یہ نصیحتیں پڑھ کر آج کے جنگی قوانین اور ان کی عملی صورت و تکلیفیں تو معلوم ہوگا کہ وہ دور کتنا اعلیٰ و ارفع اور شہرہ تھا۔ اس کا آج تصور کرنا بھی مشکل ہے۔

بے سہارا لوگوں کی دیکھ بھال

حضرت ابو بکر صدیقؓ اگرچہ نہایت جمیل القدر خلیفہ تھے لیکن غریبوں اور ضرورت مند لوگوں کا معمولی کام کرنے میں بھی انہیں دریغ نہ تھا۔ وہ نہایت خاموشی سے ایسے کام کرنے میں مسرت محسوس کرتے تھے۔

غریب خاندانوں کی مالی امداد

حضرت ابو بکر صدیقؓ ایسے خاندانوں کی مدد کرتے تھے جو معاشی لحاظ سے غریب اور نادار ہوں۔ ان میں سے ایک حضرت مسطحؓ آپ کے خالہ زاد بھائی تھے۔ یہ ہجرت کر کے مدینہ منورہ آئے تو ان کے پاس کچھ نہ تھا۔ لہذا ابو بکر صدیقؓ نے ان کا ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ حضرت عائشہؓ پر انک کی الزام تراشی ہوئی تو وہ سادگی کی وجہ سے مخالفین میں شامل ہو گئے۔ حضرت ابو بکرؓ ان کے رویے سے بہت دکھ پہنچا اور ماہانہ وظیفہ بند کر دیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

ترجمہ: تم میں سے مالدار اور کشادگی رکھنے والے لوگ قسم نہ کھائیں کہ وہ غریبوں، مسکینوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو کچھ نہیں دیں گے بلکہ ان کو چاہیے کہ معاف کر دیں اور درگزر کریں۔ کیا تم پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمہارے گناہ معاف کر دے۔ اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ (۲۴:۳۳)

ابو بکرؓ نے جب یہ آیت سنی تو پکار اٹھے "ہاں میں چاہتا ہوں کہ اللہ مجھے معاف کر دے۔"

یہ کہہ کر آپؓ نے مسطحؓ کا وظیفہ دوبارہ جاری کر دیا۔

(تفسیر ابن کثیر)

بدر کے قیدیوں پر شفقت

ہجرت کے دوسرے سال مسلمانوں اور کفار مکہ کے درمیان معرکہ بدر برپا ہوا۔ اس میں مسلمانوں کو شاندار فتح ملی اور کفار بدری طرین شکست کھا گئے۔ اس میں تقریباً ۷۰ کفار قتل ہوئے اور اتنے ہی قیدی بنے۔ قیدیوں کے بارے نبی اکرمؐ نے صحابہ کرامؓ سے رائے طلب فرمائی۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے ازراہ شفقت و رحمت اپنی رائے دی "یا رسول اللہ! یہ آپ کے رشتہ دار اور عزیز و اقارب ہیں، لہذا انہیں فدیہ لے کر آزاد کر دیجیے۔" اس بارے میں مختلف آراء آنے کے بعد فدیہ لے کر انہیں آزاد کر دیا گیا جو حضرت ابو بکرؓ کی رائے کے مطابق تھا۔

حضرت عمرؓ اور رفاہ عامہ

اسلامی حکومت کی ابتدائی تاریخ میں جن صحابہ کرام نے خدمت خلق اور رفاہ عامہ کے انفرادی و اجتماعی کام کی بنیادیں رکھیں، ان میں حضرت عمرؓ کا نام سرفہرست ہے۔ آپؓ نے انفرادی طور پر خدمت خلق کا کام کرنے کے ساتھ ساتھ سرکاری سطح پر بھی رفاہ عامہ کے زبردست کارنامے انجام دیے۔ آپؓ کے انفرادی کاموں کی تفصیل کم ملتی ہے، تاہم نمونے کے طور پر کچھ واقعات درج ذیل ہیں۔

حضرت عمرؓ بن خطاب ۵۸۳ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلہ نسب نبی ﷺ سے عدی بن کعب پر ملتا ہے۔ آپؓ نسب دانی، شہسواری، سپہ گری، پہلوانی اور تقریر کے فن میں بہت مہارت رکھتے تھے۔ آپؓ نے تجارت کا پیشہ اختیار کیا۔ قریش کی سفارت کاری بھی کی۔ (التاریخ و مولانا غنوی)

غلاموں کو اہمیت دینا

اکثر غلاموں کو بلا کر آپؓ ساتھ کھانا کھلایا کرتے۔ حاضرین کو سنا کر کہتے، اللہ اب لوگوں پر لعنت کرے۔ جنہیں غلاموں کے ساتھ کھانے سے عار ہے۔ سرداران فوج کو لکھ بھیجا کہ تمہارا کوئی غلام کسی قوم کو امان دے تو وہ امان تمام مسلمانوں کی طرف سے بھیجی جائے گی اور فوج کو اس کا پابند ہونا ہوگا۔ (التاریخ و مولانا غنوی)

غلامی کا رواج کم کرنا

حضرت عمرؓ نے اگرچہ غلامی کو محدود (بالکل ختم) نہیں کیا لیکن اس میں شبہ نہیں کہ انھوں نے مختلف طریقوں سے یہ رواج کم کر دیا۔ جس قدر قائم رکھا، وہ بھی اس خوبی سے کہ وہ غلامی نہیں بلکہ برابری اور ہمسری رہ گئی۔ عرب میں تو انھوں نے سرے سے اس کا استیصال کر دیا۔ چنانچہ حکومت سنبھالتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ حضرت ابو بکرؓ کے زمانے میں جو عربی قبائل مرتد ہونے کے بعد لوٹری اور غلام بنائے گئے تھے، سب آزاد کر دیے۔ ساتھ یہ اصول قائم کر دیا کہ اہل عرب کسی کے غلام

میں خلافت پر جلوہ افروز ہونے سے پہلے آپؓ کی بعض لڑکیوں کی بکریوں کا دودھ دوہتے تھے۔ غلیفہ ہونے کے بعد ایک بھولی بھالی لڑکی کو فکر لاحق ہوئی کہ اب ہماری بکریوں کا دودھ کون دوے گا؟ حضرت ابو بکرؓ نے سنا تو فرمایا "اللہ کی قسم! میں اب بھی بکریوں دوہوں گا، خلافت مجھے خدمت خلق سے باز نہیں رکھ سکتی۔"

(ابن کثیر ص ۲۹۱، طبقات ابن سعد)

غربا کا خاص خیال رکھنا

حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں "جب ابا جان کے انتقال کا وقت قریب آیا تو مجھ سے پوچھا، رسول اللہ ﷺ کو کتنے کپڑوں میں کھنایا گیا تھا؟ میں نے کہا، ۳۰ کپڑوں میں۔ آپؓ اس وقت ۲۰ پرانے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ ان کی طرف اشارہ کر کے فرمایا "تو بس میرے یہ دونوں کپڑے کافی ہیں۔ ایک تیسرا کپڑا بازار سے خرید کر مجھ کو کفن دے دینا۔"

میں نے کہا "ابا جان! ہم تینوں کپڑے بازار سے خرید سکتے ہیں۔" ارشاد ہوا: "یہی! زندہ لوگ مردوں کی نسبت نئے کپڑوں کے زیادہ مستحق ہیں۔ کفن کے دونوں کپڑے تو لبو، پیپ اور خراب ہونے کے لیے ہیں۔" بحان اللہ! آخری لمحات میں بھی مسکینوں، حاجت مندوں اور غریبوں کا کتنا خیال تھا۔

صدیق اکبرؓ نے ۲۲ ہجری یعنی ۶۳۳ء بروز شنبہ (پیر) مغرب اور عشا کے درمیان وفات پائی اور نبی اکرم ﷺ کے ساتھ روزانہ الطہر میں دفن ہوئے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کا دور خلافت ۲ سال، ۲ ماہ اور چند دن پر مشتمل رہا۔ اس عرصے میں آپؓ کو ملک و ملت کے گہرے مسائل اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اگر آپؓ انھیں خدا داد بصیرت، دانش اور نبی ﷺ سے ملی ہوئی تعلیم و تربیت سے حل نہ کرتے تو اسلامی حکومت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو سکتا تھا۔ اس لیے آپؓ کو خدمت خلق کا زیادہ موقع نہیں مل سکا۔ پھر بھی اجتماعی اور انفرادی طور پر جو کچھ کیا، اس کی ایک جھلک مذکورہ بالا واقعات میں دیکھی جاسکتی ہے۔

نہیں ہو سکتے۔ ان کا یہ قول مقبول ہے

لَا يَسْتَرْقِ عَرَبِيٌّ (عربی کو غلام نہیں بنایا جاسکتا)
انھوں نے پھر حکم دیا کہ غلاموں کو قربی
عزیز و اقارب سے جدا نہ کیا جائے لہذا باپ بیٹا، ماں بیٹی
اور بیٹا اور سگے بھائی بہنیں ایک ساتھ فروخت ہونے
لگے۔ حضرت عمرؓ کا غلاموں کے ساتھ مساوات، احترام اور
عزت و برتاؤ کا نتیجہ تھا کہ غلاموں میں بڑے ائمہ حدیث،
فقیر اور عالم سامنے آئے۔

حضرت عمر بن العاصؓ نے جب مصر میں فسطاط شہر
آباد کیا تو سرکاری عمارتوں کے ساتھ ایک مکان خاص
حضرت عمرؓ کے لیے تعمیر کرایا۔ لیکن حضرت عمرؓ نے لکھ بھیجا
"یہ میرے کس کام کا ہے؟ اسے کسی اجتماعی کام میں لگایا
جائے۔" چنانچہ وہاں بازار آباد کرایا گیا۔ یہ ان کی اجتماعی
سوچ کی ایک جھلک ہے۔

حضرت عمرؓ کے دور خلافت کی امتیازی خصوصیات
میں رفاہ عامہ کے دو کام شامل ہیں جو آپؓ نے بڑے وسیع
پیمانے پر کرائے۔ وہ طویل عرصے تک لوگوں کو نفع دیتے
رہے۔ جیسی کام آنے والے خلفاء، سربراہان مملکت اور
بادشاہوں کے لیے نمونہ بنے۔ ان میں سے چند ایک کا
تذکرہ درج ہے:

(الف) نہر ابی موسیٰ: بصرہ میں مٹلے پانی کی سخت کمی
تھی۔ ۶ میل دور سے پانی لایا جاتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے
لوگوں کی شکایت پر حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو جلد سے نہر
کھود کر پانی لانے کا حکم دیا۔ چنانچہ جلد سے ۹ میل لمبی
نہر کھود کر بصرہ لائی گئی اور گھر گھر میٹھا پانی پہنچایا گیا۔

(ب) نہر معقل: یہ نہر بھی جلد سے کاٹ کر لائی
گئی۔ اس کی تیاری کا کام معقل بن یسار کے ذمے تھا،
اس لیے ان کے نام سے مشہور ہوئی۔

(ج) نہر سعد: یہ نہر انبار والوں کے مطالبے پر نکالی
گئی۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ (وفات ۵۵ھ) نے اپنی
گورنری کے زمانے میں حضرت عمرؓ کے حکم پر کھدوائی۔ ان
کے نام پر نہر سعد کے نام سے مشہور ہوئی۔

(د) نہر امیر المؤمنین (نہر سوز): مصر میں سب سے
بڑی مفید نہر جو حضرت عمرؓ کے خاص حکم سے بنی۔ یہ نہر
امیر المؤمنین کے نام سے مشہور ہوئی۔ اسی نہر کے ذریعے
دریائے نیل کو بحر قلزم سے ملایا گیا۔ یہ نہر ۶۹ میل لمبی تھی
اور ۶ ماہ میں تیار ہوئی۔ یہ تجارتی اور سواری کے جہازوں
کے استعمال میں رہی۔ اس سے مصر اور عرب کے لوگوں کو
بہت فائدہ ہوا، تجارت بڑھی اور خط کے دنوں میں اتنا ج
پہنچتا رہا۔

عمارتوں کی تعمیر

حضرت عمرؓ نے مملکت میں مختلف نوعیت کی عمارتیں
بنوائیں اور مساجد تعمیر کرائیں جن کی تعداد ۳ ہزار ہے۔
یوں تو ان عمارتوں میں فوجی چھاؤنیاں، دفاتر، دارالامارہ،
قید خانے وغیرہ شامل تھے مگر ان میں سے صرف ان کا
تذکرہ درج ذیل ہے جو رفاہ عامہ اور سماجی خدمات سے
متعلق تھیں۔

مہمان خانے

یہ اس لیے تعمیر ہوئے کہ بیرون شہر سے آنے والے
مہمان ان میں ٹھہریں گے۔ کوفہ میں جو مہمان خانہ بنا، اس کی
نسبت احمد بلاذری (وفات ۸۹۲ھ) نے لکھا "انھوں
(حضرت عمرؓ) نے حکم دیا کہ جو لوگ دور دراز علاقوں سے
آتے ہیں، ان کے قیام کے لیے مکان بنایا جائے۔"
(فتوح البلدان) مدینہ منورہ میں مہمان خانہ سے ابجری
میں تعمیر ہوا۔ ابن حبان نے کتاب الشہادہ میں اس کا تذکرہ
کیا ہے۔ یہ حکم میں رہے کہ سب سادگی کا زمانہ تھا، لہذا یہ
تمام عمارتیں چلی گئیں۔

سڑکوں اور پلوں کا انتظام

حضرت عمرؓ نے رفاہ عامہ کے لیے سڑکیں اور پل
بنانے کا خاص اہتمام کیا۔ یہ کام ۲۸ طریقوں سے کیا گیا۔
ایک بیت المال کے ذریعے، دوسرا مفتوحہ اقوام کی طرف
سے۔ ان قوموں سے باقاعدہ معاہدہ ہوتا کہ وہ سڑک، پل
وغیرہ اپنے خرچ سے بنوائیں گی۔ حضرت ابو عبیدہؓ نے
شام فتح کیا تو شرائط میں یہ کام بھی شامل تھا۔

مکہ سے مدینہ تک جوگیاں اور سرائیں

مکہ مکرمہ اگرچہ مدتوں سے قبل گاہ خالق تھا لیکن اس کے راستے ویران اور بے آب و گیاہ تھے۔ حضرت عمرؓ نے ارجحی میں جب مکہ مکرمہ گئے تو انھیں یہ ویرانی محسوس ہوئی۔ چنانچہ آپؓ نے ہر منزل پر چوکیاں، سرائیں اور چشمے تیار کرنے کا حکم صادر کیا۔ شاہ ولی اللہؒ نے ازالۃ الخفاء میں لکھا ہے:

”جس سال حضرت عمرؓ نے عمرے کی فرض سے مکہ مکرمہ کا سفر کیا تو وہاں پانی پر رحم دیا کہ وہ سفری منزلیں جو حرمین کے درمیان ہیں، ان میں سایہ و آرام کرنے کے لیے جگہ کا بندوبست کیا جائے۔ وہ کنوئیں جو مٹی سے اُٹ گئے ہیں، انھیں صاف کیا جائے اور جہاں پانی کے کنوئیں نہیں، وہاں کنوئیں کھودے جائیں تاکہ حجاج کو سفر میں سہولتیں حاصل ہوں۔“

آپؓ نے اکثر شہروں میں لشکر خانے تعمیر کرائے جہاں مسافروں کو بیت المال کی طرف سے کھانا ملتا تھا۔ مدینہ منورہ میں جو لشکر خانہ تھا، اکثر وہاں خود جا کر اپنے اہتمام سے کھانا کھلاتے۔

غریبوں اور مسکینوں کے لیے وظیفے

حضرت عمرؓ نے اہتمام کیا تھا کہ مسکینوں میں جس قدر اپنا بچ، بوڑھے اور مفلوج وغیرہ ہوں، ان کے لیے تنخواہیں بیت المال سے مقرر کر دی جائیں۔ چنانچہ ہزاروں شہریوں کو گھر بیٹھے خوراک ملنے لگی۔ یہ وظیفہ ان کی غذائی ضروریات کے لیے کافی تھا۔ اس پر ایک شخص نے کہا کہ کیا غلام کے لیے بھی؟ فرمایا: ”ہاں غلام کے لیے بھی۔“ غریباں اور مسکین کے لیے بلا تخصیص مذہب حکم تھا کہ بیت المال سے ان کے روزینے (وظیفے) مقرر کیے جائیں۔ انھوں نے بیت المال کے عامل کو لکھ کر بھیجا کہ خدا کے اس قول کو ”انما الصدقات للفقراء والمساکین“ میں فقراء سے مسلمان اور مسکین سے اہل کتاب مراد ہیں۔ گمنام بچوں کو مائیں شاہراہ پر ڈال جاتی تھیں۔ ان کے لیے ۱۸ ارجحی میں یہ انتظام کیا کہ جہاں اس قسم کا کوئی

لاوارث بچہ ملے، اس کے دو سو چارے اور دیگر مصارف کا انتظام بیت المال سے کیا جائے۔ چنانچہ ان مصارف کے لیے ۱۰۰ درہم سالانہ مقرر ہوئے۔ پھر سال بہ سال ان میں اضافہ ہو جاتا۔

قتیبہ کی پرورش کے لیے اگر ان کی جائیداد ہوتی، تو اس کی حفاظت کا نہایت اچھا اہتمام کرتے۔ اکثر تجارت کے ذریعے اسے ترقی دیتے۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے حکم بن ابی العاص سے کہا: ”میرے پاس قتیبہ کا جو مال جمع ہے وہ زکوٰۃ کا نکلنے کی وجہ سے ٹھٹھا جا رہا ہے۔ تم اس کو تجارت میں لگاؤ اور جو بیع ہو، واپس کر دو۔“ چنانچہ ۱۰ ہزار کی رقم حوالے کی جو بڑھتے بڑھتے لاکھ تک پہنچ گئی۔

قحط میں انتظام

۱۸ ارجحی میں جب عرب میں قحط پڑا تو حضرت عمرؓ خدمت خلق کے کاموں میں ہمہ تن مصروف رہے۔ اول بیت المال کا تمام نقد و غلہ صرف کیا۔ پھر صوبوں کے افسروں کا لکھا کہ ہر جگہ سے غلہ روانہ کیا جائے۔ چنانچہ حضرت ابو عبیدہؓ نے ۳۰ ہزار اونٹ غلے سے لدے بھیجے۔ حضرت عمرؓ بن العاص نے بحر قزقم کی راہ سے ۲۰ ہزار روانہ کیے۔ حضرت عمرؓ ان جہازوں کو ملاحظہ کرنے خود بندرگاہ و تشریف لے گئے جو مدینہ منورہ سے ۳۰ منزل پر واقع تھی۔ بندرگاہ میں ۲۰ بڑے بڑے مکان بنوائے اور زید بن ثابت کو حکم دیا کہ قحط زدوں کا نقشہ بنائیں۔

چنانچہ ماموں اور مقدار غلہ کا رجسٹر تیار ہوا۔ ہر شخص کو چیک (چوچہ) تقسیم کیا گیا جس کے مطابق اسے روزانہ غلہ ملتا۔ چیک پر حضرت عمرؓ کی مہر ثبت ہوتی۔ اس کے علاوہ ہر روز ۲۰ اونٹ خود اپنے اہتمام سے ذبح کراتے اور قحط زدوں کو کھانا پکوا کر کھلاتے۔ یہ واضح رہے کہ حضرت عمرؓ کو اگرچہ شہریوں کی پرورش اور پرداخت کا بہت خیال تھا لیکن ان کی قیاضی ایسی نہ تھی جس کے باعث کاہلی اور مفت خوری کو رواں نہاتا ہے۔

حضرت عمرؓ کی نکتہ سنجی

ایشیائی مسلمانین و امرا کی فیاضیوں کا ذکر عموماً بڑے

ایک بڑھیا کا حسن طلب

حضرت قیس بن سعد عہدہ معروف صحابی ہیں اور ایک زمانہ تک مصر کے گورنر رہے ہیں، موسیٰ بن مجہب کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک بڑھیا ان کے پاس آئی اور کہنے لگی: ”مجھے یہ شکایت ہے کہ میرے گھر میں کینڑے بکڑے بہت کم ہیں۔“

حضرت قیس نے فرمایا: ”کیا اچھا کنا یہ ہے، اس کا گھر روٹی، گوشت، مکی اور گجور سے بھر دو۔“

(انصار: کتب تراجم، اربعین مکتبہ ملی محمد علی خاں)

شان خلافت کے خلاف تھا لیکن آپ مار محسوس نہ کرتے۔ مثال کے طور پر ضرورت مندوں کے جو روزینے مقرر تھے، اکثر خود جا کر تقسیم کرتے۔ مدینہ سے کئی منزل کے فاصلے پر ۲۷ قصبہ قبیلہ خزاعہ کے لوگ آباد تھے۔ آپ ان دونوں مقامات پر خود تشریف لے جاتے۔ روزینہ داروں کا دفتر ہاتھ میں ہوتا۔ آپ کو کچھ کرچھوٹے بڑے سب لوگ گھروں سے نکل آتے۔ حضرت عمرؓ خود اپنے ہاتھ سے روزینے تقسیم کرتے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ دارالصدقہ میں جاتے، ایک ایک اونٹ کے پاس کھڑے ہو کر دانت گنتے اور ان کا حلیہ قلم بند فرماتے۔

طبری نے ابو حذیفہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ ان کا معمول تھا، مجاہدین کے گھر جاتے اور عورتوں سے کہتے کہ: ”پچھ پازار سے منگوانا ہو تو لا دوں؟“ وہ لونڈیاں ساتھ کر دیتیں۔ حضرت عمرؓ خود چیزیں خریدتے اور ان کے حوالے کرتے۔ میدان جنگ سے قاصد آتا اور لشکریوں کے خطوط لاتا تو خود ان کے گھر پہنچا آتے اور کہتے، فلاں تاریخ تک قاصد واپس جائے گا، جواب لکھوا رکھو تا کہ روانہ ہو جائے۔ کاغذ قلم اور دوات خود مہیا کر دیتے۔ جس گھر میں کوئی حرف شناس نہ ہوتا، خود چونکھتے کے پاس بیٹھتے اور گھر والے کو لکھواتے، لکھتے جاتے۔

حضرت عمرؓ نے انسانی فطرت، ضرورت اور خواہش کا

ذوق و شوق سے کیا جاتا ہے۔ لیکن لوگ یہ خیال نہیں کرتے کہ اس سے جہاں بادشاہ کی مدد ملتی ہے، دوسری قوم در پوزہ گر (پیکاری) ہو جاتی اور انعام و بخشش پر لو لگائے بیٹھے رہتی۔ یہی فیاضیاں انھیں جس نے ہماری قوم میں ایسے لاکھوں لوگ پیدا کر دیے جو ہاتھ پاؤں ہلانا نہیں چاہتے اور غرور و نیاز و غیرہ پر اوقات بسر کرتے ہیں۔

لیکن حضرت عمرؓ اس حقیقت سے بے خبر نہ تھے۔ چنانچہ وہ سخت کوشش کرتے کہ لوگوں میں کاہلی اور مفت خواری کا مادہ پیدا نہ ہونے پائے۔ انھوں نے جن لوگوں کی تنخواہیں اور خوراک مقرر تھی، وہ ایسے لوگ تھے جن سے کبھی خوبی خدمت کی توقع ہو سکتی تھی یا جنھوں نے پہلے کوئی نمایاں خدمت دی تھی اور اب وہ وضع اور بیماری کی وجہ سے خود کسب معاش نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ کسی اور قسم کی فیاضی روا نہیں رکھتے تھے۔ عامہ ماوردی نے الاحکام السلطانیہ میں لکھا ہے کہ مطلب کا فرض ہے کہ ایسے لوگوں کو جو کھانے کمانے کے قابل ہونے کے باوجود صدقہ اور خیرات لیتے ہوں، سمجھ و تدابیر کرے۔ اس کے بعد عامہ موصوف نے اس کی سند میں حضرت عمرؓ کے عمل سے استدلال کیا۔

آپ کا معمول تھا کہ جب کسی شخص کو ظاہر میں خوشحال دیکھتے تو دریافت فرماتے، یہ کوئی پیشہ بھی کرتا ہے؟ جب لوگ کہتے کہ نہیں، تو فرماتے، یہ شخص میری آنکھ سے گر گیا۔ ان کا مقولہ تھا: ”ذلیل پیشہ بھی لوگوں سے سوال کرنے کے یہ نسبت اچھا ہے۔“ علماء کو انھوں نے عالمیہ مخاطب کر کے کہا: ”مسلمانوں پر اپنا پارہ ڈالو۔“

(سیرۃ امین ابن الجوزی)

جڑیات پر توجہ

حضرت عمرؓ کی زندگی یہ عجیب بات عیاں کرتی ہے کہ اگرچہ انھیں ہمیشہ بڑے اہم امور سے سناجھ رہا، تاہم چھوٹے چھوٹے کام بھی وہ خود انجام دے لیتے۔ اس کے لیے ان کو وقت اور فرصت کی تنگی محسوس نہ ہوتی۔ ان میں ایسے کام بھی شامل ہوتے جن کا اختیار کرنا بظاہر

کرے، آج تک مجھے اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں ملا۔
حضرت عمرؓ نے کہا ”اٹنی دور کا حال عمر کو کیسے معلوم ہو سکتا ہے؟“
بولی ”اس کو رعایا کا حال معلوم نہیں تو خلافت کیوں کرتا ہے؟“

حضرت عمرؓ نے سن کر بے اختیار رو پڑے۔
کب تاریخ میں ایسے واقعات درج ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ رعایا کے آرام و آسائش اور خبر گیری میں انھیں کس قدر سرگرمی اور ہمدردی تھی۔



بچوں کے لیے روزینے

ایک مرتبہ ایک قافلہ مدینہ منورہ میں آیا اور شہر کے باہر اترا۔ اس کی خبر گیری اور حفاظت کے لیے خود تشریف لے گئے۔ پہرہ دیتے پھرتے تھے کہ ایک طرف سے رونے کی آواز آئی۔ ادھر متوجہ ہوئے۔ دیکھا، ایک شیر خوار بچہ ماں کی گود میں رو رہا تھا۔ ماں کو تاکید کی کہ بچہ پہلائے۔ تھوڑی دیر بعد پھر ادھر سے گزر رہا تو بچے کو دوبارہ روتا پایا۔ غیظ میں آکر فرمایا ”تو بڑی بے رحم ماں ہے۔“
اس نے کہا ”تم کو اصل حقیقت معلوم نہیں خواہ مخواہ مجھے دق کرتے ہو۔ بات یہ ہے کہ عمرؓ نے حکم دیا ہے، بچے جب تک ماں کا دودھ نہ چھوڑیں، بیت المال سے ان کا وظیفہ مقرر نہ کیا جائے۔ میں اس غرض سے اس کا دودھ چھڑاتی ہوں اور یہ اس وجہ سے روتا ہے۔“

حضرت عمرؓ نے سن کر فکینک ہو گئے اور اپنے آپ سے فرمایا ”ہائے عمر! تو نے کتنے بچوں کا خون کیا ہوگا؟“
انھوں نے پھر اسی وقت منادی کرا دی ”بچے جس دن سے پیدا ہوں، اسی تاریخ سے ان کے روزینے مقرر کر دیے جائیں۔“

بچوں کی بھوک کی فکر

حضرت عمرؓ کے غلام اسلم کا بیان ہے، ایک مرتبہ آپؐ رات کو گشت کرنے نکلے۔ مدینہ سے ۳۰ میل پر صرار نامی ایک مقام ہے۔ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ایک عورت کچھ پکا

لحاظ کرتے ہوئے فوجیوں، مجاہدوں اور سرکاری کاموں میں گھروں سے دور رہنے والوں کو ۳۰ ماہ بعد کھجنی دینے کا رواج شروع کیا تاکہ وہ اپنے گھر والوں کی خیر و عافیت معلوم کرنے اور ان کے ساتھ رہنے آسکیں۔

رعایا کی شکایتوں سے واقفیت

حضرت عمرؓ کی سب سے زیادہ توجہ اس بات پر مبذول رہتی تھی کہ رعایا کی ہر شکایت ان تک پہنچ جائے۔ یہ معمول بنا رکھا تھا کہ ہر نماز کے بعد صحن مسجد میں بیٹھ جاتے۔ جس کو ان سے جو کہنا مٹنا ہوتا، کہہ دیتا۔ کوئی نہ ہوتا تو تھوڑی دیر انتظار کر کے اٹھ جاتے۔

(کنز العمال جلد دوم ص ۲۳۰)

راتوں کو دورے کیا کرتے۔ سفر میں راہ چلتوں سے حالات پوچھتے۔ بیرونی اضلاع سے جو سرکاری قاصد آتے، ان سے ہر قسم کی پرسش خود کرتے۔
اضلاع سے ہر سال سفارتیں آتی تھیں، انھیں وفد کہتے تھے۔ یہ عرب کا قدیم دستور تھا لیکن حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں سفارتوں سے دو کام لیا جو آج کل جمہوری سلطنتوں میں رعایا کے نمائندے انجام دیتے ہیں۔ یعنی آپؐ وفد کے علاقے سے متعلق سوالات پوچھتے اور تمام ضروری معلومات لیتے۔

شام کا سفر اور رعایا کی خبر گیری

ان تمام باتوں پر بھی تسلی نہ ہوتی، فرماتے ”ممال رعایا کی پروا نہیں کرتے اور ہر شخص مجھ تک پہنچ نہیں سکتا۔“
اس بنا پر ایک بار ارادہ کیا کہ شام، جزیرہ، کوئٹہ اور بلوچ کا دورہ کریں اور ہر جگہ دو دو مہینے ٹھہریں لیکن موت نے فرصت نہ دی۔ تاہم آخری مرتبہ جب شام کا سفر کیا تو ایک ایک ضلع ٹھہر کر لوگوں کی شکایتیں سنیں اور وادی کی اس سفر میں ایک مہر تھاک واقعہ پیش آیا۔ دار الخلافہ واپس آ رہے تھے کہ راہ میں ایک خیمہ دیکھا۔ سواری سے اتر کر خیمہ کے قریب گئے تو ایک بوڑھی عورت نظر آئی۔ اس سے پوچھا ”عمر کا کچھ حال معلوم ہوا؟“
اس نے کہا ”ہاں شام سے روانہ ہو چکا لیکن اللہ اس کو غارت

آپ نے کیوں تکلیف کی، مجھ کو بلا لیا ہوتا؟ فرمایا ”ابھی معلوم ہوا ہے، شہر سے باہر ایک قافلہ اترتا ہے۔ لوگ تنگے ماندے ہوں گے۔ آؤ چل کر پہرہ دیں۔“ چنانچہ دونوں اصحاب گئے اور رات بھر پہرہ دیتے رہے۔

☆

قحط میں حالت

جس سال عرب میں قحط پڑا، حضرت عمرؓ کی عیوب حالت ہوئی۔ جب تک قطر رہا، گوشت، گھی، مچھلی فرض کوئی لذیذ چیز نہ کھائی۔ نہایت خضوع سے دعائیں مانگتے ”اے اللہ! محمد ﷺ کی امت کو میری شامت اعمال سے تباہ نہ کرنا۔“

آپؓ کے غلام اسلم کا بیان ہے، قحط کے زمانے میں حضرت عمرؓ کو جو فکر و تردد رہتا تھا، اس سے قیاس کیا جاتا کہ اگر قحط ختم نہ ہوا تو وہ اسی غم میں تباہ ہو جائیں گے۔

(کنز العمال جلد ۶، ص ۲۳۳)

معذوروں کی فکر

حضرت سعید بن ربیعؓ ایک صحابی تھے۔ ان کی آنکھیں جاتی رہیں۔ حضرت عمرؓ نے ان سے کہا، آپ جمعہ میں کیوں نہیں آتے؟ انھوں نے کہا، میرے پاس آدمی نہیں کہ مجھ کو راستہ بتائے! حضرت عمرؓ نے ایک آدمی مقرر کر دیا جو ہمیشہ ان کے ساتھ ساتھ رہتا تھا۔

(مسند الغابیہ ص ۲۷۲، ص ۲۷۳)

ایک مرتبہ لوگوں کو کھانا کھلا رہے تھے، ایک شخص کو دیکھا کہ بائیں ہاتھ سے کھانا ہا ہے۔ قریب جا کر کہا کہ داہنے ہاتھ سے کھاؤ۔ اس نے کہا کہ جبکہ موت میں میرا دایاں ہاتھ جاتا رہا۔ حضرت عمرؓ کو رقت ہوئی۔ اس کے برابر بیٹھ گئے، رونے لگے اور بولے، افسوس تم کو وضو کون کراتا ہوگا؟ سر کون دھوتا ہوگا؟ کپڑے کون دھوتا ہوگا؟ پھر ایک نوکر مقرر کر دیا اور اس کے لیے تمام ضروری چیزیں خود مہیا کر دیں۔ یہ اور اس قسم کے بہت سے واقعات حضرت عمرؓ کی انفرادی اور اجتماعی سماجی خدمات واضح کرتے ہیں۔



(انقرض باہر، ص ۱۰۲، اسامہ آزاد)

ری ہے اور دو تین بچے رو رہے ہیں۔ قریب جا کر حقیقت حال دریافت فرمائی۔ اس نے کہا کہ کئی وقت سے بچوں کو کھانا نہیں ملا۔ انھیں بہلانے کے لیے خالی ہانڈی میں پانی ڈال کر چڑھا دیا ہے۔ حضرت عمرؓ ای وقت اٹھے، مدینہ میں آکر بیت المال سے آنا، گوشت، گھی اور کھجوریں لیں اور اسلم سے کہا کہ میری پیٹھ پر رکھ دو۔ اسلم نے کہا کہ میں لیے بیٹھا ہوں، فرمایا ”لیکن قیامت کے روز میرا پارتم تو نہیں اٹھاؤ گے۔“

فرض سب چیزیں خود اٹھا کر لائے اور عورت کے آگے رکھ دیں۔ اس نے آنا گوندھا اور ہانڈی چڑھائی۔ حضرت عمرؓ خود چولہا چمکتے جاتے۔ کھانا تیار ہوا تو بچوں نے خوب سیر ہو کر کھایا اور اچھلنے کودنے لگے۔ حضرت عمرؓ بچوں کو دیکھتے اور خوش ہوتے۔ عورت نے کہا ”خدا تم کو جزائے خیر دے۔“ سچ یہ ہے کہ امیر المومنین ہونے کے قابل تم ہونے کا عمرؓ!

☆

اہلیہ کے ساتھ خدمت خلق

ایک مرتبہ رات کو گوشت کر رہے تھے کہ ایک بدو کو شہر سے باہر زمین پر بیٹھا دیکھا۔ پاس جا کر بیٹھے اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ دفعہ خیمے سے رونے کی آواز آئی۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ کون روتا ہے؟ اس نے کہا، میری بیوی دروازہ میں مبتلا ہے۔ حضرت عمرؓ گھر آئے اور اپنی اہلیہ، حضرت ام کلثومؓ کو ساتھ لیا۔ بدو سے اجازت لے کر انھیں خیمے میں بھیجا۔ تھوڑی دیر بعد بچہ پیدا ہوا۔ ام کلثومؓ نے حضرت عمرؓ کو پکارا کہ امیر المومنین، اپنے دوست کو مبارک باد دیجیے۔ امیر المومنین کا لفظ سن کر بدو چونک پڑا اور مؤدب ہو کر بیٹھا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا، ”کچھ خیال نہ کرو۔ کل میرے پاس آنا، اس بچہ کی تنخواہ مقرر کر دوں گا۔“

☆

رعایا کی حفاظت کا خیال

حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ کا بیان ہے، ایک مرتبہ حضرت عمرؓ رات کو میرے مکان پر آئے۔ میں نے کہا،



ترتیب ہی بشر کو انسان بناتی ہے

وہی شاہ

سکول میں اسے بتاؤ کہ قتل کر کے پاس ہونے سے
فیل ہو جانا زیادہ یا عزت ہے

اسے بتاؤ کہ اپنے خیالات پہ پختہ یقین رکھنے چاہیے
اسے سب کہتے بھی رہیں کہ وہ غلط ہیں

اسے سکھائو کہ شریفوں کے ساتھ شریف رہے
لیکن بہت محرموں کے ساتھ سختی سے پیش آئے

میرے بچے کو وہ طاقت عطا کرنے کی کوشش کرو
کہ جب ہر شخص بھیڑ چال کا شکار ہو رہا ہو تو وہ اس سے
ڈر رہے ہو

اسے بتاؤ کہ ہر شخص کی بات سنے لیکن یہ بھی بتاؤ کہ
جو بات سنے اسے سچ کی کوئی پرہیز نہ کرے اور جو اس میں سے
سچ اور درست ہو وہ رکھ لے

اسے بتاؤ کہ محنت سے کمایا ہوا ایک ڈالر
نا جائز طور پر حاصل کیے ہوئے لاکھوں ڈالر سے بہتر
ہوتا ہے

اسے دوستوں کے لیے قربانی دینا سکھائو
اگر تم بتا سکو تو اسے بتاؤ کہ

اداسی میں کیسے مسکرایا جاتا ہے
اسے بتاؤ کہ آنسوؤں میں کوئی شرم نہیں

اسے بتاؤ کہ مٹنی سوچ رکھنے والوں کو خاطر میں مت
لائے اور خوشنما اور محبت زیادہ دشمنان سے ہوشیار رہے

اسے سیکھنا ہوگا
میں جانتا ہوں
کہ ہر شخص کھرا نہیں ہوتا

لیکن اسے یہ بھی بتاؤ کہ ہر فنڈے کے مقابلے میں
ایک بیرو ہوا کرتا ہے

ہر خود غرض سیاستدان کے مقابلے میں ایک مفلس
راہنما بھی ہوا کرتا ہے

اسے بتاؤ کہ ہر دشمن کے مقابلے میں ایک دوست
بھی ہوا کرتا ہے

اسے حسد سے دور کر دو،
اگر تم بتا سکو
اسے خاموش قبیلوں کے

راز کے بارے میں بتاؤ
اس کو یہ جلد سیکھ لینا چاہیے کہ بد معاشرے کا مقابلہ کرنا

سب سے آسان کام ہوا کرتا ہے
اسے بتاؤ اگر تم بتا سکو تو

کتابوں کے سحر کے بارے میں
لیکن اسے اتنا وقت ضرور دینا کہ وہ آسمانوں پر

اڑنے والے پرندوں کے دائمی راز، شہد کی مکھیوں کے
سورج سے تعلق اور پہاڑوں سے چھوٹنے والے پتھروں پر

بھی غور کر سکے

کیا کیا صدے سہہ جاتا ہے پر چم چاند ستارے کا

کیسی شان سے لہراتا ہے پرچم چاند ستارے کا
جمجم جمجم کے لہلاتا ہے پرچم چاند ستارے کا
بریں کا پیہ جام ہوا ہے بی آئی اسے ناکام ہوا ہے
بکلی کا تو حال نہ پا کھو جب سے پلو رام ہوا ہے
کیا کیا صدے سہہ جاتا ہے پرچم چاند ستارے کا
کیسی شان سے لہراتا ہے پرچم چاند ستارے کا

پوری خاکے سینہ زوری مہنگائی نے کمر ہے توڑی
زور دلا رہے ہے آج کرشن ، بڑھتی جائے رشوت خوری
دیکھ دیکھ کر شرماتا ہے پرچم چاند ستارے کا
کیسی شان سے لہراتا ہے پرچم چاند ستارے کا

ران کرتے ہے غنہ گردی کوئی کسی کا رہا نہ زوری
سوئے پاکستان کی اہم نے دیو کیسی حالت گردی
پانچ ہی تارہ جاتا ہے پرچم چاند ستارے کا
کیسی شان سے لہراتا ہے پرچم چاند ستارے کا

آزادی جو ہمیں ملی ہے ، اس فحش کی قدر کریں
نظرت کی دیوار گرا دیں آپس میں نہ لڑیں مرین
ساری قوم کو سمجھاتا ہے پرچم چاند ستارے کا
کیسی شان سے لہراتا ہے پرچم چاند ستارے کا
یہ تو ہے ہم سب کی عزت ، دہن کے ماتھے کا جھومر
ہاتھوں کے یہ سر کا آہل ، بنی کا اہول ہے زہور
ہاں کی چادر کھاتا ہے پرچم چاند ستارے کا
کیسی شان سے لہراتا ہے پرچم چاند ستارے کا

پندرہویں صدی عہد الفلاح حالات ماضیہ پر بڑی
نوبہورت تصویریں کھینچے اور نیکے چمکے انداز میں
نصیحتیں لکھ کر چھوٹے ہیں۔ یوم فراداد پاکستان کے
موقع پر لکھے گئے اس کام میں انہوں نے ملک کے
موجودہ حالات کی اچھوتے انداز میں شادی کی ہے۔

اسے بتاؤ کہ اپنی جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کا
بہترین معاوضہ وصول کرے لیکن کبھی بھی اپنی روح اور
دل کو بیچنے کے لیے نہ لگائے
اسے بتاؤ کہ شور مچاتے ہوئے جھوم کی باتوں پر کان
نہ دھرے

اور اگر وہ سمجھتا ہے کہ وہ صحیح ہے تو اپنی جگہ پر قائم
رہے ، ڈنار ہے
اس سے شفقت سے پیش آؤ مگر پیار اور دلا رمت کرنا
کوئے۔ یاد رکھو کہ خام لوہے کی بھڑکتی ہوئی آگ سی
فلوڈ بنایا کرتی ہے
اس میں اتنا حوصلہ مجرد کہ وہ وقت پڑنے پر جلالت
میں فیصلہ کر سکے

اور خود میں اتنی ہمت بھی پیدا کرے کہ صبر کر سکے
اسے ہمیشہ سکھاؤ کہ خود پر انتہائی درجے کا اعتماد رکھے
کیونکہ یہی وہ انسانیت پر امتیاز ہے کا اعتماد رکھ سکے گا
یہ ایک مشکل کام ہے
لیکن دیکھتے ہیں کہ تم کیا کر سکتے ہو
میرا معصوم بیٹا بہت سی پیارا ہے
☆

اوپر درج کیا گیا خط تاریخ میں معروف امریکی صدر
ابراہم لنکن کے نام سے منسوب ہے میں نے انگریزی میں
لکھے گئے اس خط کا محاورہ ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے۔
کچھ لوگ اسے ابراہم لنکن کا خط تسلیم کرتے ہیں اور کچھ اس
کا اصل ساتھ اور سر کی دہائی میں بھارت میں تلاش کرتے
ہیں۔ ایک امریکی تاریخ دان راجر نارٹن جو لنکن پر ایک
جامع اور مستند ویب سائٹ بھی چلاتے ہیں، اس خط کے
بارے میں ان کا کہنا ہے "مجھ سے اس خط کے بارے میں
کئی بار پوچھا گیا خصوصاً بھارت کے لوگوں نے جہاں یہ
خط بہت بڑی تعداد میں پڑھا گیا۔ میرے پاس ابراہم
لنکن کے اوپر لکھی گئی دو سو اس سے زیادہ کتابیں موجود
ہیں جن میں ابراہم لنکن کا تقریباً تمام تحریری مواد بھی شامل
ہے۔ لیکن میں نے کبھی یہ خط اس میں نہیں دیکھا۔ یہ واقعی

ہے، اچھی تربیت نہیں۔ اچھی تربیت قوم کی مائیں، اساتذہ اور دانشور کیا کرتے ہیں۔

اگر صرف عقل کا ہی استعمال بشر کو اعلیٰ انسان بناتا ہو تو چنگیز خان، مسولینی، ہٹلر، ایڈم جیسی شخصیات کو کیا اعلیٰ انسان سمجھا جاسکتا ہے؟ یہ اشرف المخلوقات کے ماتھے پر کلک تو ہو سکتے ہیں، انسان ہوتے ہوئے بھی اشرف المخلوقات نہیں ہو سکتے۔

اعلیٰ انسان اور اعلیٰ اشرف المخلوقات وہی ہے جو عقل کا استعمال انسانی فلاح اور بھلائی کے لیے کرے چاہے وہ کوئی سیاستدان ہو یا سائنسدان اور عقل کا ایسا استعمال صرف اچھی تربیت کے ذریعے ہوا کرتا ہے کہ علم تو بڑے بڑے لوگوں کے پاس آیا مگر نہ اس سے کچھ کھینچا نہ کمایا۔ نتیجی تو کہنے والے کہہ گئے:

علموں بس کریں اویار

یہاں اشفاق احمد مرحوم بھی یاد آتے ہیں جو کہا کرتے تھے کہ اس ملک کو چنانچہ نقصان پڑھے لکھوں نے پہنچایا ہے ان پڑھوں نے نہیں پہنچایا، اور کسی حد تک اشفاق صاحب تحکیم ہی کہتے تھے۔

سو صرف عقل کا استعمال نہیں بلکہ عقل کا ایسا استعمال جس میں تربیت کا تزکا لگا ہو، وہی ایک اعلیٰ انسانی معاشرہ ترتیب دے سکتا ہے۔

خدا کی قسم اس خط کو ایک نہیں ہزاروں، ہزاروں نہیں لاکھوں بار پڑھنے کی اور خود پر اور اپنے بچوں پر لاگو کرنے کی ضرورت ہے۔ اس خط میں ہر مہم کا نوحہ اور المیہ بھی ہے اور اس سے بچ نکل آنے کی صورت بھی۔

کاش ہم، ہماری مائیں، ہمارے رہنما، ہمارے دانشور اور ہمارے اساتذہ ایسا معاشرہ تشکیل دے سکیں جس میں ہماری نسلوں کی تربیت ان خطوط پر ہو سکے جس کی نشاندہی اس خط میں کی گئی ہے مگر یہ بھی ہوگا جب ہم تعلیم کے ساتھ ساتھ من حیث القوم "تربیت" پر بھی توجہ دیں گے ورنہ جو کچھ اس خط میں ۶۳ سال سے چل رہا ہے، مزید ۶۳۰۰ سال تک ایسے ہی چلتا رہے گا۔

ایک چیز ان کر دینے والا شاندار خط ہے۔ لیکن مجھے نہیں لگتا کہ یہ واقعی ممکن نہ ہی لکھا ہوگا۔"

مگر اس وقت ہمارا موضوع اس خط کے مندرجات اور اس کی روح ہے اس کی تاریخ نہیں۔ یہ ماسٹر پیس آف لٹریچر ہے۔ حکیم سعید مرحوم اکثر کہا کرتے تھے کہ ہم بچوں کی تعلیم پر توجہ دیتے ہیں مگر ان کی تربیت پر نہیں۔

تعلیم کی بات ہے لیکن اگر ہماری قوم کی ماؤں نے ہمارے بچوں کی اچھی تربیت کی ہوتی تو معاشرے میں ایسے سیاستدان، بیوروکریٹ، جج، جرنیل، صنعت کار، جاگیردار، بزنس مین نہ پیدا ہوئے ہوتے جو ہمیں آج بھی خاک میں ملا کر ہمیں اور اس ملک کو باقاعدہ ناک سے لکیریں نکھار رہے ہیں۔

نپولین نے کہا تھا کہ تم مجھے اچھی مائیں دے دو میں تمہیں اچھی قوم دے دوں گا، تو وہ اسی لیے کہا تھا کہ نسلوں کی تربیت مائیں ہی کیا کرتی ہیں۔ ماں کے وجود کی بنیادی اہمیت بھی صرف بچہ جنمنے سے نہیں بلکہ اس کی تربیت کرنے سے زیادہ ہے۔

ڈاکٹر علی شریعتی کا کہنا ہے کہ قرآن میں جہاں جہاں بشر کا ذکر آیا ہے وہ اس کی حیاتیاتی شناخت کے طور پر آیا ہے۔ جیسے درخت، پھول، پرندے یا کوئی حیوان شیر، گدھا، گھوڑا مگر جب یہی بشر اپنی عقل کا استعمال کرتے ہوئے بہتر رویے اور اعلیٰ اقدار اپناتا ہے تو پھر انسان کے درجے پر فائز ہوتا ہے۔ علی شریعتی کا یہ کہنا ہے کہ جہاں جہاں بشر کی اعلیٰ اقدار کا ذکر ہوا ہے وہاں وہاں اسے اللہ تعالیٰ انسان کے طور پر مخاطب کرتا ہے۔

ہم ہمیشہ سنتے آئے ہیں کہ انسان اشرف المخلوقات اپنی عقل کی وجہ سے ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بات درست بھی ہے مگر اصل میں انسان اس عقل کے بہتر استعمال کی وجہ سے انسانیت کے اعلیٰ درجے پر فائز ہوتا ہے۔ عقل کے بہتر استعمال سے مراد اعلیٰ انسانی اقدار ہیں جو دوسرے انسانوں کے لیے فلاح اور بھلائی کا پیغام دیتی ہیں، اور عقل کا یہ استعمال انسان کو صرف تربیت سکھا سکتا



www.F
معلومات
سے آگے

امیر ملک کے نافوش پیسے

برطانوی بچے اتنے ناخوش کیوں ہیں

عاطف مرزا

www.fakirsociety.com

www.fakirsociety.com

اُردو ڈائجسٹ

کی ٹیم کا حصہ بنیے

ہمیں پاکستان کے مختلف شہروں میں اُردو ڈائجسٹ کی سیلز اور پروموشن کے لیے ایسے متحرک نوجوانوں کی ضرورت ہے۔
جو کم سے کم بی اے پاس ہوں۔
کمپیوٹر جانتے ہوں۔
اور سیلز و مارکیٹنگ کا تجربہ اور شوق رکھتے ہوں۔

آپ کے CV مورخہ 20 مارچ 2012 تک ہمیں مل جانے چاہئیں۔

- CV کے ساتھ ایک الگ صفحے پر یہ ضرور لکھیں کہ اپنے شہر اور علاقے میں اُردو ڈائجسٹ کی فروخت اور پروموشن کے لیے اپنے لیے کیا ٹارگٹ سوچتے ہیں۔
- اسے کیسے حاصل کریں گے۔
- اور کتنے عرصے میں اپنا ٹارگٹ مکمل کر پائیں گے۔
- اپنی مطلوبہ تنخواہ بھی لکھیں جس کا براہ راست تعلق آپ کی پرفارمنس اور طے کردہ ٹارگٹ سے ہو۔

شہروں کے نام

لاہور، اسلام آباد، مری، مظفر آباد، سیالکوٹ، گوجرانوالہ، فیصل آباد، سرگودھا، ملتان، بہاولپور، حیدر آباد، سکھر، کراچی، کوئٹہ، پشاور، سوات، گلگت

ڈائریکٹر مارکیٹنگ اُردو ڈائجسٹ 325/G-III، جوہر ٹاؤن، لاہور۔ 0300-8460093

CV اس ای میل پر بھیجیں marketing@urdu-digest.com

بچوں

کے عالمی ادارے، یونی سیف نے کچھ عرصہ قبل ترقی یافتہ ممالک میں سے برطانیہ کے

بچوں کو سب سے زیادہ ناخوش قرار دیا۔ اپنی ایک حالیہ رپورٹ میں اس ادارے نے اس صورت حال کی وجہ تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ رپورٹ کے مطابق برطانوی والدین بچوں کے ساتھ کم وقت گزارتے ہیں لیکن مادہ پرستی کے بڑھتے رہتوان کے تحت ان کی یہ کوشش ضرور ہوتی ہے کہ بچوں کو مہنگے کھلونے لے کر دیے جائیں۔ برطانوی لوگ اچھے والدین بننا چاہتے ہیں لیکن وہ وقت کی کمی کا شکوہ کرتے نظر آتے ہیں اور بغض اوقات وہ لاعلم بھی ہوتے ہیں کہ بچوں کی اچھی پرورش کیسے کی جائے۔

اس رپورٹ میں برطانیہ کا موازنہ سویڈن اور سپین کے ساتھ کیا گیا ہے۔ سویڈن اور سپین میں والدین بچوں کے ساتھ زیادہ وقت گزارتے ہیں اور بچوں کے لیے سرگرمیاں بھی زیادہ ہوتی ہیں۔ تحقیق میں یہ بات بھی سامنے آئی کہ سچے والدین اور دوستوں کے ساتھ وقت گزارنا پسند کرتے ہیں اور انھیں آؤٹ ڈور کھیلوں میں زیادہ مزہ آتا ہے۔ برطانوی والدین معاشی تنگ دود میں مصروف رہتے ہیں۔ گھروں میں تنگھے آتے ہیں یا دیگر گھریلو کاموں کے باعث بچوں کو مناسب وقت نہیں دے پاتے۔ عموماً بچوں کوئی وی اور کمپیوٹر گیمز کے حوالے کر کے تازہ ہوا سے محروم کر دیا جاتا ہے۔

سویڈن میں سرکاری پالیسیاں ایسی ہیں کہ والدین بچوں کے ساتھ مناسب وقت گزار سکیں۔ سپین میں ایک باپ کے کام کے اوقات طویل ہوتے ہیں لیکن دوسرے رشتے دار بچوں کی پرورش میں معاون بنتے ہیں۔ گھر میں موجود ماں بھی بچوں کو مناسب وقت اور توجہ دیتی ہے۔

برطانیہ میں معاشی مصروفیت کا وہاں اور بے مہار مادہ پرستی بچوں کی بہتر نگہداشت میں رکاوٹ بنتی ہے۔ برطانوی بچوں کو والدین کی توجہ کی ضرورت ہوتی ہے لیکن وہ زیادہ سے زیادہ دولت کمانے میں مصروف رہتے ہیں تاکہ بچوں کے لیے مہنگے کھلونے اور کپڑے خریدے جا سکیں۔ کم آمدنی والے خاندانوں کو زیادہ سخت محنت کرنا پڑتی ہے تاکہ بچوں کو منت سنے کھلونے لے کر دیے جائیں اور اپنا سٹیٹس برقرار رکھا جائے۔

برطانوی بچوں کی مصروفیت کے لیے سرگرمیاں بھی کم ہوتی ہیں۔ خصوصاً یہ صورت حال تعلیمی اداروں میں پائی جاتی ہے۔ سپین اور سویڈن میں سکول کے بچوں کے لیے تخلیقی سرگرمیاں زیادہ ہوتی ہیں۔

یونیسیف نے برطانیہ کو ترجیحات بدلنے کا مشورہ دیا ہے۔ اس کے لیے برطانیہ کو کم سے کم آمدنی کی سطح بہتر کرنے کی کوشش کرنا ہوگی تاکہ لوگوں کو خاندان کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے کا موقع مل سکے۔ مادی اشیاء کے حصول کے لیے ناختم ہونے والی دھڑکی حوصلہ شکنی کے لیے اشتہارات کے قوانین میں بھی تبدیلیاں لانا ہوں گی۔ اسی حوالے سے سویڈن میں یہ دلچسپ پیش رفت بھی ہوئی کہ اس ملک کے ۱۴ سال سے کم عمر بچوں کو چیزیں خریدنے پر آمادہ کرنے والے اشتہارات پر پابندی کا فیصلہ کر لیا گیا۔

برطانیہ میں سیاست دان بھی اس معاملے کی نگہنی کو سمجھ رہے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ بچوں کی بہتر نشوونما میں دولت سے زیادہ والدین کی توجہ اور وقت کی اہمیت ہوتی ہے اور مضبوط اور مستحکم خاندان ہی کامیاب معاشرے کی بنیاد بن سکتے ہیں۔

سچے والدین اور دوستوں کے ساتھ وقت گزارنا پسند کرتے ہیں

اور انھیں آؤٹ ڈور کھیلوں میں زیادہ مزہ آتا ہے

اُردو ڈائجسٹ کے لیے دنیا کے مختلف ممالک میں
مخلص، متحرک اور مؤثر

ڈسٹری بیوٹرز

درکار ہیں

اُردو ڈائجسٹ کو اپنی روز افزوں مقبولیت کے باعث دنیا بھر میں بسنے والے قارئین کے
اصرار اور مشورے پر درج ذیل ممالک میں مالی طور پر مضبوط ڈسٹری بیوٹرز کی ضرورت ہے:

- سعودی عرب
- امریکا
- کویت
- کینیڈا
- متحدہ عرب امارات
- آسٹریلیا
- قطر
- بحرین
- ناروے
- بھارت

آپ کتب و رسائل کی ڈسٹری بیوٹن سے متعلق ہوں، مالی طور پر مضبوط اور پاکستان کے مؤثر ترین
رسالے اُردو ڈائجسٹ کے ڈسٹری بیوٹن نیٹ ورک میں شامل ہونا چاہتے ہوں تو فوری طور پر رابطہ کریں۔

آپ کی ای میل جو آپ کے بارے میں تفصیلات اور معلومات کی حامل ہو، ہمیں
30 مارچ 2012 تک ضرور مل جانی چاہیے۔

عالمی
منظر نامہ

”اس پیئر؟“ ہیں کون

ایک فیصد اور ۹۹ فیصد کی اصطلاحات
کیسے مقبول ہو گئیں؟

”موٹی بلی“ کن لوگوں کو
کہا جا رہا ہے؟

وقار صوجی

کیا کچھ باتیں غریبوں
کے بھی سمجھنے والی ہیں؟



پچھلے

سال پوری دنیا میں امرا اور
طاقتور شخصیات کے خلاف
عوامی مظاہرے ہوئے۔

کے گھوکے کا مالک ہو یا ملٹی نیشنل کمپنی سنبھال ہو۔
۲۰۱۱ء کے موسم گرما میں برطانوی نوجوان نسل نے
لندن اور برطانیہ کے دیگر شہروں میں ہنگامہ مچایا اور کئی
وکا میں لوٹ لیں۔ جب پولیس نے ۲۰ لیرے گرفتار کیے،
تو انھوں نے بتایا ”ہم امیروں کو دکھانا چاہتے ہیں کہ ہم
جو چاہیں کر سکتے ہیں۔“ لیکن نوجوانوں نے ہر اس شخص کو
امیر قرار دیا جو دکان کا مالک ہو۔

بہر حال یہ حقیقت ہے کہ دنیا بھر میں آمدنی کی تقسیم
میں عدم مساوات نے امیر کو خفیہ معنی دے ڈالے ہیں۔
یہی وجہ ہے کہ ۲۰۰۸ء میں امریکی صدارتی امیدوار،
جان میکین نے خود کو امیر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا،
حالانکہ وہ کئی عالی شان گھروں کا مالک ہے۔

دوسری طرف دنیا میں امرا کی تعداد بھی روز بروز
بڑھ رہی ہے۔ صرف ایک ڈیڑھ سو سال پہلے ہر ملک میں
امیر خال خال ملتے تھے۔ یہ امیر عموماً حکمران طبقے سے
تعلق رکھتے اور تواب، جاگیر دار یا سردار ہوتے۔ جب وہ
چل بٹتے، تو ان کی اولاد وراثت میں ملتی جا سکتی تھی۔
امیر بن بیٹھتی۔ پاکستان میں صرف ۵۰ سال قبل
”لکھ پتی“ بڑی شے سمجھا جاتا تھا۔ لیکن آج پاکستانی
شہروں میں ہزار لکھ پتی ملتے ہیں۔

امریکا کا رسالہ فوربس ہر سال دنیا کی امیر ترین
شخصیات کی فہرست چھاپتا ہے۔ فہرست میں صرف
سرمایہ دار، کاروباری اور صنعت کار شامل ہوتے ہیں۔ اگر
ان میں حکمران (بادشاہوں وغیرہ)، سرکاری افسروں اور
جاگیرداروں کو بھی ملا لیا جائے تو دنیا میں کم از کم ۳۰ ہزار
کھرب / ارب کی ضرورت ہو جاتی ہے۔

امارت کا ایک اور نمایاں پہلو یہ ہے کہ صدی قبل
صرف حکمران طبقہ ہی امیر تھا۔ لیکن آج ہزار ہا کاروباری،
صنعت کار اور سرمایہ کار امیر بن چکے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام
انگریزی لغات میں لفظ امیر کے معنی بھی بدل گئے ہیں۔

آکسفورڈ انگریزی لغت میں ”ریچ“ (Rich) یعنی
امیر دیکھا جائے، تو شریف، طاقتور، عظیم جیسے الفاظ

بیٹھا سبھی امرا ان کا نشانہ نہیں تھے کیونکہ اس گروہ میں مل
تکس، وارن ہفٹ اور کئی دوسرے کھرب و ارب پتی
شامل ہیں جو غریبوں کی فلاح و بہبود پر سالانہ اربوں
روپے خرچ کرتے ہیں لیکن عوامی مظاہروں نے سبھی
امیروں کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے لفظ ”امیر“ کو نئے معنی
عطا کر دیے۔ یہی نہیں، مظاہرین نے ”بینکار“ کی تشریح
بھی بدل ڈالی اور لغت میں ۴۳ نئے الفاظ ”ار فیصد“ اور
”۹۹ فیصد“ کا اضافہ کیا۔

دنیا کے ”امیر“

معروف معنوں میں جس کے پاس کثیر رقم ہو، وہ
امیر کہلاتا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس لفظ کی کوئی معین
تشریح نہیں۔ کیونکہ رشوت لینے، ڈاک ڈالنے اور ناجائز
 طریقوں سے دولت کمانے والا بھی امیر کہلاتا ہے اور وہ
کاروباری یا صنعت کار بھی جو حلال طریقوں اور محنت سے
دولت کمائے۔ بعض ماہرین کے خیال میں امیر وہ ہے
جس کے پاس ”ضرورت سے زیادہ“ رقم ہو۔ لیکن پھر
ضرورتوں کی تشریح میں بڑا اختلاف ہے۔

امریکا، برطانیہ اور یورپ میں امارت کا ایک پیمانہ یہ
ہے کہ جو شخص زیادہ تکس ادا کرے، یعنی سالانہ چار پانچ
کروڑ روپے تک، وہ امرا کے زمرے میں شمار ہوتا ہے۔
ایک اور پیمانہ ”آدن“ ہے۔ برطانیہ میں لوگوں کی
اکثریت کا خیال ہے کہ اگر وہ سالانہ ۲ کروڑ روپے کما
لیں، تو خود کو امیر سمجھیں گے۔

پاکستان میں جو شخص کار رکھے، بڑے گھر میں رہے،
بیش قیمت کپڑے پہنے اور قیمتی اشیاء استعمال کرے، وہ
امیر سمجھا جاتا ہے۔ چاہے اس نے دولت کسی بھی طریقے
سے کمائی ہو۔ جبکہ پوری دنیا میں کسی آدمی کا کاروباری یا
صنعت کار ہونا بھی امارت کی نشانی ہے، چاہے وہ پان

چار علم

حاکم نے کہا: "میں نے ہر مہم اختیار کیے اور دنیا کے تمام ممالکوں سے چھوٹے کیا۔"

کسی نے پوچھا: "وہ مہم کون سے ہیں؟"

حاکم نے جواب دیا: "پہلے یہ کہ میں نے کبھی لیا ہے کہ بڑی رزق میری قسمت میں لکھا ہے وہ نہ زیادہ ہوتا ہے نہ کم، اس لیے میں زیادہ کی طلب سے مطمئن ہو گیا۔ دوسرا یہ کہ اللہ کا اجر مجھے ہر لمحے سے، وہ جو میرے ہر لمحے کو دلدادہ نہیں کر سکتا اس لیے میں مشکوٰۃ ہو گیا۔ تیسرا یہ کہ ایک شخص مجھے امداد دیتی ہے وہ بے موت، میں اس سے بھاگ نہیں سکتا اور اس کے ساتھ مجھ کو گریہ کرنا پڑتا ہے۔ چوتھا یہ کہ میرا اللہ ایک سے بڑھ کر ہے اور ہر جگہ سے ہر جگہ سے اس سے شرمزدگی اور بے کلاموں سے ہاتھ اٹھایا۔"

لغات کا بھی حصہ بن جائیں گے۔

لیکن لفظ امیر کے مانند درج بالا دونوں الفاظ کی تشریح بھی واضح نہیں۔ بڑی خامی یا خرابی یہی ہے کہ ضروری نہیں، ارفیصد میں شامل تمام دولت مند ہوں تاکہ، لاپٹی، پیسے کے پجاری وغیرہ ہوں جیسا کہ عموماً سمجھا جاتا ہے۔ پھر خصوصاً ترقی یافتہ ممالک میں متوسط طبقہ بڑا خوشحال ہے۔ ترقی پذیر ملکوں کے متوسط طبقے کے سامنے تو اسے امیری سمجھا جائے گا۔

ترقی یافتہ ممالک میں دراصل متوسط طبقہ اس بات پر امرایہ ناراض ہے کہ پچھلے ۱۰ سال میں ارفیصد میں شامل ہر شخص... سرمایہ دار، کھلاڑی، نجی و سرکاری ملازم، کاروباری، صنعت کار، اداکار وغیرہ کی آمدن میں زبردست اضافہ ہوا ہے۔ مثلاً ۲۰۰۱ء میں برطانیہ کا مشہور فٹ بال کلب، مانچسٹر یونائیٹڈ اپنے ایک کھلاڑی کو سالانہ ساڑھے ۳ لاکھ پونڈ ادا کرتا تھا۔ اب یہ رقم ۱۰ لاکھ تک آچکی ہے۔ اسی طرح امریکہ میں ۲۰۰۱ء میں ایک اچھے بیئر سٹری آمدن ۴ لاکھ ڈالر تھی، وہ اب ۸ لاکھ ڈالر کماتا ہے۔ غرض یہ حقیقت ہے کہ ارفیصد طبقے کی آمدن پچھلے ایک عشرے میں ہوش رہا طور پر بڑھی ہے۔

لیکن یہ بات قابل ذکر ہے کہ کاروبار ایسی شے ہے جو کامیاب ہونے پر سرمایہ بہت تیزی سے دگنا بلکہ چوگنا

سامنے آتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے ۳۰۰ سال پرانے ان اینگلو سکس معنی کا اطلاق اب لفظ امیر پر نہیں ہوتا۔ تاہم آگے درج معنی تعریف پر کچھ پورے اترتے ہیں: بہت زیادہ دولت رکھنا یا جائیداد رکھنا، یا اثر اور پیسے والا۔

ماہرین کی رو سے دنیا بھر میں غریب اور متوسط طبقہ امرا کے خلاف اس لیے اٹھ کھڑا ہوا کیونکہ وہ اب اپنی ضرورتیں یہ آسانی پوری نہیں کر پا رہے۔ چنانچہ جب تک غریبوں کو ترقی کرنے اور خوشحال ہونے کے مواقع حاصل رہیں، غریب امیر کی تقسیم نمایاں نہیں ہوتی۔

ارفیصد اور ۹۹ فیصد

ماہ ستمبر میں جب نیویارک میں وال اسٹریٹ قبضہ تحریک کا آغاز ہوا، تو وہ دیکھتے ہی دیکھتے پوری دنیا میں مقبول ہو گئی۔ اس تحریک سے وابستہ خصوصاً ۲ اصطلاحیں "ارفیصد" اور "۹۹ فیصد" بچوں کی زبان پر بھی چڑھ گئیں۔

۹۹ فیصد سے مراد دنیا کا غریب اور متوسط طبقہ ہے اور مظاہرین کے نزدیک ارفیصد امیر طبقہ ان کا استحصال کر رہا ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا، سارے امیر طبقے کو دنیا میں پائی جانے والی نا انصافی، غربت، جہالت وغیرہ کا مرکب نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ تاہم کئی تحقیقی اطلاعات سے یہ حقیقت بھی سامنے آئی کہ تقریباً ہر ملک میں دولت کا بیشتر حصہ صحیحی بھر لوگوں یعنی امرا کے پاس جمع ہے۔ مثال کے طور پر امریکا کے انتہائی امیر ارفیصد کل امریکی سرمائے میں سے ۲۵ فیصد کے مالک ہیں۔

برطانیہ کا ایک ادارہ، گلوبل لینگویج مانیٹر ان انگریزی الفاظ کی فہرست جاری کرتا ہے جو ایک سال میں سب سے زیادہ شہرت پائیں۔ ادارے کی تازہ فہرست میں "آکوپائے" (Occupy) یعنی قبضہ سال ۲۰۱۱ء میں اخبارات اور انٹرنیٹ میں مقبول ترین لفظ رہا۔ نیز "ارفیصد" اور "۹۹ فیصد" بھی پہلے ۱۰ مقبول ترین الفاظ میں شامل رہے۔ امیدہ واثق ہے کہ یہ دونوں لفظ انگریزی

تھے یہ اصطلاح بولی تھی، تو ان کا مذاق اڑایا گیا لیکن اب امریکہ اور برطانیہ کی بیشتر لغات میں یہ لفظ بالا بیان کردہ معنی کے ساتھ موجود ہے۔ چونکہ پوری دنیا میں متوسط طبقہ ہی سب سے زیادہ مہنگائی سے متاثر ہوا، لہذا یہ اصطلاح بہت جلد جڑ پکڑ گئی۔

فیٹ کیٹ

یہ اصطلاح امریکی و برطانوی کارٹونسٹ (مزاحیہ خاکہ نگار) کو مرغوب ہے۔ وہ اپنے کارٹونوں میں موٹی تازہ "فیٹ کیٹ" (Fat Cat) یعنی موٹی بلی دکھاتے ہیں جو سکار پی رہی ہوتی ہے۔ یہ اصطلاح دراصل ان لوگوں کے لیے مستعمل ہے جو دوسروں کا استحصال کر کے مال بنائیں اور عیش کریں۔

۲۰۰۹ء میں امریکی صدر اوباما نے ان بینکاروں کو موٹی بلی کہا جو خود کو ہماری بھرم بکس سے نوازتے ہیں۔ جب یہ اصطلاح صرف فنی شعبے کے لیے مخصوص تھی، مگر اب بدعنوان سرکاری افسروں کو بھی موٹی بلی کہا جانے لگا ہے۔

امارت عام لوگوں کی نظر میں

یہ بحث بہت پرانی ہے کہ کیا دولت انسان کو خوشیاں بخش سکتی ہے؟ ایک عام نظریہ یہ ہے کہ اگر آپ کے سر پر چھت ہے، وافر غذا و متیاب اور محبت کرنے والا خاندان موجود ہے، تو آپ امیر ہوئے، چاہے زیادہ دولت نہ رکھتے ہوں۔ دولت بس اتنی ہونی چاہیے کہ آپ آرام و سکون سے اپنے اخراجات ادا کر سکیں۔ اس سے زیادہ دولت پھر لالچ اور ہوس پیدا کرنے کا باعث بنتی ہے۔

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ بہت سی اشیاء کی طرح دولت بڑا ذات خود کوئی خوبی یا خرابی نہیں رکھتی، بلکہ اس کا استعمال اسے اچھا یا برا بناتا ہے۔ چنانچہ جو دولت مند بڑا چڑھ کر فلاح و بہبود کی سرگرمیوں پر رقم خرچ کرے، وہ معاشرتی ہیرو اور من چاہی شخصیت کہلائے گا اور جو اپنی دولت پر سانپ بن کر بیٹھ جائے، اسے سبھی لوگ نفرت کی نگاہ سے ہی دیکھیں گے۔

کر دیتا ہے۔ لہذا کوئی کاروباری محنت، دیانت اور جائز طریقوں کے بل بوتے پر اپنا کاروبار اور سرمایہ انتہائی رفعتوں تک لے جائے، تو یقیناً اس کی ترقی و کامیابی کو حسد یا نفرت نہیں رشک کی نگاہ سے دیکھا جاتا چاہیے۔ ماہرین بھی کہتے ہیں کہ متوسط و غریب طبقوں کو یہ بات سمجھی چاہیے۔

بینکار

وال اسٹریٹ قبضہ تحریک کے مظاہروں میں لوگوں نے سب سے زیادہ بینکاروں کو ہی تنقید اور نفرت کا نشانہ بنایا۔ وجہ یہ ہے کہ خصوصاً ترقی یافتہ ممالک میں بینکار وہ شخص ہے جو اس وقت بھی ڈالر کماتا ہے جب معاشی بحران جاری ہو۔ بلکہ جب بینکاروں کا منافع بڑھ جاتا ہے کیونکہ دیوالیہ ہوتے فنی و سرکاری اداروں کو بینکوں کی مدد درکار ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ پچھلے ۳ برس میں مغربی ذرائع ابلاغ میں بینکار کے ساتھ جو ۲۰۰۲ء فعلی سب سے زیادہ استعمال ہوئے، وہ "ڈس گریس" (Disgrace) یعنی بدنام و رسوا اور "شیم" (Shame) یعنی شرمندگی ہیں۔ اسی طرح مغربی اخبارات و انٹرنیٹ میں لفظ بینکار کے ساتھ جو صفت سب سے زیادہ استعمال ہوئی، وہ "گریڈی" (Greedy) یعنی لالچی ہے۔

درج بالا ۳ مقبول اصطلاحوں کے علاوہ طبقہ امرا کے خلاف حالیہ عوامی مظاہروں نے ۴ اور انگریزی الفاظ کو بھی مشہور کر دیا۔ یہ "سکوئیزڈ مل" اور "فیٹ کیٹ" ہیں۔

سکوئیزڈ مل

برطانیہ کے سابق وزیر خارجہ، ایڈلی بینڈ نے سب سے پہلے "سکوئیزڈ مل" (Squeezed Middle) کی اصطلاح استعمال کی۔ اس سے مراد سخت محنت کرنے والا وہ متوسط طبقہ ہے جس کی اوسط آمدن مہنگائی، تنخواہ منجمد ہونے اور اخراجات بڑھنے کی وجہ سے مسلسل کم ہو رہی ہے، لہذا اس کا معیار زندگی بھی زوال پذیر ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک سال قبل جب ملی بینڈ



رنگ

اُردو ڈائجسٹ کا
ایک مقبول سلسلہ
سات رنگ
سات تحریریں



گوشہ سات رنگ

خوبصورتی سے لکھی گئی تحریروں پر جنمیں
مشاہدے کی گہرائی نے
اور بھی خوبصورت بنا دیا ہے

”کوڑے کواریا بند کرنا“ سستا بھی نہ ہے،
دیکھ کسی کی نے ہے اُن انسان کی دیکھنے
کتاب آپ بھی کو اداوں میں شامل ہو رہے ہیں

نویسہ احمد

www.Paksociety.com

اہرام مصر سے وقت بھی ڈرتا ہے

ہیت کم نہیں ہوئی۔ چند لمحوں کے لیے میں نے بھونچکی سی ہو کر سارا منظر دیکھا اور اپنے آپ سے کہا ”تو یہ ہے اہرام“۔ اخبارات اور رسائل میں شائع ہونے والی تصویروں نے تصورات کا ایک جہاں یادداشتوں میں آباد کر رکھا تھا۔ اسی لیے گنگ کھڑی اسے دیکھتی رہی۔

یہ اہرام دراصل عظیم الشان مقبرے ہیں۔ مصری تمدن کو جب فروغ حاصل ہوا تب قبروں کی شکلیں بدل گئیں۔ آغاز میں قبریں چبوتروں کی صورت میں تھیں، مختلف قد و قامت کی۔ کسی کی اونچائی ۱۰ اسی سے ۱۳ میٹر اور لمبائی ۵۰ میٹر اور کسی کی ۳ اور ۸ میٹر۔ یہ چبوترے ہی حقیقت میں مصر کے شہرہ آفاق اہراموں کے مائی باپ ہیں۔ زوسر (تیسرے خاندان کا فرعون) کو چبوترے پر مبنی

مارج کی روشن صبح تھی۔ ٹیکسی جمعیۃ الاقابرہ سڑک پر بھاگی جاتی تھی۔ غزہ ہماری منزل تھی جو کبھی فرعون مصر کا شاہی قبرستان تھا۔ پرانی پرچی اور نئی کہانیاں گردش میں تھیں۔ عجیب سا تجرّے آنکھوں کے زاویوں میں منعکس تھا۔ گاڑی غزہ کے علاقے میں داخل ہوئی۔ ڈرائیور نے بتایا، یہ علاقہ ٹائٹ گلیوں کے لیے بہت شہرت رکھتا ہے۔ وہاں عمارت خوبصورت تھیں اور عام سی بھی۔

مصریوں کا کہنا ہے، وقت سے ہر چیز ڈرتی ہے لیکن اہرام مصر سے وقت بھی ڈرتا ہے۔ دنیا اگر عجائبات کے اعتبار سے دو تین کی گنتی میں آئے جب بھی یہ اہرام سر فہرست ہوں گے۔ ہم پھر صحرا میں پہنچے۔ گو آبادی کا پھیلاؤ اب اس کے لبوں تک پہنچا ہوا ہے پھر بھی اس کی



میرے خدا! کیا زندگی اور آسمانی آفات نے انہیں نشانہ بنایا ہوگا؟ یہ کتنے مومنوں کے تلخ و شیریں سرور گرم چشیدہ ہیں اور ابھی بھی اسی حکمت سے کھڑے ہیں۔ سب سے چھوٹا ہرم خوفو (Cheops) کے پوتے میسرینس (Micerinus) اور درمیان اس کے بیٹے سیلرن (Chephern) کا ہے۔

میں نے ان اہرام کو دیکھتے ہوئے سوچا، یہ ہرم ریٹلی زمین پر کھڑے ہیں، زمین پر کوئی ایسی علامت نہیں کہ جس سے یہ سمجھا جائے، یہ ختم ہیں، بس جیسے کسی غیر مرئی طاقت نے انہیں جادو کے زور سے یہاں کھڑا کر دیا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ انہیں نیچے بنانے میں لاکھوں محنت کشوں کا ہاتھ ہے۔ ان سے بیکار لی گئی۔ ہر ماہ ایک لاکھ آدمی یہ بیکار کرتے۔ پتھر ڈھونڈنے والی سڑک کی تعمیر میں ۱۰ سال لگے۔ ہائیں ہمہ جہتی ہوا، کل کے وقت اور پیسے کے بے مہاب خرچ نے آج کا ایک قیمتی اثاثہ دنیا کے سامنے اکھڑا کیا جو دھیروں دھیر کمائی کا ذریعہ بنا ہوا ہے۔

دھننا نیلین انکھوں کے سامنے آگیا۔ سوچتی رہی نیلین نے تنہا خوف کے ہرم میں رات کیا تجربہ حاصل کرنے کے لیے گزارا تھی۔ کاش وہ اپنے احساسات بیان کرتا۔ اس کے ساتھی ماہرین نے قح مصر پر اسے بتایا تھا کہ غزہ کے ان اہراموں میں جو پتھر استعمال ہوئے ہیں، ان سے پورے فرانس کے گرد ۱۰ ارفٹ اونچی اور ایک فٹ چوڑی دیوار کھڑی کی جاسکتی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ وہ اللہ میں ان کی انکھ بچھاڑ میں نہیں لگ گئے مگر ان تعمیر کارانہ عموماً ناراج ہو جاتا۔ میری ساتھی ثنا ہرم کے اندر جانے کے لیے ٹکٹ لینے چلی گئی۔ صحرا میں داخلہ کا ٹکٹ ۵۰ مصری پاؤنڈ ابھی دے کر آئے تھے، اب ایک اور ٹکٹ کا خرچ ہونے والا تھا۔

اہرام کے ۱۴ مثلث پہلو ہیں۔ یہ چاروں پہلو سیدھے شمال، جنوب، مشرق اور مغرب کی طرف ہیں۔ ہرم کا زمینی پھیلاؤ ایکڑوں میں ہے۔ لیکن چتروں کے پردے پر پھیلاؤ کم ہوتا جاتا ہے۔ جب اپنی چوٹی کو پہنچے

چوڑے بنانے کا خیال مصری تعمیراتی فن میں انقلاب کا باعث بنا۔ اب یورپی مؤرخین ان کے بارے میں جو مرضی رائے دیں، فلکیات سے تعلق ثابت کریں، دریائے نیل کو ریت سے بچانے کا کہیں، مگر حقیقت میں یہ قبریں ہیں۔ دھوپ میں دھنک رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ روایتی رنگین پتھروں سے بے اونٹ اور مہاریں تھامے شتر بان بھی وہیں گشت کرتے سیاحوں کو پھانٹتے نظر آتے تھے۔ جب قریب گئے تو حیرت کے سمندر میں گر گئے۔ آنکھیں پھٹ پھٹیں۔ اس قدر وڑنی اور دیوہیکل جسم کے پتھر! ہر پہلو سے ان کی لمبائی، چوڑائی اور اونچائی حیران کن تھی۔ وہ کیا جن تھے یا کوئی ماورائی انسان جنہوں نے انہیں پہاڑوں سے توڑا، اٹھایا اور پتھر یہاں تک پہنچا کر ان کی تعمیر میں لگایا۔ قریب کھڑے ایک لڑکے نے بتایا کہ خوف کے ہرم کی اونچائی تقریباً ۱۳۸ میٹر ہے۔ پوری عمارت کا پھیلاؤ کوئی ۲۵ لاکھ مکعب میٹر ہے اور اس میں تقریباً ۳۳ لاکھ چٹانیں لگی ہیں۔

میرا نچلا ہونٹ بے اختیار میرے دانتوں سے آگیا۔ شاید یہ حیرت و استعجاب کی ایک اظہاری حرکت تھی۔ اسے سنے کتنی صدیاں گزر گئیں، غالباً ۵ ہزار برس۔





RIPHAH INTERNATIONAL
UNIVERSITY

Chartered by the Federal Government - Degrees Recognized Worldwide

Knowledge is your right.

Gain it at the right place, among the right people.



United Arab Emirates
RAK College of Dental Sciences

Bachelors of Dental Surgery (BDS)

- Accredited by Ministry of Higher Education & Scientific Research (UAE)
- BDS Programme Leads to MSC in Laser Dentistry from Germany



**RAK Medical and Health
Sciences University,
College of Dental Sciences**

P.O. Box 150713, RAK, UAE. Tel: +971 7 2222 553
Fax: +971 7 2222 534. Email: admissions@racodt.ae

Join Riphah Revolution
www.riphah.edu.pk

MAIN ISLAMABAD CAMPUS

Sector I-14, Peshawar Road, Near New
Passport office, Islamabad.
Ph: (0511) 5469541-7, (0511) 5469537-8

RAWALPINDI CAMPUS

AI African IMCT Complex, Old Supreme Court
Building, 274 Peshawar Road, Rawalpindi Cantt.
UAN: (051) 111 510 510, Ph: (051) 5125162-7

ISLAMABAD CAMPUS

IMC, 7th Avenue G-7/4, Islamabad.
Ph: (051) 2891835-8

تو اس پر صرف ایک سہل دھرنے کی جگہ رہ جاتی ہے۔

ٹٹا بھاگی بھاگی آئی اور پھولتے سانس کے ساتھ بولی ”خوف میں جانے کا لگت ۱۰۰ مصری پاؤنڈ ہے۔ اس کا دروازہ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ صرف کچھ دیر کے لیے کھلتا ہے۔ خوف کے ہرم میں ہیرے جو اہرات اور بہت سی دیگر اشیاء دیکھی جاسکتی ہیں۔ اب کیا کریں؟“

”تم خوف کو چھوڑو، اس کے بیٹے کے ہاں چلتے ہیں۔ اب اہی مہم جوئی میں رہنا ہے کیا، کل کسی اور طرف لگیں گے۔“ میں نے کہا۔

سمیٹن کے ہرم میں اترنے والے راستے کے منہ پر چھتری کی چھاؤں تلے بیٹھا پہریدار بڑا ترش رو تھا۔ کیمبرے موہاگل سب اپنے قبضے میں لیتے ہوئے بیگ بھی سنبال لیے۔ دہانے کے باہر مختلف زمینوں اور رنگ رنگ پولیوں والوں کا ہتھکھٹا لگا ہوا تھا۔ کچھ اندر سے دھونکی کی طرح سانس پھیلاتے ہوئے تو بے تلا کرتے برآمد ہو رہے تھے۔ باہر والے اس مہم جوئی میں سرفرو لوٹے والوں سے احوال سنتے تھے۔ ساتھی نے ہاتھ کھڑے کر دیے تھے مگر مجھے تو بالی عمر والے تجربے کرنے کا خاصا شوق تھا۔ سیریلیوں میں چند لمحوں کے لیے سوچا بھی کہ اب جوانی دیوانی پاس نہیں اور اندر سے آنے والے کچھ حوصلہ افزا داستان بھی نہیں سنا رہے مگر نہیں جی، چلبلا من مہم جوئی پر مائل تھا۔

اللہ کا نام لے کر ڈھلانی سیریلیوں پر قدم رکھا۔ دروازے میں داخلہ ہی ہکا دکے ساتھ ہوا۔ پاؤں پر زور پڑا اور لگا کہ ترخ جا میں گے۔ لمبے بھر کے لیے رُک کر اپنے توازن کو متوازن کیا۔ پھر سوچا کہ واپس لوٹ جاؤں لگا ہیں بھی پچھریں پر آگے آگے چلنے والے دو یوزھوں نے تقدیرت دی۔ آیت الکری لبوں پر رکھی اور آگے بڑھی۔ شروع میں ٹیوب لائینس تھیں، تھوڑا سا آگے چلنے کے بعد اندھیرا تھا۔ آگے چھپے لوگوں کا چلنا اور آنا جاری تھا۔ شخص اور گھبراہٹ تھی۔ ہل بھر کے لیے پھر سوچا، خطرہ نہ لوں لیکن پتا نہیں کس جہزے کی کشش تھی جس نے قدم

آگے بڑھا دیے۔ پانی کے گھونٹ سے لبوں کو تر کیا اور آگے بڑھی۔ خدا گواہ ہے، زندگی میں اپنی کسی حماقت پر اتنا افسوس نہیں ہوا ہوگا جتنا اس پر ہوا۔ وزن برقرار رکھنے میں سخت مشکل تھی۔ نہ جائے رفیق نہ پائے ماندن والا معاملہ درپیش تھا۔

آخر پچھوے کی طرح رینگتا وجود کھڑا ہو گیا۔ شکر کا لمبا سانس بھرا اور سیدھی ہو گئی۔ اسے گودام کہا جاسکتا تھا۔ وہ چپل نہا پھوٹا سا کمر تھا جس کے بائیں ہاتھ لوہے کی سلاخیں تھیں۔ وہاں ذرا حصن کم تھی۔ میں نے پھر پانی پیا۔ مٹی کی سی کیفیت تھی۔ شاید خون کا دباؤ بڑھ رہا تھا۔ اب خدا سے دعا کی کی جاسکتی تھی۔ آگے پھر سرنگ شروع ہو گئی۔ چوٹی بھنگا وہاں بھی نہیں تھا۔ بس ہاتھ دیواروں کو اندھوں کی طرح تھامتے تھے۔

پھر ایک اور پڑاؤ آ گیا۔ وہاں سورج کی روشنی تھی۔ یہ روشنی کہاں سے آتی تھی، میں کوشش بسیار کے باوجود سراخ نہیں لگا سکی۔ وہاں کچھ ہوا بھی تھی اور راستہ بھی کچھ لمبا تھا۔ یادداشتوں میں ابراہم پر پڑھا ہوا کچھ میرے سامنے آیا کہ ہر ہرم کے اندر ۲۰ سودا خ کیے جاتے تھے۔ ان سے روشنی کا حصول متعہ نہیں تھا بلکہ یہ فرعون کی روح کی آمد وقت میں سہولت کے لیے تھا۔ مصری عقیدے کے مطابق ہر مقبرے میں روح کے لیے راستہ رکھنا بہت ضروری تھا۔ اب اوپر کی جانب چڑھائی تھی۔ تھوڑا سا چڑھنے کے بعد منتقلی کمر سامنے آیا۔ کمرے کی چھت خاصی اونچی تھی۔ کمرے کے وسط میں پہریدار کھڑا تھا، سفید چٹری اور خاستری چنڈہ پہنے۔ ایک قدم نیچے اتر کر بین درمیان میں گہرے گندھی پتھر کا تابوت پڑا تھا۔ ساتھ اس کا ڈھکن تھا۔ دیواروں پر موتی سیاہ لکھائی سے کچھ لکھا ہوا تھا۔ یہ یقیناً غلطی خط کی خیریں ہوں گی۔

واپس پہلے سے بھی زیادہ اذیت ناک تھی۔ جب باہر نکلی تو چند لمحوں کے لیے یوں محسوس ہوا جیسے ”کوڑے“ ٹوٹ گئے ہیں۔ انھیں بھٹکلی حسیت کر لائی۔

(ابراہم سرے سے وقت ہی آتا ہے۔ سلمیٰ امون)

ملٹن کا گھر

کرتے پایا۔

”مردوں کو خریداری کا جنون ہے۔ اپنی پوری تنخواہ کے علاوہ کریڈٹ کارڈ کی رقم بھی خریداری پر لگا دیتے ہیں۔“ ”شما نے بتایا۔

”یہ گھر پر کس وقت ہوتے ہیں۔“ ہم نے پوچھا۔
”صرف سوتے وقت۔“ جواب ملا۔

”خوب! اسی لیے ان کے گھر چھوٹے اور تقریبی و خریداری کے مقامات کشادہ اور زندگی سے بھرپور ہیں۔ نئے تعمیر شدہ مکانات تو پاکستانی شہری گھروں کے مقابلے میں ”بچے“ ہیں۔ ملٹن کیوں میں مکانات جنگل کاٹ کاٹ کر تعمیر کیے گئے ہیں۔ گویہ پہاڑی مقام نہیں لیکن لوازمات سارے ”بل ایشین“ کے ہیں۔ یعنی پادہ باران کا ہر دم آتا جانا، درختوں کے سلسلے، ہریالی، نہ ختم ہونے والے نظارے، چشمے، پھیلیں سب ہی موجود۔ ساتھ ایک انتہائی جدید تیس ہزار شاخیں کے لیے بنا ہاکی اسٹیڈیم، شاندار کتب خانے، یونیورسٹی، کالج اور ۶۵ ہزار سے زیادہ افراد کا کچھل اسٹیڈیم۔ شاید ہی کوئی ایسی بین الاقوامی کمپنی ہو جس کا دفتر موجود نہ ہو۔“ لیکن اس کے باوجود یہ سنی ان فادرست (جنگل میں شہر) کے طور پر بنایا گیا ہے۔ ”نیل نے بتایا۔

”ہم ناشتا اکثر ٹی وی لاؤنج میں کرتے مگر سامنے ایک وسیع سرسبز میدان تھا۔ اکثر دیکھتے کہ صبح ہی سے کچھ گورے کسی کام میں مصروف ہیں۔ معلوم ہوا کہ پرائمری سکول کے بچوں کے لیے فٹ بال کا میدان تیار ہو رہا ہے۔ علاقے کا ہر شہری اپنا کچھ وقت رضا کارانہ طور پر وہاں لگاتا۔

شہر اور جمیل کے بچوں سچ واقع ایک جمیل، کلڈ یونی (Caldecote) نہ صرف شہریوں کو فراہمی آب کا قدرتی

بیٹر ہوئی اڈے پر بڑی رونق تھی۔ سرکاری کارروائی سے فارغ ہو کر باہر آئے تو نیل اور شواہ کو اپنا منتظر پایا۔ کار میں بیٹھ کر نیل کے گھر ملٹن کیوں (Milton Keynes) کی جانب روانہ ہوئے۔ براستہ مورفوس تقریباً ایک گھنٹے کا سفر طے کر کے منزل پر پہنچے۔ یہ شہر انگریزی کے ممتاز اور کلاسیکی شاعر جان ملٹن سے منسوب ہے۔ ملٹن کیوں کا لفظی مطلب ہے ”ملٹن کا گھر“۔ یہ شہر ۱۹۷۰ء کے بعد بطور لندن کے متبادل تعمیر ہوا۔ لندن تیز رفتاری سے پھیلا تو ہر طرف آبادی ہی آبادی نظر آنے لگی۔ لوگوں کے لیے مکانات حاصل کرنا ممکن نہ رہا تو لندن کے قریب یہ نیا شہر بسایا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ یہاں بسنے والے روزیج لندن جائیں اور شام کو واپس آجائیں، صحت اور تفریح گھر پر موجود ہو۔ راستہ ایسا تیار کیا گیا کہ بس میں ایک گھنٹہ اور تیز رفتاری سے ڈرائیو ۲۵ منٹ میں سرگرم ہو جائے۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں بستی بستی بستی ہے، بستی بسنا تکمیل نہیں۔ قوم کی کمی کی وجہ سے منصوبہ نامکمل چھوڑ دیا گیا، اسی لیے آبادی مختصر ہے۔

دوسرے دن ملٹن کیوں کی سیر کو نکلے، شہر اور جنگل کا ایسا حسین امتزاج تھا کہ شہر کہیں کہ جنگل، کچھ کچھ میں نہ آتا۔ ہر طرف درخت ہی درخت اور خوب بے گھر کے اگر راستہ نہ ہوتا تو گزرنے کا سوال نہیں تھا۔ چلتے چلتے شہر کا خوب صورت خریداری مرکز آگیا۔ ایک گلو میٹر سے زیادہ رقبے پر پھیلا یہ خریداری مرکز مکمل طور پر چست کے بیچے ہے۔ یہاں بارش خوب ہوتی ہے، خاص کر موسم سرما میں، اس لیے سردی یا برف باری اور بارش سے بچاؤ کا یہ طریقہ اپنایا گیا۔ برطانیہ کے اکثر شہروں میں ایسے ہی خریداری مراکز ہیں۔ گو اتوار کی وجہ سے زیادہ تر دکانیں بند تھیں، لیکن ہم جب بھی یہاں آئے، لوگوں کو خریداری

”کوئی میل تو نہیں لگا مفت کتب میں تقسیم کرنے کا۔“ ہمیں بتایا گیا ”نہیں روڈ ان لوگ اسی طرح یہاں آتے ہیں۔“ ۱۳ منزلہ عمارت میں کم و بیش بیس بیسوں لائبریرین اور لاکھ سے اوپر کتابیں۔ ہم نے کچھ کتابوں پر نظر ڈالنا چاہی تو یاد آیا کہ ٹینک تو کھر بھول آئے ہیں۔ لائبریرین نے ہماری پریشانی دیکھی تو کہا ”آپ اپنی پسند اور نمبر کی ٹینک لے کر پڑھ لیں۔“ پتا چلا کہ ہر نمبر کی ٹینک وہاں رکھی ہے۔ آپ پڑھنے کے لیے عارضی طور پر ٹینک بغیر قیمت کے استعمال کر سکتے ہیں اور چاہیں تو نئی ٹینک خرید لیں۔

یہاں کا خلائی مرکز (Space Centre) اپنی طرز تعمیر میں یکتا ہے۔ یہ ایک انتہائی وسیع و عریض عمارت ہے جس کا گنبد پوری عمارت پر محیط ہے۔ دیکھ کر خیال آتا کہ گنبد کس چیز پر ٹھہرا ہوا ہے۔ اس قدر تقریبات گنبد کے نیچے جمع کرو دی گئی ہیں کہ حساب ممکن نہیں۔ ٹینک ہمیں بار بار وہاں لایا، لیکن ساری تقریبات پھر جتنی نہ دیکھ سکے۔ قائم اندرونی کھیل تھے۔ جن میں خلا میں تیراکی ایک جہان کن تجربہ تھا۔ لیکن اس سے زیادہ دلچسپ ۰.۵ میٹر طویل برف کا پچسلن تھیم (Snow Ski Slope) رہا۔ ٹینک اور ٹاء نے وہاں برف پر پھسلنے کا



غیر معمولی مظاہرہ کیا اور ہم سمیت تمام تماشائیوں سے دوا و وصول کی۔ خلائی مرکز اس طرح تعمیر کیا گیا ہے کہ وہ ملٹن کیتھر کا نشان علامت (لینڈ مارک) بن گیا اور ہر جگہ سے نظر آتا ہے۔

ایک دن بیٹھے بیٹھے ٹینک نے کہا، چلیے آپ کو سفاری پارک کی سیر کرا لاؤں۔ وون سفاری پارک

ذرا بڑا ہے، بلکہ تقریباً، ہالنگ اور کچھ لوگوں کے لیے عبادت کی جگہ بھی ہے۔ شفاف پانی سے لہاں بھری اس جھیل کے ارد گرد گھاس سے ڈھکی چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ہیں، جن پر کوہ چٹائی کے ابتدائی اسباق لیے جاسکتے ہیں۔ برف رانی سے لے کر تیراکی اور کشتی چلانے تک، غرض کون سا شوق یہاں پورا نہیں کیا جاسکتا۔ جھیل کے ارد گرد کیا جانے والا سب سے خوش گوار عمل چھل قدمی اور سیر ہے۔ کچھ دور ایک بدھ مندر ہے، جس کے روبرو دوں جاپانی پتھروں ہیں۔ بدھ مندر، جاپانی پتھر اور ملٹن کیٹری ہے۔ جدید و قدیم طرز کی جھیل کا تعلق سمجھ میں نہیں آتا۔

”ٹینک وہاں چل کے دیکھ لیتے ہیں۔“ ٹاء نے کہا۔ وہاں جا کر دیکھا کہ بدھ مندر کئی بڑے بڑے کمروں اور بالوں پر مشتمل ہے۔ ایک چھوٹا سا عجائب گھر اس کے ساتھ تھا جس میں مندر کی تاریخ محفوظ تھی۔ پتا چلا کہ یہ مندر جدید شہر کی تعمیر سے پہلے ہی وجود میں آچکا تھا۔ ہم اکثر ملٹن کیٹری میں بے مقصد اکیلے گھومنے نکل جاتے۔ جس طرف اور جتنی دور جاتے جنگل، چٹانیں اور ہریالی ہمارے ساتھ ساتھ چلتے۔ دن بھر خاموشی رہتی۔ سکوت، پرندوں کی چچہاہٹ، چاروں طرف رنگ برنگے قدرتی پھول، اس طرح سچے گویا باقاعدہ کیاریوں پر کیاریاں بنا دی گئی ہوں۔ سڑکیں، درخت اور ٹیلے کاٹ کر بنائی گئی ہیں۔ سائیکل کا استعمال اتنی فراوانی سے کہ ۲۰۰۰ سے قبل کے چینی شہروں کا گمان ہوتا۔ جدید نکل جاتے لگا کہ تقریباً مقام ہے۔ چھوٹی چھوٹی آبادیاں، خاصے فاصلے پر جنگل کے درمیان جا بجا نظر آتی ہیں۔

ٹاء بار بار ہم سے اصرار کرتی رہی کہ وہاں کا کتب خانہ ضرور دیکھا جائے۔ سو ایک دن ہم اور زاہد اس کے ساتھ چل پڑے۔ جس عمارت کے آگے گاڑی رکھی وہ وسیع، بلند و بالا تھی۔ لوگ کافی بڑی تعداد میں آ جا رہے تھے۔ بورڈ پر نظر ڈالی تو پتا چلا یہاں کا مرکزی کتب خانہ ہے۔ ۲ لاکھ سے بھی کم آبادی کے اس شہر میں اتنے کتابوں کے شوقین، کچھ یقین نہ آیا تو ہم نے پوچھا



PRESTON UNIVERSITY

The leader and pace-setter in higher education!

*"Serving
the nation for over
27 Years"*



— Executive Programs —

**EMBA/EMS
MBA (Evening)**

— Regular Programs —

**BBA/BSCS
MBA/MCS**

M.Sc

Psychology, Economics, International Relations,
Education, Maths, Telecom, Electronics

**B.Ed/M.Ed
MA/MS (Education)**

M.Phil/PhD

Psychology, Economics, Int'l. Relations, Mathematics,
Education, IT, Management Studies



UAN: 111-707-808
www.preston.edu.pk

ISLAMABAD (92-51) 443097-6	KOHAT (92-922) 510511-3
PESHAWAR (92-91) 5940540-3	LAHORE (92-42) 35913294-5
KARACHI (92-21) 34538823-4	



”ارے وہ گیارہ شیر“، ”وہ دیکھو وہیں بارہ چیتے اور بچے“
 زائدہ چلا انھیں۔ مزید آگے بڑھے تو دیکھا کہ ہر شیر کا
 ایک بڑا خاندان، جس میں کم از کم پندرہ ”افراد“ ہوں
 گے، سرک کے درمیان قیلولہ فرما رہا ہے۔ ابھی ہم سوچ
 ہی رہے تھے کہ ایک فورولڈر ذیل کمین گاڑی ہمارے
 سامنے ٹیلے سے اتری اور شیروں کی جانب بڑھی۔ خیال
 تھا کہ شیر خاندان کے باہر بیٹھے ہوں گے، لیکن یہ دیکھ کر
 حیرت میں ڈوب گئے کہ دو اٹھارہ بیس سال کی لڑکیاں اگلی
 نشست پر براہمان ہیں۔ وہ بڑے اطمینان سے شیروں
 کے خاندان کے قریب کھیں اور راز و نیاز کے انداز میں
 کچھ کہا، کچھ اشارے کیے اور شیر بڑے اعتماد انداز میں اٹھے،
 راستہ چھوڑا اور قریب ہی گھاس پر بیٹھ گئے۔ ہماری گاڑی
 شیروں کے بالکل قریب سے گزری۔ جنگل کے درمیان
 ایک بڑا سا ہوٹل بنا ہوا تھا، جہاں کھانے پینے کی اشیاء
 دستیاب تھیں۔ قہقہیں اٹھاتی مناسب۔ جانوروں کے
 ساتھ وقت گزارنے کے بعد شام کو ہم گھر کی جانب چل
 پڑے۔ اس کے ساتھ ہی ہماری برطانیہ کی سیاحت بھی
 تمام ہوئی۔

(ملٹن کھور، جنگل میں منگل۔ منور زار)

برطانیہ کا سب سے بڑا پارک ہے۔ کئی کلو میٹر پر پھیلا ہوا
 ہے۔ صدر دروازے پر ٹکٹ لینے کے بعد کوئی دو کلو میٹر کا
 فاصلہ طے کیا تو ایک اور بڑا دروازہ آیا۔ معلوم ہوا کہ
 یہاں سے چرند پرند کا علاقہ شروع ہوتا ہے۔ جس طرف
 بھی نظر دوڑائی مختلف جانور نظر آئے۔

”ڈارا ان بندروں کو دیکھیے! ارے جلدی سے کار کا
 شیشہ چڑھالیں۔“ زائدہ تجویزیں کہ ایک بندر درخت سے
 اچھل کر ہماری کار کی چیت پر سوار ہو گیا تھا۔ موسم بے حد
 خوشگوار تھا، بلکی بلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ جانور پرندے
 پوری ترنگ میں تھے۔ سماں بالکل گھنے جنگلوں کا سا، لیکن
 راستہ اس طرح بنایا گیا تھا کہ کوئی دشواری نہ ہو۔ خوشی کی
 بات یہ تھی کہ چڑیا گھر والا دیکھتا اور تاکتا نہیں تھا، نہ بندر
 ہمیں گھور رہے تھے نہ ہم آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر جھیمبونی
 کو دیکھ رہے تھے۔ معاملہ مہمان اور میزبان کا تھا۔ جانور
 آزادی سے پھر رہے تھے۔ ہم اپنے انداز میں رک رک
 کر بغور ہر ایک کا جائزہ لیتے رہے۔ کئی میل یوں ہی کار
 میں گھومتے گزر گئے۔ کہیں جمیل تو کہیں جشتے۔ پلٹیں تیر
 رہی ہیں تو بہن پانی پی رہی ہے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ نہ
 وہ لوگوں سے ڈانوس، نہ لوگ ان سے خوفزدہ۔ جمیل نے

گوروں کی فطرت پر روشنی
 ڈالی ”جنگلی حیات کو نقصان
 پہنچانا نہ صرف جرم ہے
 بلکہ یہ لوگ ان میں کھل مل
 کر خوش رہتے ہیں۔“
 ”شیشے چڑھالیں۔“

جمیل نے اعلان کیا۔ ہم
 ایک بڑے دروازے کے
 نزدیک تھے۔ اس نے بتایا
 کہ اب ہم شیر چیتوں کے
 گھر جا رہے ہیں۔ ایک
 وادی میں داخل ہوئے اور
 جو دائیں طرف نظر ڈالی



تیسرا نمبر دینی کا مصنوعی حسن

ہم اسلام آباد سے تین گھنٹے پلے آئی اے کی
لا جواب پرواز میں دینی ہوائی اڈے اترے۔
وہاں پاکستانی مسافروں پر عموماً توجہ نہیں دی جاتی
چنانچہ ہماری بھی کسی نے راہنمائی نہ کی۔ ہم
ٹرینل ون کے بجائے تقریباً ۵ میل پیدل
چلتے ہوئے کسی دوسرے ٹرینل میں جا نکلے۔
دینی ہم ۱۹۷۰ء سے آ جا رہے ہیں لیکن ہر بار
میلے سے مختلف نظر آتا ہے۔ بلند و بالا
عمارتیں، صفائی اور سبزہ دینی کی خوبصورتی
کہلاتا ہے۔ مگر یہ سب کچھ مصنوعی سا لگتا
ہے۔ اللہ نے جس طرح کے مناظر دینی
اور عرب ملکوں کو دیے ہیں، ان کے
مطابق وہاں ریت اور ٹھنڈا ہی
خوبصورتی ہے۔ اس سبزے اور صاف
ستھرے باغوں اور پارکوں کا کیا فائدہ
جس میں انسان ہی دیکھنے کو نہ ملے؟
اس لیے کہ گرم موسم میں کون باہر نکل کر
باغوں اور پارکوں کی سیر کرے گا؟
لیکن ہر بار دینی میں کسی نہ کسی
مصنوی ترقی میں اضافہ دیکھنے کو ملتا
ہے۔ اس بار ہم نے میٹروپولین
دبلیو جو پچھلے سال جنمیں تھی۔
میٹرو شاید غریب مسافروں کی
سہولت کے لیے بنائی گئی مگر
دینی میں غریب بندہ کہاں
دکھائی دیتا ہے؟ غریب تو
ریگستان میں ہوتا ہے یا پھر
شہر میں سونزلہ بلند عمارتوں

کی تعمیر میں دن رات لگا کر مزدوری کرتا ہے۔
ہم نے جتنے بھی ٹیکسی ڈرائیور دیکھے ان کا تعلق
پاکستان کے سو بہ بھنٹوں خوا سے تھا۔ وہ
سرکاری ٹیکسیاں چلاتے ہیں جس پر انھیں
کل آمدنی کا ۳۰ فیصد ملتا ہے۔ تقریباً
سارے ٹیکسی ڈرائیوروں کا معاش دینی کی
فضا کی طرح خشک اور گرم ہوتا ہے۔ وہ
تمام راستے وہاں کی موبکائی کا رونا روتے
، پاکستانی بدعنوانیوں کی کہانیاں سناتے
اور خود بھی جہاں تک ممکن ہو سکے،
مسافروں کو چکر دے کر زیادہ سے
زیادہ کرایہ بھرتے ہیں۔ اس بار ہم
نے سٹی سینٹر دینی سے علی سینٹر کی ٹیکسی
کرائی تو ڈرائیور نے جھوٹا بہانہ بنایا
کہ اس کا وقت ختم ہو چکا اور وہ جا
رہا ہے۔ ہم نے پوچھا، اگر یہ
بات سچ ہے تو اس نے ٹیکسی کیوں
روکی؟ وہ بیزارگی کے انداز میں
جانے کو تیار ہوا اور بولا، آپ
جانتے ہیں کہ علی سینٹر کہاں
واقع ہے؟ ہم نے جواب دیا،
نہیں۔ جب اس نے ہمیں
یوں بٹھایا جیسے احسان کر رہا
ہو۔ سٹی سینٹر سے علی سینٹر کا
کرایہ ۸ سے ۱۰ روپے ہم بتا
ہے لیکن ڈرائیور نے لمبا
راستہ اہناتے ہوئے ہمیں
علی سینٹر پہنچایا اور

سیاحوں کے لیے اتنا خوبصورت اور حسین بنایا ہے کہ امیر اور گرم آب و ہوا کا ترسا سفید قام وہاں ٹھہرنا پسند کرتا ہے۔ برنج العرب ہوٹل جہاں ایک رات کا کرایہ تقریباً ۳ لاکھ روپے ہے، اس میں قیام کرنا اور اسی طرح پام آبی لینڈ میں ذاتی خرچ بنانا کھرب جتنی اشرف المخلوقات کی پسندیدہ خواہش اور پسندیدہ مشغلہ ہے۔ پام آبی لینڈ جیسے مصنوعی جزایروں کی طرح دینی کا مصنوعی سکینگ سینٹر، شاپنگ مال آف افریقہ اور دینی پرنس ناویر شہر کے مصنوعی مسن میں انسانے کا موجب ہیں۔

دینی میں کچھ چیزیں ہم جیسے پاکستانیوں کو بھی حیرت زدہ کر دیتی ہیں کہ شہر میں سوائے مخلوق کے کسی شے میں ملاوٹ پائی نہیں جاتی۔ خالص غذا کھانے سے اکثر پاکستانی اور بھارتی یہاں آتے ہی بیمار ہو جاتے ہیں۔ رفتہ رفتہ ان کا معدہ خالص غذا کا عادی ہوتا ہے۔

دینی میں خاموشی بھی بہت ہے۔ لوگ چپ چاپ گھومتے اور واپس چلے جاتے ہیں۔ سیاہ قام اور سفید قام خاموشی سے اپنا اپنا کام کر جاتے ہیں۔ جرائم نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس لیے کہ لوگ شریف ہیں بلکہ یہاں کا قانون سخت اور سب کے لیے برابر ہے۔ یہاں سوائے شیعوں کے کوئی ”اہم شخصیت“ نہیں ہوتا۔

مانا کہ دینی میں سب کچھ ہے سوائے غربت کے، مگر حیرت کی بات ہے کہ اتنا چمکا ہونے کے باوجود دینی میں کوئی چیز اس کی اپنی نہیں۔ اللہ نے انہیں اتنا نوازا ہے کہ ساری دنیا دن رات ان کی خدمت کرنے میں مصروف دکھائی دیتی ہے۔ ہمیں اللہ نے تیل کی دولت سے تو نہیں نوازا مگر غربت کی دولت سے مالا مال ہیں۔ اسی غربت میں ہم کرکٹ، سنوکر، اسکواش کے عالمی چیمپئن بھی رہے۔ ہمارے ڈاکٹر، انجینئرز اور کھلاڑی دنیا بھر میں مانے جاتے ہیں۔ ہم اتنے دریا دل ہیں کہ فلسطین یا کسی اور عرب ملک کے لیے جلوس کی شکل میں سڑکوں پر ڈنڈے کھاتے ہیں مگر وہی عرب ہمیں نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

(طارق قیس)

آرڈو فاؤنڈیشن مارچ ۲۰۱۲ء کے ۵

۲۹ روز ہم گرایہ وصول کیا۔ ہم نے اترتے وقت اسے بتایا کہ ہم غلیج سینٹر کا راستہ جانتے تھے مگر اسے آزمانے کے لیے اسے نہیں بتایا تھا۔ اسے نصیحت کی کہ بے ایمانی سے کمایا ہوا پیسا کبھی اہم نہیں ہوتا اور کسی دوسرے راستے سے نکل جاتا ہے۔

دینی میں اصل باشندے آنکھ میں ڈالنے کو بھی نہیں ملتے۔ کسی زمانے میں یہاں پاکستانی باشندوں کی تعداد سب سے زیادہ تھی، پھر بھارتی اور ان کے بعد چینی اور کوریائی باشندوں کی بھر مار ہو گئی۔ پاکستانی باشندے زیادہ تر نجی چھاتے اور ان کے بعد زیادہ تر مزدوری کرتے ہیں۔ بھارتیوں کے پاس کپڑے اور تیار شدہ ملبوسات کا کاروبار ہے۔ ہوٹل کے کاروبار میں بھی ان کا کافی عمل دخل ہے۔ کوریائی اور چینی زیادہ تر دکانوں اور اسٹوروں پر نظر آتے ہیں۔ تعمیرات کے بڑے بڑے ٹھیکے جرمن اور برطانیہ اور بھارتی شہری کا کام امریکہ اور دیگر یورپی ممالک کے ہاتھ میں ہے۔ یوٹی اڈے سے کسٹم اور انٹیکریشن پر امارات کے جوان لڑکے اور لڑکیاں نظر آتی



ہیں جبکہ نکلنگ اور بورڈنگ کا کام ایشیائی اور مزدوری کا کام بھارتی اور پاکستانی مزدوروں کو ملا ہوا ہے۔

دینی کو وہاں کے شیعوں نے امریکی اور یورپی

حیدر آباد دکن میں چند روز

گرد و ہوا کی صورت کام کرتے ہیں تاکہ رابطہ اور مشورہ کرنے میں آسانی رہے۔ ان پر عزم نوجوانوں کی آنکھوں میں بھارت کے مستقبل کی جھلک دیکھی۔ اگرچہ سکروں کے باہر صوفے موجود تھے مگر میں نے کسی کو وہاں بیٹھ کر سب شپ میں وقت ضائع کرتے نہیں دیکھا۔ نظر آ رہا تھا کہ ان لوگوں کو خوب احساس ہے کہ کسی قوم کے بنانے میں سائنس و ٹیکنالوجی کی اہمیت کیا ہے۔ انفوس میں کئی شعبے کام کرتے ہیں۔ مثلاً آئی ٹی، ایرو سپیس، حیاتیاتی علوم وغیرہ۔ اس کی آمدنی ۲۰۰۵ء میں ۵۹۲ ملین ڈالر تھی، ۲۰۰۶ء میں بڑھ کر ۲۰۱۵۲ ملین ڈالر ہو گئی۔ دنیا بھر میں کپنی کے ملازمین کی تعداد ۶۰ ہزار سے زائد ہے۔ حیدر آباد میں اس کی عمارت ۳۱ ہزار مربع فٹ پر مشتمل ہے۔ یہ عمارت ۲۰۰۳ء میں ۹ ماہ کی غیر معمولی مدت میں تعمیر ہوئی۔ انفوس ڈویلپمنٹ سینٹر معاشرتی بہبود کے کئی منصوبے چلاتا ہے جن میں ایسی کیمپ، سکولوں کے لیے عمارتوں کی تعمیر اور غریب عورتوں میں سلامتی مشینوں کی تقسیم وغیرہ شامل ہیں۔ انفوس کی کامیابی دیکھتے ہوئے خیال آیا کہ پاکستان میں بھی ایسے ہی صنعتی کمپنیز تعمیر کرنے چاہئیں۔

حیدر آباد کے لیے پرواز روانہ ہونے میں کچھ وقت تھا۔ لہذا ہم نے رات کا کھانا دہلی ہوائی اڈے پر ہی کھایا۔ کھانے کا ذائقہ تقریباً پاکستانی کھانوں جیسا تھا۔ ہم رات وہ بجے حیدر آباد پہنچے۔ ہوائی اڈے سے ہم نے ٹیکسی لی اور رہائش گاہ پہنچے۔ ٹیٹا خلیق اور شفاء فاروق کا قیام انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف انفارمیشن ٹیکنالوجی کے گراؤ ہوٹل میں تھا۔ اس انسٹی ٹیوٹ کی مرکزی عمارت کا نام بھارتی صدر عبدالکلام سے منسوب ہے جو ان کی خدمات کا اعتراف ہے۔ صدر عبدالکلام بھارت میں سب سے زیادہ عزت پانے والی شخصیات میں شامل ہیں۔

جس مہمان گھر (گیسٹ ہاؤس) میں میرا قیام ہوا، وہ انفوس کی حدود میں واقع ہے۔ انفوس بھارت میں ایک بڑی سافٹ ویئر کمپنی ہے۔ ضروری کارروائی کے بعد حفاظتی عملے نے مجھے انفوس کی حدود میں داخلے کے لیے عارضی شناختی کارڈ بنایا۔ دروازے پر سخت حفاظتی انتظام تھا۔ انفوس کی سافٹ سٹری عمارت ایک بہت بڑی عمارت کا حصہ ہے جس میں رہائش، کھانے، جمعیہ اور سونٹک پول وغیرہ کی سہولتیں بھی موجود ہیں۔ یہ جگہ آئی ٹی کے ماہرین کی پیشہ ورانہ ضروریات کا لحاظ بخوبی کرتی ہے۔ میں بھی پہلے روز ناشتا اسی عمارت کے ریسٹوران میں کیا۔

انفوس میں قیام کے دوران مجھے آئی ٹی کے نوجوان ماہرین کو کام کرتے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ لوگ چھوٹے چھوٹے سکروں میں



ہم سب سے پہلے قطب شاہی حکمرانوں کے مزارات کے پاس گئے۔ یہ مقبرے پتھر کی عمارتوں پر مشتمل ہیں جن کے اوپر گنبد اور چاروں جانب محرابیں بنی ہیں۔ چھوٹے مقبروں کی گیلری ایک منزل جبکہ بڑوں کی ۲۰۰ منزلوں پر مشتمل ہیں۔ ہر مقبرے کے وسط میں قبر کے اوپر تابوت بنا ہوا ہے۔ گنبدوں پر اصلاً نیلی اور سبز ٹائلیں نصب تھیں مگر اب کہیں کہیں ان کی محض نشانیاں باقی ہیں۔

ہماری دوسری منزل گوکنڈہ کا قلعہ تھی۔ یہ قلعہ تیرہویں صدی میں تعمیر کیا گیا۔ بعد میں قطب شاہی حکمرانوں نے اس جگہ کو اپنا صدر مقام بنایا تو انھوں نے قلعہ از سر نو تعمیر کیا۔ انھوں نے اس میں یادگاریں اور خوبصورت پارک بنائے اور ایسا مذهبی نظام قائم کیا جس کے ذریعے صدر دروازے پر بجی تانی کی آواز بھی قلعے کے اندر تک سنائی دیتی۔ تاریخ میں اپنی فطری دلچسپی کے باعث میں قلعے کی شان و شوکت سے مبہوت ہو گیا اور دوہر تک ہندوستانی مسلمانوں کے عظیم الشان ماضی اور برصغیر کی شان و شوکت میں مسلم حکمرانوں کی کوششوں کے متعلق سوچتا رہا۔

اگرچہ ہم مکہ مسجد اور سالار جنگ عجائب گھر دیکھنے سے قاصر رہے مگر یہ جگہیں سیاحوں کے لیے باعث کشش ہیں۔ مکہ مسجد کی تعمیر اگرچہ سلطان محمد قلی قطب شاہ نے شروع کروائی تھی لیکن اس کی تکمیل مغل بادشاہ اورنگزیب کے ہاتھوں سترھویں صدی میں ہوئی۔ یہ جڑواں شہروں میں سب سے بڑی مسجد ہے جس میں ۱۰ ہزار نمازی نماز ادا کر سکتے ہیں۔ مسجد کی تعمیر میں کچھ ایشیائی مکہ کرمہ سے منگوا کر بھی استعمال کی گئیں۔

مجھے فی وی رپورٹ کے ذریعے بنگلور یونیورسٹی کے اس سال گریجویٹ ہونے والے طلبہ کے نتائج سننے کا موقع ملا۔ اس میں حیران کن بات یہ تھی کہ پہلی ۱۰ پوزیشنیں مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی مسلمان طالبات نے حاصل کیں۔ پوزیشن

انٹرنیشنل ٹرانسپورٹ آفیس کے ذریعے حیدرآباد شہر کی سیر کرنے کے لیے ایک ٹیکسی کرائے پر لی۔ میں مقامی لوگوں اور ان کے ثقافتی ورثے کا براہ راست مشاہدہ کرنا چاہتا تھا۔ حیدرآباد اب بھی جنوبی ہند کا مسلم اکثریتی شہر ہے۔ یہاں کئی سو برس مسلم حکمرانوں نے حکمرانی کی ہے۔ ۱۹۴۸ء میں ہندوستان نے حیدرآباد پر قبضہ کر لیا۔ اس شہر میں بے شمار مساجد ہیں۔ ہم جمعہ کو شہر کی سیر کرنے نکلے اور شہر کی فضائیں خطیب صاحبان کی آوازوں سے گونج رہی تھیں۔ پرانے شہر میں بعض گھلوں کی ۱۰۰ فیصد آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ مسلمان عورتیں اسی طرح مکمل طور پر پارہ دلبوں تھیں جیسا کہ افغانستان میں دکھائی دیتا ہے۔ اتنی بڑی تعداد میں پارہ دلوں کو دیکھ کر حیرت ہوئی۔ بہر حال بھارت کا یہ صرف ایک روپ ہے۔ اس کی تصویر مختلف مذاہب اور ثقافتوں سے مل کر مکمل ہوتی ہے۔ تمام گروہ عموماً ایک دوسرے کا احترام کرتے ہیں تاہم بعض مستثنیات بھی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ صرف جمہوریت کی وجہ سے ممکن ہوا جس کی جڑیں عوام میں ہیں۔ مختلف مذہبی اور ثقافتی گروہوں کو جوڑ رکھنے والی واحد قوت جمہوریت ہے۔



تھوڑے زیادہ ہیں۔ ورنہ یہ سفر ۱۸ لاکھ روپے میں بھی
 آسانی ممکن تھا۔ برطانیہ سے پاکستان جانے کے لیے دو
 راستے ہیں۔ پہلا فرانس، جرمنی، آسٹریا، ہنگری، رومانیہ،
 بلغاریہ، ترکی، ایران اور پاکستان۔ دوسرا فرانس،
 سوئٹزرلینڈ، اٹلی، یونان، ترکی، ایران اور پاکستان۔ دوسرا
 راستہ زیادہ خوبصورت اور دلکش مگر حصول کے اخراجات کی
 وجہ سے مہنگا ہے۔ اس کے علاوہ دو جگہ شہر بھی استعمال
 کرنی پڑتی ہے۔ اس لیے ہم نے پہلا راستہ اختیار کیا۔

ہمارے لیے سب سے حیران کن امر یہ تھا کہ تمام
 یورپ کے درمیان کوئی سرحد نہیں۔ آپ فرانس سے جرمنی
 اور جرمنی سے آسٹریا چلے جائیں، ایسا لگتا ہے کہ آپ
 ناظم آباد سے ناظم آباد آگئے ہیں۔ ہمیں پانی نہیں
 چلا کہ کب ہم فرانس سے جرمنی میں داخل ہو گئے۔ راستے
 میں جب ہم نے زبان تبدیل ہوتے دیکھی تو احساس ہوا
 کہ ملک بھی تبدیل ہو گیا۔ فرانس سے آسٹریا کے شہر ویانا
 تک تو سفر شاندار رہا۔ نہایت خوبصورت علاقہ اور موسم
 تھا۔ لیکن ویانا سے آگے ہنگری کے شہر بڈاپسٹ تک کا سفر
 اور پھر وہاں رومانیہ کے شہر بخارسٹ تک کا سفر ہمیں یاد
 رہے گا، کیونکہ اس دوران ہمیں سب سے زیادہ مشکلات
 پیش آئیں۔ اتنے بڑے سفر میں سب سے زیادہ پریشانی
 راستے کی ہوتی ہے اور اگر آپ راستہ بھٹک جائیں، تو لگتا
 ہے کہ سب کچھ لٹ گیا۔ یہی کچھ ہمارے ساتھ ہوا۔
 بہر حال، سفر خیر و عافیت سے گزر گیا۔ اگر کوئی مجھ سے
 پوچھے کہ کون سا شہر اچھا لگا تو میرا جواب ہوگا کہ استنبول۔
 استنبول بہترین شہر ہے۔ وہاں قدیم و جدید عمارات،
 سبز و پانی، سمندر و فیروزہ سب موجود ہیں۔ سب سے بڑا
 کر خلافت عثمانیہ کی نشانیاں اور مسلم تاریخ بہت جاذبیت
 رکھتی ہے۔ استنبول کے بعد میونس نے مٹا کر کیا۔

مختصر احوال سرفروں ہے۔ برطانیہ چونکہ ایک جزیرہ
 ہے، چنانچہ اس سے باہر نکلنے کے لیے پانی کے اوپر سفر کرنا
 پڑا۔ ہم برطانوی شہر ڈوور (Dover) سے فیری (کشتی)
 کے ذریعے فرانسیسی شہر کپلاس پہنچے۔ پھر پیرس کے ایک

لینے والی ایک طالبہ نے انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ اگر
 مواقع مہیا کیے جائیں تو مسلمان طلبہ و طالبات بہترین
 کارکردگی دکھا سکتے ہیں۔

یہاں یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ تمام تر ترقی کے
 باوجود بھارتی معاشرے کو کئی مسائل کا سامنا بھی ہے۔
 پولیس کچھ اور لوگوں کا عمومی رویہ ہمارے جیسا ہی ہے۔
 غریب لوگوں کی انصاف تک رسائی نہیں ہوتی۔ پاکستان
 اور بھارت میں ذرائع ابلاغ لوگوں میں بیداری اور
 انفرادی حقوق کا احساس پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کر
 رہے ہیں۔ میرا خیال ہے، دونوں طرف عوام میں یہ
 احساس پایا جاتا ہے کہ پاکستان اور بھارت کی حکومتوں
 اور عوام کے درمیان تعلقات میں بہتری آنی چاہیے۔

(حیدر آباد دکن میں چند روزوں کے سفر مافوق قاروق احمد)

پانچواں رنگ

برطانیہ سے پاکستان تک بذریعہ سڑک

میں برک شانز، برطانیہ کے شہر نیوجرسی میں
 رہائش پذیر اور ایک نئی موبائل فون کمپنی سے بطور انجینیئر
 منسلک ہوں۔ ۲۰۰۵ء میں تعلیم کی غرض سے برطانیہ آیا اور
 ریڈ فورڈ یونیورسٹی اور لیڈز میجر یونیورسٹی میں
 زیر تعلیم رہا۔ موبائل اینڈ ڈسٹری بیوٹ کمیونٹی ورک
 میں ماسٹر کیا۔

ہمارا نیوجرسی سے گراچی تک کا سفر ۱۳ راتوں اور
 ۱۵ دن بعد تقریباً ۱۰ ہزار کلومیٹر طے کر کے اختتام پذیر
 ہوا۔ اس پورے عرصے میں میری اماں روزے رکھ کے
 اور مسئلے پر نوافل پڑھ پڑھ کر ہماری حفاظت کی دعائیں
 کرتی رہی۔ اخراجات کا تو ابھی تک ہم نے حساب نہیں
 لگایا، لیکن اندازاً ۸ لاکھ روپے خرچ ہوئے۔ یہ اخراجات

یورپ میں دروازوں اور ان کے پیچھے محسن کا کوئی رواج نہیں۔ گھر کا دروازہ کسی کمرے کی طرح ہی ہوتا ہے۔ شاید رومانیہ میں چوریاں ہوتی ہوں گی۔ کچھ آرام کے بعد براستہ بلغاریہ ترکی میں داخل ہوئے۔ اگر آپ پاکستانی پاسپورٹ رکھتے ہیں اور آپ کے پاس برطانیہ کا ویزا ہے تو آپ کو سرحد ہی پر ترکی کا ویزا مل جائے گا۔ ہمیں بھی ایک مبینہ کانگن انٹری گرانٹ ویزا ملا۔

ہونک میں رات کا قیام کیا اور اہل ناوردیکھا۔ اگلے روز میونخ پہنچے۔ اگلا سارا دن شہر میں گزارا، رات گزار دیجے ویانا پہنچے۔ اگلے دن وہاں سڑکوں پہ گھومتے رہے۔ پھر ویانا کا مشہور زمانہ دنیا کا سب سے قدیم چڑیا گھر دیکھا جو ۱۷۵۳ء میں قائم ہوا تھا۔ پھر شام کو وہانا سے ہنگری کے لیے نکلے۔ اب ہم یورپ کے اس حصے کی طرف جا رہے تھے، جو نسبتاً باقی یورپ سے کم ترقی یافتہ اور غریب ہے۔



www.paksociety.com

ترکی ایک عجیب ملک اور ترک عجیب ہی قوم ہے۔ ترکوں نے صدیوں تک شان سے آجی دیا یہ حکومت کی اور پھر صدی بھر تک یہ اپنی شناخت بھول گئے۔ اب آہستہ آہستہ ترکی بیدار ہو رہا ہے۔ اب ہم مسلم دنیا میں داخل ہو رہے تھے۔ استنبول جیسا سنا تھا، اس سے کہیں بڑھ کر پایا۔ اس کی ہر چیز آپ کو اپنی طرف ہٹتی ہے، لوگ، بول، رنگ، شور، ان، عمارتیں، مساجد اور ساحل، وہاں

ہنگری کے دارالحکومت بڈاپسٹ کے بارے میں سب سے اہم بات وہاں کے یہودی ہیں۔ اسی وجہ سے بڈاپسٹ کو ییز مکہ (Jews Mecca) یعنی یہودیوں کا مکہ بھی کہا جاتا ہے۔ بہر کیف ہنگری سے رومانیہ پہنچے۔ رومانیہ بھی غریب یورپی ملک ہے۔ وہاں ہم نے پاکستان کی طرح سڑکوں پر کتوں کی بہتات دیکھی۔ گھروں کے دروازے لوہے کے اور بڑے بڑے ہیں، ورنہ سارے

کزاری، جہاں ہمارا بلوچی طرز پر استقبال ہوا۔ بلوچی روٹی، چاول اور دہے کے گوشت سے تواضع کی گئی۔ ہمارے آنے کی اطلاع پر تقریباً سارا گاؤں ہمیں سلام کرنے آیا۔ بلوچوں کے ساتھ گزرے یہ دو دن ہمارے سارے دورے کے سب سے حوصلہ افزا اور محبت سے بھرپور دن تھے۔ مان گئے کہ اپنا ملک، تہذیب اور لوگ اتنے پُر خلوص ہیں کہ حد نہیں۔ صبح آٹھ بجے مستونگ سے نکلے تو شام چھ بجے کراچی پہنچے۔ راستے میں خضدار میں کھانے اور بیلے میں چائے پینے رکے۔ یوں جس سفر سے ہمیں خوف آ رہا تھا، وہی یادگار گزر رہا۔

یورپ میں حلال غذا کا بہت مسئلہ ہے، اسی لیے ہم اپنے ساتھ برطانیہ سے ایک ٹفٹے کا کھانا ساتھ لے کے گئے، جس میں ڈبا بند غذا (سفیجہ) ہے، لوبیا، ٹوٹل وغیرہ) شامل تھیں۔ سفر میں رہنمائی کے لیے ہم نے رہنما کتابچے خریدے، تاکہ راستہ بھٹک نہ سکیں۔ مگر یہ تمام صرف ترک سرحد تک چلتے ہیں، اس کے بعد ایران اور پاکستان سرحد پہ لگے نشانات ہی سے کام چلانا پڑتا ہے۔

ہم پاکستان کی بدقسمتی یہ ہے کہ ہمیں ہر جگہ شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ وہ عزت جو ہمیں ملنی چاہیے، اب نہیں ملتی۔ سب سے زیادہ دکھ اس بات کا ہوتا ہے، جب کوئی مسلمان آپ سے پاکستانی ہونے کے باعث اچھا برتاؤ نہ کرے۔ ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ جب آپ کسی مسلمان سے ملیں، جو حادثہ ۹/۱۱ کے بعد اسلام سے بددلی رکھتا ہے، تو وہ امریکہ کا ساتھ دینے پر طعنہ کرتا ہے۔ کبھی کوئی پاکستان کے حالات پر آپ کو انتہا پسند ہونے کا طعنہ دیتا ہے۔ سمجھ نہیں آتا، ہم کیا کریں؟ ایک طویل سفر کرنے کے بعد اگر میں تین جملوں میں راستے میں آنے والے ممالک کے بارے میں کوئی رائے دوں (جو کہ غلط بھی ہو سکتی ہے) دو یہ ہوگی "بہترین اخلاقیات برطانیہ پر فخر ہوتی ہیں، شہری شعور یورپ پر اور ترکی سے آگے یہ دونوں نظر نہیں آتے۔"

(برطانیہ سے کراچی تک۔ احتشام شاہ)

ہمیں لگا کہ واقعی کسی شہر میں آگے ہیں، ورنہ سارا یورپ ایک مٹھین کی طرح ہے۔ رات کو بھی ٹھکن کے باوجود شہر دیکھنے نکل پڑے۔ اگلا پورا دن ترکی کھومتے رہے، رات کو ہم انقرہ پہنچے۔ انقرہ اور استنبول میں فرق عمارات کا ہے۔ استنبول جدید اور قدیم کا امتزاج ہے جبکہ انقرہ کا مرکز شہر تو جدید ہے، مگر باقی شہر کچھ خاص نہیں۔ پھر ہم ترک ایرانی سرحدی شہر، ڈیگوبازٹ کی طرف نکلے۔ یہ چھوٹا سا گاؤں گرد و آلودی رکھتا ہے اور سطح سمندر سے تقریباً سولہ ہزار میٹر بلند ہے۔ سارا علاقہ نہایت وشنوار گزار، مگر خوبصورت ہے۔ ترکی کی حکومت کو شاہاں، جو اس نے ان وشنوار گزار علاقوں تک ایسی بہترین سڑکیں بنائی ہیں کہ وہی یورپ میں کہیں نہیں۔ ترکی سے باہر ہم کسی پریشانی کے بغیر نکل گئے۔

ایرانی سرحد کا حال کسی پاکستانی سرکاری ادارے سے مختلف نہیں تھا۔ کسی نے بھی ہماری مدد نہیں کی اور ہمیں یہ نہیں سمجھ آ رہا تھا کہ کیا کریں۔ بہر کیف ایران کی کرنسی بہت "کمزور" ہے۔ ہم نے سرحد پر ۲۱۰۰ ریور و تبدیل کمرائے تو اس کے ہمیں ۳۳ لاکھ ایرانی ریال ملے۔ ایران کی سڑکیں پاکستان جیسی ہی ہیں کم از کم تیرہ تک، اس لیے سفر بہت تکلیف دہ رہا۔ راستے میں پولیس والے نے روکا، کیونکہ ہماری گاڑی کی ایک ہیڈ لائٹ خراب تھی۔ جب اس کو پتا چلا کہ ہم سیاح ہیں، تو وہ رشوت کے پتھر میں آگیا۔ ایران میں موسم بھی گرم ملا اور یورپ جیسا سبزہ بھی نہیں رہا، اس لیے سفر واقعی تکلیف دہ تھا۔ ہم جیسے جیسے میرجاہ (سرحدی قصبے) کے قریب پہنچے، خوف اور خوشی دونوں محسوس ہوئے۔ خوشی اس بات کی کہ ہم نے اپنا سفر تقریباً مکمل کر لیا۔ خوف اس بات کا اب اصل خطرناک سفر شروع ہو رہا ہے۔ میرجاہ، ایرانی بلوچستان ہے، جہاں لوگ اردو بھی سمجھ لیتے ہیں۔ وہاں لوگ شلوار قمیض میں ملبوس نظر آتے۔

ایران سے پاکستان داخل ہوئے، تو خوش قسمتی سے نہایت آرام سے ایئر کونڈیشن ہوئی۔ ہم پھر والہدین، چافا، ریکوڈک سے گزرے۔ رات ہم نے مستونگ میں

قدیم غاروں والا شہر

میں مطلب ہے ”دیوتاؤں کا قلعہ“ گویا یہاں کی روایات کے مطابق کبھی ان مکانوں میں دیوتا رہتے تھے۔ یہ عجیب و غریب مکان زیر زمین اسی لیے بنائے گئے تھے تاکہ آسانی دیوتا دنیا کے لوگوں کے ہنگامے اور شور و غل سے بچ کر یہاں سکون سے رہیں۔

یہ قدیم اور طلسماتی شہر مشرقی چار جینا میں واقع ہے۔ زمانہ قدیم کے انسان نے چٹانوں کو کس طرح کاٹا اور انہیں کھوکھلا کر کے ان میں اپنے مسکن کس طرح بنائے، یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آتی۔ اس قدیم چٹانی شہر کو

یورپی چار جینا میں ایک ایسا قدیم شہر موجود ہے جس کے کیمین زیر زمین تراشے گئے پتھریلے غاروں میں رہتے تھے۔ یہ غار آج بھی موجود ہیں، مگر کافی ٹھنڈے ہو چکے۔ زمانے کے سرد و گرم نے ان غاری رہائش گاہوں کو کسی حد تک متاثر کیا ہے، مگر چار جینا کی حکومت نے ان کی مرمت کی اور تزئین و آرائش بھی کیونکہ یہ ان کی ثقافت کا ورثہ ہے۔ دنیا بھر کے سیاح ان غاروں کو بڑے شوق سے دیکھنے آتے ہیں۔ پتھریلے مکانات والے اس قدیم شہر کا نام اہلی سنگھی (Uplistsikhe) ہے جس کا مقامی زبان

ڈاٹ کام





الشيخ

It's a Family Choice



Phone No

92-53-3513039

3535853, 3533153

Fax: 92-53-3514435

شیخ الیکٹرک انڈسٹریز

سہیل انڈسٹریز اسٹیٹ گجرات، پاکستان

مرگ کے ذریعے جوڑا گیا۔ یہ راست بڑی مشکل اور محنت سے چٹانوں میں تراشا گیا اور قدیم طرز تعمیر کا شاہکار ہے۔ اس کی مرکزی شاہراہ سے تنگ گلیاں اور پتھر جلی سیزھیاں نکل رہی کہ مختلف گھر وں اور مکانوں تک جاتی ہیں۔ انہی گلیوں اور سیزھیوں کی وجہ سے یہ زیر زمین علاقہ آپس میں جڑا ہوا ہے۔

غاروں کی اکثریت کسی بھی قسم کی سجاوٹ اور آرائش سے محروم ہے، ویسے چند بڑے مکانات میں آرائشی نحرانیں ہیں اور سجاوٹ والی چھتیں بھی ہیں، ان میں پتھر کے ستونوں کو بڑی مہارت سے تراشا گیا۔ یوں مکانوں کا حسن دو بالا ہو گیا۔

۲۰۰۳ء میں اس غاری قصبہ کی حالت بہت خراب تھی۔ پرانی سڑک بہت خست حال ہو چکی تھی حالانکہ یہاں داخلہ مفت تھا، اس کے باوجود شاذ و نادر ہی کوئی سیاح وہاں نظر آتا۔ بعد میں اس کی تزئین و آرائش برقی قوتوں سے بہت توجہ دی گئی۔ ریسٹوراں اور بیت الخلا تعمیر کرائے گئے۔ سڑک کی مرمت کر کے اسے سفر کرنے کے قابل بنایا گیا۔ اب یہاں داخلے کی فیس بھی مقرر ہے۔

(غاروں والا شہر۔ مرزا مظہر بیگ)

دریائے منگورہ (Mitkvari) کے بائیں کنارے بلند چٹانی سلسلے پر تعمیر کیا گیا۔ اس میں متعدد گھر ایسے بھی ہیں جو ابتدائی فولادی زمانے کے ہیں۔ متعدد گھر عہد وسطی کے اثر سے متعلق رکھتے ہیں۔

یہ پورا چٹانی کمپلیکس انوکھے طرز تعمیر کا بہت ہی منفرد اور کیٹا امتزاج رکھتا ہے۔ ان میں اناطولیہ کا طرز تعمیر بھی دکھائی دیتا ہے اور بعض جگہ ایرانی (فارسی) طرز تعمیر کی جھلک نظر آتی ہے۔ ساتھ ساتھ قبائلی اور عیسائی طرز تعمیر کی جھلک بھی موجود ہے۔ وہ چٹان جس میں غار تراشے گئے، ریتلے پتھر سے بنی ہوئی ہے۔ اس مواد کو کٹا تراشا آسان ہے۔

یہ غاروں والا شہر چار جہا کی قدیم ترین آبادیوں میں سے ایک ہے۔ اسے پندرہویں صدی قبل مسیح میں بسایا گیا۔ اس کے بعد گزرتی صدیوں کے دوران شہر کی متعدد بار تعمیر نو کی گئی، پھر اسے ویران چھوڑ دیا گیا۔ جہاں یہ شکستگی کا شکار ہوتا رہا۔ لیکن پھر پارا سے کسی نہ کسی حد تک بحال کیا گیا۔ اب لگ بھگ وہ سو سال بعد یعنی جب اس پر حملوں اور اس کے محاصروں کا سلسلہ ختم ہوا، یہاں کوئی نہیں رہتا۔ جو لوگ یہاں رہتے تھے، وہ اس جگہ سے نیچے دریائے کوراک کی وادی میں جا کر آباد ہو گئے۔

اس شہر ویران کے غاری مکانوں پر مشتمل کمپلیکس تین حصوں میں تقسیم ہے۔ جنوبی (زیریں) درمیان (مرکزی) اور شمالی (بالائی) یہ لگ بھگ ۸ ہیکٹر رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ اس کا درمیانی حصہ سب سے بڑا ہے، جس میں چٹانوں میں تراشے گئے زیر زمین مکانات شامل ہیں۔ اس پورے کمپلیکس کو جنوبی حصے سے ایک تنگ درے اور طویل



ڈنمارک (بے مثال مناجاتی مملکت)

ڈنمارک دنیا کی معروف غلامی مملکت ہے۔ اس کے ذرائع آمدنی میں نہ فصل ہے نہ گیس بلکہ کمائی صرف دودھ، گوشت کی برآمد اور ٹیکسوں کے نظام سے ہوتی ہے لیکن اپنی آمدن جمہوری حکومت صرف اور صرف ملکی عوام کی فلاح و بہبود پر بلا امتیاز اسی طرح خرچ کرتی ہے، جس طرح حضرت عمر فاروقؓ خلیفہ دوم اسلامی مملکت کے دور میں عوام کی فلاح و بہبود کا م نظام اتنا معیاری تھا کہ خلیفہ وقت و کھیت تھا، کوئی بھوکا تو نہیں سوتا۔ ان کا یہاں تک کہنا تھا کہ اگر اسلامی ریاست میں دریائے و جلد کے کنارے ایک کتا بھی بھوک سے مر گیا تو اس کا ذمے دار خلیفہ وقت (حضرت عمر فاروقؓ) ہوگا۔ آج پاکستان میں کئی لوگ بھوک سے تنگ آ کر خودکشی کر چکے اور کرتے جا رہے ہیں۔ غربت کے مارے لوگ اپنے بچوں کو نہر

اسکند سے نیچا کے ۵۵ لاکھ آبادی والے ملک ڈنمارک نے دودھ و گوشت کی پیداوار کے ذریعے ایسی ترقی کی ہے جو ۸ کروڑ انفس پر مشتمل وطن عزیز پاکستان ۶۳ برس میں بھی نہیں کر سکا۔ اگر پاکستان میں بے عنوانی کے بے قایم جن کو پولس میں بند نہ کیا گیا، موجودہ اور سابقہ بے عنوان حکمرانوں کو نشانہ عبرت نہ بنایا گیا تو ہماری آئندہ ضلعیں سنوئی کی طرف تیزی سے گامزن رہیں گی اور آج جنہیں گھوڑی بہت خوراک یا بنیادی اشیائے ضروریہ دستیاب ہیں، ان کا بھی فقدان ہو جائے گا۔ ملکی خود مختاری



و سلامتی کے تحفظ کا حلف اٹھانے والی شخصیات غیر فوجی ہیں یا عسکری، اعلیٰ عدلیہ سے یا پارلیمان، ان تمام کو آج ہی بے عنوانی کے خاتمے کے عملی اقدامات اس طرح کرنے ہوں گے جس طرح ڈنمارک نے کیے جہاں بے عنوانی، لاقانونیت، خوراک میں ملاوٹ اور نا انصافی نام کو نہیں۔

بھی مغربی ملک سے کم نہیں۔ خوراک خالص ہے۔ خوراک، ادویات میں کوئی ملاوٹ کی جرأت نہیں کر سکتا کیونکہ قانون سخت ہیں۔ قانون کا ہر چھوٹے بڑے پر یکساں اطلاق ہوتا ہے۔ رات کے ۲ بجے ہوں، برہماری ہو رہی ہو اور ایک کی جی سرخ ہو تو کوئی اشارہ پار نہیں کرتا۔ ڈنمارک کے شہری حتیٰ کہ سائیکل سوار خواتین مرد بوڑھے بچے بھی سرخ جی پر رک جاتے اور سبز ہونے پر ہی چلتے ہیں۔

ڈنمارک کی دکانوں اور بڑے چھوٹے اسٹور پر تمام مصنوعات یورپی معیار کی ہیں۔ ملبوسات، جوتے، کھانے پینے کی اشیاء، خواتین کا سامان، آرائش و زیبائش، بچوں کے کھلونے، ادویات غرض ہر انسانی استعمال کی چیز طے شدہ معیار کی ہے۔ اسی بنا پر ڈنمارک کے لوگ ضرورت کی چیزیں منجلی خریدنے میں بھی خوشی و سکون محسوس کرتے ہیں۔ ایک عام شہری کی کم سے کم ماہانہ تنخواہ ۳ ہزار ڈالر ہے جو تقریباً ڈھائی لاکھ روپے جتنی ہے۔ ہر شہری کی جان و مال، گاڑی و مکان، دکان حتیٰ کہ کاروبار کی انشورنس ہوتی ہے۔ انشورنس کی رقم دعویٰ دائر ہونے کے تین چار یوم میں کمپنی ادا کرنے کی پابند ہے۔

ڈنمارک کے تمام شہریوں کو سستا اور فوری انصاف ملتا ہے۔ قانون ڈنمارک کے مقامی اور غیر ملکیوں کے لیے یکساں ہے، کسی شہری کو غیر ملکی پر ترجیح نہیں دی جاتی۔ اگر کسی کے ساتھ نا انصافی ہو تو وہ اپنے وکیل کے ذریعے عدالت میں استغاثہ دائر کرتا ہے۔ مقدمے کا فیصلہ پاکستان کی طرح برسوں نہیں بلکہ دو تین ہفتوں میں ہی ہو جاتا ہے۔ قتل، چوری، دیکھتی، راہزنی، خواتین کی آبروریزی وغیرہ کے جرائم نہ ہونے کے برابر ہیں۔ پولیس ثبوت طے بغیر کسی کو تھانے نہیں لے جاسکتی۔ ہاں اگر خوش ثبوت مل جائے تو پھر ملزم ڈنمارک کی سڑکوں پر نہیں گھوم سکتا۔ قتل کا مقدمہ اگر ثبوت کے ساتھ ہو تو ۶ ماہ کے اندر اندر اس کا فیصلہ کرنا لازمی ہے۔

(ڈنمارک میں لکھنؤ کا سربراہ نظام - حنیف خالد)

انڈیا انٹسٹ مارچ ۲۰۱۳ء کے ۸

میں پھینک رکھے ہیں۔ مگر ہمارے حکمرانوں کے کان پر جوں تک نہیں رہتی۔ وہ تو اپنی عیاشیوں میں مست ہیں اور ان کی ساری عیاشیاں غریب قوم کے ٹیکسوں سے بھرے خزانے سے پوری ہوتی ہیں۔ چونکہ پاکستان میں ٹیکس گزاروں کو ویسی سہولیات میسر نہیں جتنی ڈنمارک کی حکومت ہر ٹیکس گزار کو دیتی ہے، اسی لیے پاکستان میں لوگ پورا ٹیکس ادا نہیں کرتے۔ ٹیکس حکام بھی اپنی شاہانہ زندگی اور اپنے بچوں کی بیرون ملک تعلیم و رہائش کے اخراجات پورا کرنے کے لیے بدعنوانی میں بلا خوف و خطر مصروف ہیں۔

ڈنمارک میں پاکستانی برادری کے ایک سرگرم رکن طاہر حسین ۱۹۹۴ء سے وہاں مقیم ہیں۔ کوپن ہیگن میں ان کا ڈیپارٹمنٹل اسٹور ہے، انھوں نے ملاقات میں راقم کو بتایا کہ ڈنمارک جیسی فلاحی ریاست کی نظیر دنیا بھر میں نہیں ملتی۔ بلاشبہ ڈنمارک کی حکومت ہر برسر روزگار خاتون و مرد سے اس کی ماہانہ آمدنی کا ۲۸٪ سے ۶۰٪ فیصد بھجورت ٹیکس منہا کر لیتی ہے۔ مگر ہم ۳۳ ہزار کے لگ بھگ پاکستانی یہ خوشی ہر ماہ باقاعدگی سے ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ جب ڈنمارک میں کوئی ٹیکس گزار کسی وجہ سے بے روزگار ہو تو حکومت اسے اس کی آخری ماہانہ تنخواہ کے ۹۰٪ فیصد برابر رقم پہلے ۶ ماہ کے دوران ہر ماہ بذریعہ چیک اس کے گھر پہنچا دیتی ہے۔ ۶ ماہ بعد سوشل سیکورٹی ۹۰٪ کے بجائے ۸۰٪ فیصد کر دی جاتی ہے۔ یہ ۸۰٪ فیصد رقم اسے اس دن تک حکومت ادا کرتی ہے جب تک اسے ملازمت نہیں مل جاتی۔ چاہے اسے ۱۰ سال نہ ملے، حکومت اس بے روزگار شخص کو ۸۰٪ فیصد رقم دیتی ہے۔ ہر شہری کے بچوں کی تعلیم، کتابیں اور ٹرانسپورٹ مفت ہے۔ بیماری کی صورت میں بہترین ہسپتال میں علاج مفت ہے، چاہے علاج پر لاکھوں کراؤن (ڈنیشن کرنسی کراؤن پاکستانی ۱۶ روپے کے برابر) خرچ ہوں۔

ڈنمارک میں لوگوں کا معیار زندگی امریکہ سمیت کسی

شخصیت نامور

جن سے دنیا روشن

کرواض کاسے

یوٹرانسان



بیماری و غربت میں گرفتار
مضبوطیت زدہ لوگوں کو ہسارا
دینے نے بل گیشس کو
امریکی صدر سے بھی زیادہ
با اثر و مقبول ہستی بنا دیا

سید عامر محمود

۱۹۹۵ء

کا سال ۱۹۸۶ء سال امریکی
کھرب پتی بل ٹیکس کی زندگی
میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اسی
سال کے آغاز میں بل کی

شادی ہوئی۔ تب تک وہ ۹۵ وز کی تیاری جاری تھی جس
نے دنیا کے پیڈلور میں انقلاب برپا کر دیا تھا۔ یہی نہیں،
جلد ہی وائیکر و سافٹ کارپوریشن کی بدولت بل ٹیکس کا شمار
انتہائی دولت مند امریکیوں میں ہونے والا تھا۔

بل ٹیکس اور ان کی بیگم، میلینڈہ کی پرورش ناز و نعم سے
ہوئی تھی۔ انھیں زندگی کی ہر آسائش حاصل تھی اور انھوں
نے غربت و جہالت کا بھیا تک چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ بیاہ
کے بعد دونوں جینی مومن منانے کینیڈا گئے۔ وہاں
بل و میلینڈہ نے جنگلی جانوروں کا شکار کیا اور شیروں کو
ہرنوں کا شکار کرتے دیکھا۔ لیکن کینیڈا ہی میں پہلی بار ان کا
پالا غربت سے پڑا۔

انھوں نے دیکھا کہ افریقی مرد سارا دن کام کر کے
یہ اس قابل ہوتے ہیں کہ گھریلو اخراجات برواٹ کر
سکیں۔ ان کی بیویاں بھی سارا دن کام کرتی ہیں۔ اس کے
باوجود پیشتر افریقی گھروں میں بھوک اور بیماریوں نے
ذمے ڈال رکھے ہیں۔ کئی بچے باشعور بھی نہیں ہوتے کہ
کسی بیماری کے ہاتھوں چل بسے ہیں۔ ان تکلیف دہ مناظر
نے امریکی دولت مندوں کو خامی حد تک جھنجھوڑ ڈالا۔

وہ واپس امریکہ پہنچے تو چند ہی ماہ بعد بل کی والدہ
چل بسیں۔ وہ ایک مخیر اور دلچسپ لوگوں کی ہمدرد خاتون
تھیں۔ انھوں نے شادی کے دن اپنی ہونے والی بیوہ کو بتایا
تھا "جن انسانوں کو زیادہ (دولت) ملے، انہی سے
(دینے کی) توقع بھی زیادہ ہوتی ہے۔"

مصلحتی تنظیم کا قیام

جیتی بیوی کی وفات نے بل کے والد، بل سینئر پر
گہرے اثرات مرتب کیے۔ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ
آخر انسان کو زندگی کیوں ملتی ہے؟ سوچ بچار کے بعد

۹۰ اڈواڈجسٹ مارچ ۲۰۱۳ء

انھوں نے یہ فیصلہ اخذ کیا کہ حیات انسان کا بنیادی مقصد یہ
ہونا چاہیے کہ وہ کبھی انسانیت کی ہر ممکن خدمت کرے۔
اسی فکر کے زیر اثر بل سینئر نے پھر بیٹے پر زور دیا کہ وہ
ایک فلاحی تنظیم قائم کر کے اپنی آمدن کا مخصوص حصہ اس
کے لیے مخصوص کر دے۔ بل ٹیکس بھی والدہ کی موت سے
افسردہ تھے۔ پھر افریقہ میں غربت کے مناظر بھی دل میں
شبث تھے۔ یوں انھوں نے سال کے آخر میں اپنی فلاحی
تنظیم، بل اینڈ ٹیکس فاؤنڈیشن قائم کر دی۔

سترہ برس بہت چکے اچکے اور یہ فاؤنڈیشن آج دنیا کی
سب سے بڑی غیر سرکاری فلاحی تنظیم بن چکی۔ یہی نہیں،
بل ٹیکس میں بھی انقلابی تبدیلیاں رونما ہو چکی، جن کی
داستان بڑی سبق آموز اور دلچسپ ہے۔ یہ انہی انقلابی
تبدیلیوں کا نتیجہ ہے کہ آج بل ٹیکس دنیا کی سب سے
طاقتور بستی بن چکے۔ یہ اعزاز انھیں مشہور امریکی رسالے،
فوربس نے دیا ہے۔ یہ رسالہ مختلف پیمانے مقرر کر کے ہر
شعبے کی بہترین شخصیات کا انتخاب کرتا ہے۔ حال ہی میں
دنیا کی طاقتور ترین شخصیات کی فہرست میں بل ٹیکس سب
سے اوپر آئے۔ دنیا کی اگلی سپر پاور، امریکہ کے صدر
اور چینی دروی حکمرانوں کا نمبر بھی ان کے بعد آیا۔

شاید آپ سوچیں کہ بے پناہ دولت نے بل کو یہ رتبہ
عطا کیا۔ جی نہیں، انسانیت کی خدمت اور غریبوں کے
لیے جذبہ ہمدردی نے انھیں یہ مقام دلایا۔ دراصل
بحیثیت کاروباری انھیں جو دولت، اثر و سوغ، عزت اور
شہرت حاصل تھی، فلاح و بہبود کی سرگرمیوں نے ان کو
دو چھ کر دیا۔ چنانچہ آج بل ٹیکس خصوصاً کبھی
دولت مندوں کے لیے مشعل راہ بن چکے۔ ان کی حیات
یہ حقیقت عیاں کرتی ہے کہ دنیا کے امرا کو کس طرح اپنی
دولت خرچ کرنی چاہیے تاکہ وہ دین و دنیا میں نام کمائیں۔

تبدیلی کا آغاز

۱۹۹۳ء میں جب بل فلاحی سرگرمیوں کی طرف
آئے، تو وہ مشہور برطانوی مفکر، تھامس ہاٹکس کے اس

انقلاب کا آغاز

مل گئیں چاہتے، تو اربوں ڈالر ملتی تھیں کو دے ڈالتے تاکہ وہ بچوں کو ادویہ و ویکسین فراہم کر سکیں لیکن مل و ملینڈ نے ان کو اس کام میں دلچسپی لی۔ پھر خصوصاً شعبہ ویکسین میں انقلابی اور جدید تہذیبیاں لے آئے۔ وجہ یہ ہے کہ اس زمانے میں غلط فہمیوں کی بنا پر یہ نظریہ پھیل گیا کہ ویکسین بچوں میں مختلف بیماریاں مثلاً آئزم پیدا کرتی ہیں۔ لہذا تمام بڑی ادویہ ساز کمپنیاں ویکسین بنا کر اپنی رقم برباد کرنے پر آمادہ نہ تھیں۔

یہ مسئلہ حل کرنے کے لیے مل نے سوچا کہ ایک طرف تو سائنس دان غلطی ویکسین تیار کریں، دوسری سمت ادویہ ساز کمپنیوں کو غلطی منڈیاں دی جائیں، تاکہ وہ ویکسین بنانے کی طرف متوجہ ہوں۔ اس منصوبے پر عمل کے لیے زر کثیر خرچہ چاہیے تھا، چنانچہ ۱۹۹۹ء میں مل نے اپنی دولت میں سے ۲۱ مارب ڈالر (۱۸۹۰ مارب روپے) مل اینڈ ملینڈ ویکسین فاؤنڈیشن کے حوالے کر دیے۔ اس سرمائے سے نئی ویکسین ایجاد کرائی گئیں، پھر ادویہ ساز کمپنیوں سے انھیں بخانا اور خرید کر غریب ممالک میں تقسیم کیا گیا۔ یوں بین الاقوامی سطح پر بذریعہ ویکسین بچوں کی جانیں بچانے والا انتہائی موثر نظام سامنے آ گیا۔ یہ کامیابی ایک فرد واحد کے جذبہ خدمت کی بدولت ہی رونما ہوئی۔

آئی مل گئیں کا وضع کردہ ویکسین پروگرام ہر سال دنیا بھر میں "۲۵ کروڑ" بچوں کو مختلف ویکسین مہیا کرتا ہے۔ اس پروگرام میں ترقی یافتہ ممالک بھی شامل ہو چکے اور وہ اسے سالانہ کروڑوں ڈالر کی امداد دیتے ہیں۔ یہ پروگرام اب "گیو ایف ایس" کے نام سے مشہور ہے۔

۲۰۰۱ء سے اب تک گیو ایف ایس پاکستانی حکومت کے ویکسین پروگرام کو ۳۰ کروڑ ڈالر (۲۷ مارب روپے) کی امداد دے چکا ہے۔ یوں ممکن ہوا کہ لاکھوں پاکستانی بچوں کو بیماریوں مثلاً شخروہ، کالی کھانسی، زرد بخار، پولیو،

نظریے پر یقین رکھتے تھے کہ غربت، پیہ و دکاری، بھوک، جہالت وغیرہ زیادہ آبادی کی پیداوار ہیں۔ چونکہ وسائل محدود ہیں، لہذا آبادی ہمیشہ مصیبت لاتی ہے۔ چنانچہ مل کو یقین تھا کہ ویکسین بنانے کا کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ جن بچوں یا انسانوں کی جانیں بچی، وہ آخر کار کرکڑ ارض پر بوجھ بنی ثابت ہوں گے۔

اسی سوچ کے باعث مل نے اقوام متحدہ کو ۱۰ ارب روڑ ڈالر دیے تاکہ اس کی ایجنسیاں غریب ممالک میں صحت کو ترقی کے طریقے متعارف کرائیں۔

ملی سائنس نے دوسرا محاذ امریکی روایتی طریقہ تعلیم کے خلاف کھولا۔ مل کا خیال تھا کہ جس جماعت میں کم بچے ہوں، استاد کو موقع ملے گا کہ ان پر بھرپور توجہ دے۔ لہذا انھوں نے ایک ارب ڈالر لاگت سے اصلاحات کا منصوبہ شروع کیا۔ لیکن اس کے بعد محققوں نے مل کو باور کرایا کہ جماعت کے چھوٹے یا بڑے ہونے سے طالب علم کی کارکردگی پر زیادہ اثر نہیں پڑتا۔ اصل بات یہ ہے کہ استاد کو تعلیم یافتہ بچے کا رادہ اپنی ذمہ داری سے غفلت ہونا چاہیے۔

مل کی ایک خوبی یہ ہے کہ ان کا کوئی نظریہ یا خیال غلط ثابت ہو، تو وہ اس کی درستی پر ضد نہیں کرتے، بلکہ رادہ بدل لیتے ہیں۔ چنانچہ مل نے کروڑوں ڈالر خرچنے کے بعد اسے تعلیمی منصوبے کا رخ بدلا اور استاد کی تعلیم و تربیت پر توجہ مرکوز کر دی۔

صحت کا منصوبہ بھی اسی تہذیبی سے متاثرہ تحقیق سے معلوم ہوا کہ خصوصاً ترقی پذیر ممالک میں والدین اس لیے زیادہ بچے پیدا کرتے ہیں کہ انھیں علم ملے، نئی بیماریوں کے باقوں چل بسیں گے۔ لہذا مل نے صحت کے تمام منصوبوں کو صحت معکوس دے دی، اب وہ بچوں کی پیدائش روکنے کے بجائے ان کی جانیں بچانے پر مرکوز ہو گئے۔ یہ ۱۹۹۸ء کی بات ہے اور اسی لمحے مل نے فیصلہ کیا کہ وہ ویکسین خرید کر غریب ممالک کو مفت یا سستے داموں فراہم کریں گے۔

اپنے گیس کا بل گھٹائیں



گیزر کا تھر مواسٹیٹ WARM پر رکھیں

گیزر چوٹے کے مقابلے میں 4 گنا زیادہ توانائی استعمال کرتا ہے۔ گیزر کے مختار استعمال سے اور سرمو موسم میں اسے دوام پر رکھ کر آپ اپنے گیس کے بل میں سے ایک بڑی رقم بچا سکتے ہیں۔

- گیزر کو مستقل WARM پر رکھیں، صرف استعمال سے 15 منٹ قبل VERY HOT پر منت کریں اور استعمال کے بعد واپس WARM پر لے آئیں۔
- اگر 24 گھنٹے سے زائد دودھری گیلے گھر سے باہر جائیں تو گیزر بند کر دیں۔
- موسم سرما کی آمد سے قبل اپنے گیزر کو باقاعدہ چیک کروائیں، انکی سرس اور مرمت کروائیں۔
- گیس کی تمام مصنوعات کی یا قاعدگی سے سرویس کروائیں۔
- ہمیشہ اچھی کوآئی کے گیس آلات اور فیکٹر استعمال کریں جو پاکستان اسٹینڈرڈ اینڈ کوآئی کنٹرول اتھارٹی (PSQCA) کے متعین کردہ معیار کے مطابق ہوں۔
- اس بات کا ہمہ پراطمینان کر لیں کہ گیس کی تمام مصنوعات اور ان کی فیکٹوری میں کہیں بھیج نہ ہو۔

مندرجہ بالا راہنما بایات پر عمل کریں اور گیس کا بل گھٹائیں۔

بل گیسٹس بمقابلہ سیو حبابز

اکتوبر ۲۰۱۱ء میں جب پرنس کمپیوٹر کے ہاتھوں میں شامل امریکی موجد، سیو حبابز رخصت ہوا، تو ذرائع ابلاغ کے کئی پتہ توں اور ماہرین ٹیکنالوجی نے اسے نئی نسل کے سامنے بحیثیت "رول ماڈل" پیش کیا۔ اس آمر پر امریکہ میں زبردست بحث چھڑ گئی۔

اخلاقیات و انسانیات کے ماہرین نے امریکی عوام کو باور کرایا کہ بحیثیت موجد، یقیناً سیو حبابز نے نئی نوع انسان کو قائم و پایا، لیکن جب وہ اپنی کمپنی کا مالک بن بیٹھا، تو زیادہ سے زیادہ چپا کمانا ہی اس کا مسلح خطر بن گیا۔ اس نے پھر کمپنی کی ترقی کے لیے ہر جائز و ناجائز راست اختیار کیا اور وہ اخلاقی و انسانی بنیادوں پر کس قدر شخصیت کا مالک بن گیا۔

مزید برآں ستمبر ۲۰۰۳ء اور ۲۰۰۸ء کی مالی و اقتصادی دولت رکھتا تھا۔ نیز اس کی کمپنی ۷۷ مارب ڈالر مالیت کی تھی۔ لہذا وہ امیر ترین امریکیوں میں شامل تھا۔ لیکن اس نے زندگی بھر غریبوں کی فلاح و بہبود کا ایک منصوبہ نہیں بنایا حتیٰ کہ وہ فلاحی تنظیموں کو چندہ بھی نہ دیتا لیکن اس نے عمر بھر یعنی دولت کمائی، وہ دنیا میں ہی دوسروں کے لیے چھوڑ گیا۔

لیکن دیناے کمپیوٹر کی ایک اور معروف ہستی، بل گیسٹس اس سے بالکل مختلف ثابت ہوئی۔ بل نے بھی اپنی مالیکورسافت کمپنی کے ذریعے بے شمار دولت کمائی۔ ممکن ہے کہ کچھ جائز و ناجائز طریقے بھی اپنانے میں لیکن اب وہ دنیا کو بہت کچھ لوٹا بھی رہے بلکہ اپنی ساری دولت فلاحی مرکزوں کے واسطے وقف کر چکے ہیں۔ گو دنیاوی لحاظ سے یہ خسارے کا سودا ہے۔ چنانچہ اخلاقیات و مذاہب کے امریکی ماہرین اپنی نئی نسل کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ مادہ پرستی اور سرمایہ داری کے نمائندے سیو حبابز نہیں بل گیسٹس کو رول ماڈل بنائیں جو اپنی دولت و طاقت کے ذریعے دنیا سے بیماری، غربت اور جہالت مٹانا چاہتے ہیں۔



ہوں۔ لیکن انہوں نے تعلیم کے ساتھ آرام و زندگی بیچ دی۔ اب وہ دنیا بھر میں گھومتے اور غریبوں کے دکھ درد دور کرنے کا سامان کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے:

”اب میری سب سے بڑی خواہش یہی ہے کہ دُنیا بھر میں شرح اموات ۸۰ فیصد تک کم کر دوں۔ اگر میں اور میری ٹیم یہ منزل نہ پاسکے تو ہمیں صدمہ ہوگا کیونکہ اس کا مطلب یہی ہوگا کہ ہم نے اپنا کام صحیح طرح انجام نہیں دیا۔“

زندگی کا مقصد والدین عموماً ساری عمر جائز و ناجائز طریقوں سے اس لیے کماتے ہیں کہ اپنے بچوں کی خاطر بہت کچھ چھوڑ جائیں۔ لیکن بل ٹینس کا مقصد حیات کچھ اور ہی ہے۔ اب وہی انسانیت کی خدمت کرنا ان کا مشن بن چکا اور وہ اپنی ساری دولت اسی کام کے لیے وقف کرنا چاہتے ہیں۔

بل اور میلنڈہ کے ۳ بچے ہیں۔ ۱۵ سالہ جینیفر، ۱۴ سالہ اوری اور ۹ سالہ فوب۔ بل کا کہنا ہے کہ ان کی وراثت سے ہر بچے کو ایک کروڑ ڈالر (۹۰ کروڑ روپے)

مہوینا، دست، طیارہ وغیرہ سے محفوظ رکھا جاسکے۔ اس کامیابی میں اہم ترین کردار بل ٹینس ہی کا ہے۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ ۲۰۰۱ء تا ۲۰۱۱ء کی وائی ایس نے بھارتی حکومت کو صرف ساڑھے چار کروڑ ڈالر کی امداد دی۔ حالانکہ وہاں بھی کروڑوں غریب بچے موجود ہیں۔ شاید بل ٹینس نے بھارتی حکومت کو اس لیے گلاس نہیں ڈالی کہ وہ غیر ملکی امداد کا بیشتر حصہ اسلحہ خریدنے میں لگا دیتی ہے۔ بل اور میلنڈہ ٹینس فاؤنڈیشن کے انسانی اقدامات کا ایک نتیجہ یہ نکالا کہ پچھلے ۱۰ برس میں ویکسین کی قیمت بہت کم ہوئی۔ مثلاً ۵۷ عام بچگانہ امراض (بشمول خناق، بھنج اور کالی کھانسی) کی ویکسین کی قیمت ۳۰ فیصد کم ہوئی۔ ہیپاٹائٹس بی کی ویکسین کی قیمت تو ۶۸ فیصد کم ہوئی۔ یوں ممکن ہو گیا کہ زیادہ سے زیادہ غریب بچوں کو فائدہ پہنچے۔

بل ٹینس کا شمار انسانی تاریخ میں تعلیم ترین کاروباری دماغ رکھنے والوں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی غیر معمولی ذہنی صلاحیتوں کے باعث نئی ٹیکنالوجیاں کھلیں اور دنیائے کمپیوٹر میں انقلاب لے آئے۔ اب وہ اپنی صلاحیتوں سے کام لے کر انسانیت کو درپیش مشکلات ختم کرنے کی سعی میں ہیں۔ بل اور میلنڈہ کا عزم ہے کہ وہ اپنے سرمائے و طاقت سے دنیا بدل کر رہیں گے۔

دنیا بدلنے کا عزم

بل ٹینس نے اپنی دولت و اثر و رسوخ کے ذریعے بھاریوں کے خلاف اعلانِ جہاد کر رکھا ہے۔ وہ ۲۰۰۸ء میں مائیکروسافٹ کارپوریشن سے علیحدہ ہو گئے تاکہ اپنا پورا وقت انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے وقف کرسکیں۔ ان کے نزدیک کامیابی کا معیار اب زیادہ سے زیادہ دولت مند ہونا نہیں بلکہ یہ ہے کہ وہ کتنے بچوں اور انسانوں کو مرنے یا معذور ہونے سے بچاتے ہیں۔

واضح رہے، ۵۶ سالہ بل ابھی اتنے بوڑھے نہیں ہوئے کہ موت کے مناظر انہیں خوفزدہ کر دیں بلکہ وہ چاہیں تو آسائشِ دنیا سے بھرپور انداز میں لطف اندوز

انسانی جانیں بچانے کا سوال

دنیا میں بل ٹیکس کے مخالفوں کی کمی نہیں۔ بعض انھیں روایتی امیر سمجھ کر نفرت کرتے ہیں۔ غریب ممالک کے سوشلسٹ اور مذہبی رہنما ان کو سرمایہ دار مغرب کا نمائندہ سمجھتے ہیں۔ تاہم بل اس مخالفت کے باوجود اپنا کام کیے جا رہے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ آمروں اور جرنیلوں سے بھی ملتے ہیں تاکہ ان کے ملکوں میں اپنے غریب دوست منصوبے شروع کرا سکیں۔ چنانچہ جمہوریت پسند مغربی ذرائع ابلاغ انھیں تنہید کا نشانہ بناتے ہیں۔ گویا بل ٹیکس کا یہ حال ہے کہ پرانے ہیں ناراض تو اپنے بھی ناخوش۔

بل کو سراہنے والے بھی بے شمار ہیں مثلاً مشہور ادویہ ساز کمپنی، نووارٹس میں شعبہ تحقیق کے سربراہ اور ممتاز طبی سائنس دان، ڈاکٹر اینڈریو اوسوالڈ کا کہنا ہے ”بل ایسی طاقتور ہستی ثابت ہوئے کہ تنہا اپنی کوششوں سے انھوں نے کروڑوں غریب بچوں کو مرنے سے بچالیا۔“ تاہم بل ٹیکس اپنی تعریف پر پھولے نہیں سماتے۔ ان کا کہنا ہے کہ انھیں کامیابی اسی لیے ملی کہ ماہرین نے لیبارٹریوں میں جان فشانی سے کام کرتے ہوئے نئی ویکسین تیار کیں۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ اگر بل اربوں ڈالر فراہم نہ کرتے تو انتہائی منظم ویکسین پروگرام عمل میں آنا تقریباً ناممکن تھا۔

پچھلے دنوں بل ہارورڈ یونیورسٹی، امریکہ میں طلبہ و طالبات سے خطاب کرتے تھے۔ اس موقع پر ایک طالب علم نے ان سے سوال کیا ”آپ اپنی کس اختراع کو اولیت دیتے ہیں..... مائیکروسافٹ ونڈوز کو یا ویکسین کے منصوبے کو؟“

انھوں نے کہا ”کمپیوٹر سافٹ ویئر پروگراموں کی اہمیت اپنی جگہ، لیکن جہاں تک انسانی جانیں بچانے کا سوال ہے، اس اعتبار سے یقیناً ویکسین ہی کو برتری حاصل ہے۔“ اور یہ بات سولہ آنے درست ہے۔



میں گے۔ یہ رقم معمولی نہیں مگر بل کی بے حساب دولت دیکھتے ہوئے یہ موقع چھٹی ہی لگتی ہے۔ یاد رہے، بل فی الوقت ۵۳ مارب ڈالر کی دولت و جائیداد رکھتے اور دنیا کے دوسرے امیر ترین انسان ہیں۔ تاہم وہ ۱۹۹۴ء سے اب تک ۲۴ مارب ڈالر اپنی فاؤنڈیشن کو دے چکے ہیں۔ اگر یہ رقم بھی ان کے پاس ہوتی تو یقیناً میکسیکین کاروباری، کارلوں سلیم (۴۰ مارب ڈالر) سے زیادہ دولت مند ہوتے۔



بل ٹیکس کہتے ہیں کہ وہ اپنے بچوں سے از حد محبت کرتے ہیں چنانچہ انھیں دنیا جہاں کی سہولتیں حاصل ہیں۔ وہ کروڑوں بچوں سے بہتر زندگی گزار رہے ہیں مگر یہ ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی محنت و ذہانت کے بل بوتے پر کامیاب ہوں۔ اسی خیال کے تحت بل اپنی ساری دولت اکٹھی نہیں دینا چاہتے۔

واضح رہے، بل و میلانہ وینس فاؤنڈیشن ۳ مارب ڈالر (۳۲۵۶ مارب روپے) کے اثاثے رکھتی ہے۔ اس حساب سے وہ دنیا کی سب سے بڑی غیر سرکاری خدائی تنظیم ہے۔ یہ تنظیم ۱۹۹۴ء سے اب تک فروغ تعلیم، غربت مٹاؤ اور انسانی صحت کے منصوبوں پر ۲۵ مارب ڈالر (۲۲۰۰ مارب روپے) خرچ کر چکی۔ اتنی بڑی رقم سے اندازہ لگانا ممکن ہے کہ تنظیم کتنے بڑے پیمانے پر افریقا، ایشیا اور لاطینی امریکا کے غریب ممالک میں سرگرم عمل ہے۔

تخلیق کا ایک منفرد انداز



اب منزل ہے آسان



SM70



150 14007



Downloaded from <http://ajphaphysiol.physiology.org/> by guest on September 11, 2015

Ph.D. at U.S. Naval Academy.
Dr. T. Mark Gendron is a Professor
of Management Science at the University of
Illinois at Urbana-Champaign. His research
interests are in the areas of supply chain
management, operations management, and
logistics management.

تخلیق کا الگ منفرد انداز

2254



Andersson, P.

11



Figure 10



Chemical Synthesis

Overall Length	1.202m
Overall Width	0.60m
Overall Height	0.60m
Overall Mass	12.9kg
Overall Clearance	1.00m
Platform Type	Standard
Model	Orion
Asset Type	0.25-1.4m
Riser Type	0.25-1.4m
Barriers	10m x 10m
Base / Deck Capacity	0.1-0.5m
Access	0.1-0.5m

along with many

1. *...*
 2. *...*
 3. *...*
 4. *...*
 5. *...*
 6. *...*
 7. *...*
 8. *...*
 9. *...*
 10. *...*

Extension Systems/Institutions

Type	Single-Emitter, 4-Socket
Bridge System	11-99-0
Phase Compensation	100%
Compensated Input	0.1 p
Resistor	100 kΩ
Switching System	4-4, 4-4
Max. Power	1.0 W (100 W)
Max. Temp.	2.5, 100 W (100 W)
Output	100 W (100 W)
Temperature	0.5 W (100 W)

100%

1. $\frac{1}{2}$
2. $\frac{1}{3}$
3. $\frac{1}{4}$
4. $\frac{1}{5}$
5. $\frac{1}{6}$
6. $\frac{1}{7}$
7. $\frac{1}{8}$
8. $\frac{1}{9}$
9. $\frac{1}{10}$
10. $\frac{1}{11}$
11. $\frac{1}{12}$
12. $\frac{1}{13}$
13. $\frac{1}{14}$
14. $\frac{1}{15}$
15. $\frac{1}{16}$
16. $\frac{1}{17}$
17. $\frac{1}{18}$
18. $\frac{1}{19}$
19. $\frac{1}{20}$
20. $\frac{1}{21}$
21. $\frac{1}{22}$
22. $\frac{1}{23}$
23. $\frac{1}{24}$
24. $\frac{1}{25}$
25. $\frac{1}{26}$
26. $\frac{1}{27}$
27. $\frac{1}{28}$
28. $\frac{1}{29}$
29. $\frac{1}{30}$
30. $\frac{1}{31}$
31. $\frac{1}{32}$
32. $\frac{1}{33}$
33. $\frac{1}{34}$
34. $\frac{1}{35}$
35. $\frac{1}{36}$
36. $\frac{1}{37}$
37. $\frac{1}{38}$
38. $\frac{1}{39}$
39. $\frac{1}{40}$
40. $\frac{1}{41}$
41. $\frac{1}{42}$
42. $\frac{1}{43}$
43. $\frac{1}{44}$
44. $\frac{1}{45}$
45. $\frac{1}{46}$
46. $\frac{1}{47}$
47. $\frac{1}{48}$
48. $\frac{1}{49}$
49. $\frac{1}{50}$
50. $\frac{1}{51}$
51. $\frac{1}{52}$
52. $\frac{1}{53}$
53. $\frac{1}{54}$
54. $\frac{1}{55}$
55. $\frac{1}{56}$
56. $\frac{1}{57}$
57. $\frac{1}{58}$
58. $\frac{1}{59}$
59. $\frac{1}{60}$
60. $\frac{1}{61}$
61. $\frac{1}{62}$
62. $\frac{1}{63}$
63. $\frac{1}{64}$
64. $\frac{1}{65}$
65. $\frac{1}{66}$
66. $\frac{1}{67}$
67. $\frac{1}{68}$
68. $\frac{1}{69}$
69. $\frac{1}{70}$
70. $\frac{1}{71}$
71. $\frac{1}{72}$
72. $\frac{1}{73}$
73. $\frac{1}{74}$
74. $\frac{1}{75}$
75. $\frac{1}{76}$
76. $\frac{1}{77}$
77. $\frac{1}{78}$
78. $\frac{1}{79}$
79. $\frac{1}{80}$
80. $\frac{1}{81}$
81. $\frac{1}{82}$
82. $\frac{1}{83}$
83. $\frac{1}{84}$
84. $\frac{1}{85}$
85. $\frac{1}{86}$
86. $\frac{1}{87}$
87. $\frac{1}{88}$
88. $\frac{1}{89}$
89. $\frac{1}{90}$
90. $\frac{1}{91}$
91. $\frac{1}{92}$
92. $\frac{1}{93}$
93. $\frac{1}{94}$
94. $\frac{1}{95}$
95. $\frac{1}{96}$
96. $\frac{1}{97}$
97. $\frac{1}{98}$
98. $\frac{1}{99}$
99. $\frac{1}{100}$
100. $\frac{1}{101}$
101. $\frac{1}{102}$
102. $\frac{1}{103}$
103. $\frac{1}{104}$
104. $\frac{1}{105}$
105. $\frac{1}{106}$
106. $\frac{1}{107}$
107. $\frac{1}{108}$
108. $\frac{1}{109}$
109. $\frac{1}{110}$
110. $\frac{1}{111}$
111. $\frac{1}{112}$
112. $\frac{1}{113}$
113. $\frac{1}{114}$
114. $\frac{1}{115}$
115. $\frac{1}{116}$
116. $\frac{1}{117}$
117. $\frac{1}{118}$
118. $\frac{1}{119}$
119. $\frac{1}{120}$
120. $\frac{1}{121}$
121. $\frac{1}{122}$
122. $\frac{1}{123}$
123. $\frac{1}{124}$
124. $\frac{1}{125}$
125. $\frac{1}{126}$
126. $\frac{1}{127}$
127. $\frac{1}{128}$
128. $\frac{1}{129}$
129. $\frac{1}{130}$
130. $\frac{1}{131}$
131. $\frac{1}{132}$
132. $\frac{1}{133}$
133. $\frac{1}{134}$
134. $\frac{1}{135}$
135. $\frac{1}{136}$
136. $\frac{1}{137}$
137. $\frac{1}{138}$
138. $\frac{1}{139}$
139. $\frac{1}{140}$
140. $\frac{1}{141}$
141. $\frac{1}{142}$
142. $\frac{1}{143}$
143. $\frac{1}{144}$
144. $\frac{1}{145}$
145. $\frac{1}{146}$
146. $\frac{1}{147}$
147. $\frac{1}{148}$
148. $\frac{1}{149}$
149. $\frac{1}{150}$
150. $\frac{1}{151}$
151. $\frac{1}{152}$
152. $\frac{1}{153}$
153. $\frac{1}{154}$
154. $\frac{1}{155}$
155. $\frac{1}{156}$
156. $\frac{1}{157}$
157. $\frac{1}{158}$
158. $\frac{1}{159}$
159. $\frac{1}{160}$
160. $\frac{1}{161}$
161. $\frac{1}{162}$
162. $\frac{1}{163}$
163. $\frac{1}{164}$
164. $\frac{1}{165}$
165. $\frac{1}{166}$
166. $\frac{1}{167}$
167. $\frac{1}{168}$
168. $\frac{1}{169}$
169. $\frac{1}{170}$
170. $\frac{1}{171}$
171. $\frac{1}{172}$
172. $\frac{1}{173}$
173. $\frac{1}{174}$
174. $\frac{1}{175}$
175. $\frac{1}{176}$
176. $\frac{1}{177}$
177. $\frac{1}{178}$
178. $\frac{1}{179}$
179. $\frac{1}{180}$
180. $\frac{1}{181}$
181. $\frac{1}{182}$
182. $\frac{1}{183}$
183. $\frac{1}{184}$
184. $\frac{1}{185}$
185. $\frac{1}{186}$
186. $\frac{1}{187}$
187. $\frac{1}{188}$
188. $\frac{1}{189}$
189. $\frac{1}{190}$
190. $\frac{1}{191}$
191. $\frac{1}{192}$
192. $\frac{1}{193}$
193. $\frac{1}{194}$
194. $\frac{1}{195}$
195. $\frac{1}{196}$
196. $\frac{1}{197}$
197. $\frac{1}{198}$
198. $\frac{1}{199}$
199. $\frac{1}{200}$
200. $\frac{1}{201}$
201. $\frac{1}{202}$
202. $\frac{1}{203}$
203. $\frac{1}{204}$
204. $\frac{1}{205}$
205. $\frac{1}{206}$
206. $\frac{1}{207}$
207. $\frac{1}{208}$
208. $\frac{1}{209}$
209. $\frac{1}{210}$
210. $\frac{1}{211}$
211. $\frac{1}{212}$
212. $\frac{1}{213}$
213. $\frac{1}{214}$
214. $\frac{1}{215}$
215. $\frac{1}{216}$
216. $\frac{1}{217}$
217. $\frac{1}{218}$
218. $\frac{1}{219}$
219. $\frac{1}{220}$
220. $\frac{1}{221}$
221. $\frac{1}{222}$
222. $\frac{1}{223}$
223. $\frac{1}{224}$
224. $\frac{1}{225}$
225. $\frac{1}{226}$
226. $\frac{1}{227}$
227. $\frac{1}{228$

جس پر عبدیدر

زندگی کے ان گنت انوکھے رنگوں
میں کے چند دل بھادیئے والے رنگ

اقصی فاطمہ



رہے۔ تم نے کل صاف سترے کپڑے پہنے ہیں۔ اماں
تاہو نے تھانیدار سے ہاتھ باندھ کر عرض کی "حضور مجھ
سے انگریز سرکار کی شان میں کون سی خطا ہو گئی؟" اسے
بتایا گیا کہ تم سے کوئی خطا نہیں ہوئی بلکہ انگریز حکومت خود
چل کر تمہارے پاس اس لیے آ رہی ہے کہ تم جرمن اور
جاپانی فوجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے یہاں کے لوگوں کو
انگریزی فوج میں بھرتی کرادو۔

تندور والی اماں نے تھانیدار کی طرف دیکھتے ہوئے
کہا "پتہ سنا ہے کہ انگریز کی حکومت ساری دنیا میں ہے۔
اگر اس کی حالت یہ ہو چکی ہے کہ اپنی حکومت بچانے کے
لیے اسے اب تاہو تندور والی کی مدد مانگنی پڑ رہی ہے تو میری
بات سن لو اب یہاں سے انگریزی حکومت کے چل چلاؤ
کے دن قریب ہیں۔"

(انگریز فوجی کمشنر اور تاہو تندور والی۔ منیر احمد بلوچ)

منظر دہوا شندور پولومیلہ

آسمان کو چھوتی بلند و بالا اور سفید پوش چوٹیاں
چمکتے دھتکے، شور مچاتے، صاف شفاف پانی کے جھرنے اور
آبشاریں، خشک و پتھریلے پہاڑوں کے پتھوں سبز و
شاداب اور آباد وادیاں، کپکپاتے پتھریلے راستوں پر
جاں نسل سفر اور پھر ۱۲ ہزار ۲۰۰ فٹ کی بلندی پر واقع
"دنیا کی چھت" کہلانے والا وسیع و عریض میدان،
تیلوں پانی کی وسیع و عریض اور دنیا کی منفرد ترین جھیل اور
پھر اس کے ایک طرف دنیا کا منفرد ترین لا تعداد نیموں کا
عاریض شہر آباد ہے۔ اس شہر کے اندر ہر طرف قسم قسم کی
بے شمار گالیاں کھڑی ہیں۔

یہاں دن چڑھے سورج کی حرارت سے رات کی
روح تک کو کپکپا دینے والی خشکی کو مات دینے کے بعد
میدان بگتا ہے۔ انہی علاقوں کے پلے پڑے خوبصورت،
جوان اور خوب سمجھے جسم رکھنے والے گھوڑے اور ان پر سوار

دوسری جنگ عظیم کو ۳۰ سال سے زائد کا عرصہ گزر چکا
تھا۔ جرمن اور جاپانی فوجوں کے تاہو توڑ حملوں اور فتوحات
سے انگریز حکومت ٹھہرا رہی تھی۔ اس میں وہ پہلے والا دم خم
زوال پذیر تھا۔ ایشیا اور خصوصاً برصغیر میں جاپانی فوجوں کی
سمندر اور خشکی کی طرف پیش قدمی انگریز سرکار کے لیے
بہت بڑا خطرہ بنتی جا رہی تھی جس کا مقابلہ کرنے کی خاطر
ہندوستان بھر میں جاپان اور جرمنی کے خلاف لڑنے کے
لیے فوجی بھرتی کی مہم کو ڈنکا کر دیا گیا۔ ویسے دوسری
جنگ عظیم شروع ہونے کے کچھ ہی عرصہ بعد ہندوستان بھر
سے فوجیوں کی بھرتی کے لیے انگریز سرکار نے دن رات
ایک کر دیا تھا تھا۔ ہر بڑے زمیندار چھوٹے موٹے سرکاری
اہل کاروں اور پائٹرانٹس کو اپنے اپنے علاقوں میں فوجی
بھرتی کرانے پر زبانی افعام میں دی جا رہی تھیں۔ بلکہ
انگریز افسر خود جگہ جگہ جا کر لوگوں کو زمینوں کا لالچ دیتے
ہوئے فوج میں بھرتی ہونے کی ترغیب دیا کرتے۔

کہتے ہیں کہ پنجاب میں کسی ضلع کے دورے پر آئے
ایک انگریز افسر کو بتایا گیا کہ ضلع علاقے میں ایک تندور
والی مائی ہے جس کا اخلاق بہت اچھا ہے۔ وہ اپنے اچھے
کردار کی وجہ سے پورے علاقے میں عزت و احترام کی نظر
سے دیکھی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے تندور اور کنیا
پر ہر وقت دور نزدیک کے گاؤں کی عورتوں کا ہجوم رہتا
ہے۔ اس کی خوتنی یہ ہے کہ تندور پر بے تنگشا ہجوم ہونے
کے باوجود کسی کو بھی ذرا بھر شکایت کا موقع نہیں دیتی۔ اگر
ضلع کا فوجی کمشنر اس تندور والی مائی کے پاس جا کر اسے کہے
کہ وہ علاقے کے لوگوں کو فوج میں بھرتی کروائے تو لوگ
جوق در جوق انگریز بہادر کی حکومت کو جرمنی اور جاپان کے
حملوں سے بچانے کے لیے بھرتی ہونے لگیں گے۔

اماں تاہو کو جس کی کنیا اور تندور ساتھ ساتھ ہی تھے،
علاقے کے تھانیدار اور مال افسر نے آکر اطلاع دی کہ کل
انگریز فوجی کمشنر صاحب بہادر تمہارے تندور پر تشریف لا

www.paksociety.com

مروان رکھنے والوں کے قافلے شندور پہنچنے لگتے ہیں۔ یہاں تین روز تک مسلسل چترال اور گلگت بلتستان کی ٹیپوں کے درمیان پولو کے میچ ہوتے ہیں، جنہیں دونوں خطوں میں سب سے بڑے تہوار کی حیثیت بھی حاصل ہے۔ دنیا کے اس منفرد تہوار مقام پر پولو کا آغاز ۱۹۳۶ء میں انگریز کرنل ایولن ہے کوپ (Evelyn Hey)

اسی خطے کے چاقو چو بند جوان ہاتھوں میں مخصوص لمبے باکی نما ”بھٹیاز“ اٹھائے سامنے آتے ہیں۔ خوشیاں رقص کرنے لگتی ہیں، چہرے چل اٹھتے ہیں، رنگ و نور کی بارش شروع ہو جاتی ہے۔ سرسبز و شاداب میدان میں گھوڑے سر پٹ دوڑتے ہیں تو دھول اڑنے لگتی ہے۔ گیند کو ضرب ملتی ہے تو فضا کا رنگ صداؤں سے چمک اٹھتی ہے۔

پاک سوسائٹی



www.paksociety.com

Cob) نے کیا تھا۔ یہاں تک پہنچنے کا سفر کافی تکلیف دہ اور مشکل ہے۔ سفر کی کرب و درد کی کیفیات یہاں کی صحت افزاء ہوا میں اور جھاگ اڑاتے تیز رفتار چشموں کا معدنی پانی ختم کرتا ہے۔ یہاں کا وسیع و عریض میدان، سفید لباس میں ملبوس چوٹیاں اور بھر بھندی ہوا میں جنب جسم و جاں سے کلزاتی استقبال کرتی ہیں تو ایسے لگتا ہے کہ جیسے برسوں کی حسرت ہی نہیں بلکہ ”من کی مراد“ ابھی

جی ہاں! یہ مناظر ہیں چترال کے کوہ بندہ کش کے پہاڑی سلسلے میں واقع دنیا کے پولو گراؤنڈ شندور کے جہاں ہر سال ماہ جولائی کے پہلے عشرے میں ”بادشاہوں کا ٹھیل“ اور ”ٹھیلوں کا بادشاہ“ کہلانے والے ٹھیل، پولو کے دنیا بھر میں اپنی طرز کے منفرد ترین مقابلے ہوتے ہیں۔ ہر سال ماہ جولائی شروع ہوتے بیچوں، طاقتور گاڑیوں، کاروں، موٹر سائیکلوں اور پیدل چلنے کی ہمت

ایک تھپڑ نے ٹنڈو لکر کی آنکھیں کھول دیں

بچپن میں گئے والے ایک زوردار تھپڑ نے بچپن ٹنڈو لکر کو کرکٹ کا بیٹہ بنا دیا۔ بچن ٹنڈو لکر نے اپنے سکول کوچ راماکانت آچاریا کی ۹۷ برسوں سالگرہ کے موقع پر بتایا کہ اسکول سے چھٹی کے بعد کوچ میچوں کا انعقاد کرتے تھے۔ ایک بار میں میچ کھیلنے کے بجائے وائسایڈ اسٹیڈیم میں میچ دیکھنے چلا گیا۔ اتفاق سے وہاں میرے کوچ راماکانت بھی موجود تھے۔ میں انھیں دیکھ کر ان کے پاس گیا۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ تم نے میچ میں کیسا پر فارم کیا! میں نے کہا کہ میں نے آج میچ نہیں دیکھا۔ یہ سن کر کوچ نے میرے گال پر زوردار ہلکا چپ مارا جس سے میں حواس باختہ ہو گیا۔

انھوں نے مجھے کہا کہ اسٹیڈیم میں بیٹھ کر دوسروں کو کھیلنا دیکھنے کے بجائے ایسا کھلاڑی بنو کہ دنیا تمہیں دیکھنے اسٹیڈیم آئے۔ ٹنڈو لکر بتاتے ہیں کہ راماکانت کے ان الفاظ نے میری زندگی بدل دی۔ میں کے بعد میرے ذہن میں بس یہی بات گردش کرتی رہی کہ مجھے بہت بڑا کھلاڑی بننا ہے۔



قماشائیوں کے ہاتھ بھی آجائے تو وہ بھی اسے اپنی مرضی سے جس طرف چاہیں، پھینکنے کے مجاز ہوتے ہیں۔ شندور پولو میلہ شروع ہونے سے پہلے سکيورٹی فورسز علاقے کا انتظام سنبھال لیتی ہیں۔

دن بھر بمی پولو تو کبھی کھائے اور چائے کی تیاریاں اور مٹی گپ شپ اور بھی بھیل کنارے چھیل قدمی ہوتی ہے۔ رات کو شندوری سٹ ہسٹ ہواؤں کے ساتھ علاقائی ثقافتی مظاہر بھی چاہوں تو گرم علاقوں سے آئے لوگوں کو بھی سرد ہوا میں خیمے چھوڑ کر باہر نکلنے سے روک نہیں پاتی۔ پولو میلے کے دوران اور خصوصاً آخری روز وہ منظر سب سے خوبصورت، دلکش اور دل پذیر ہے جب آس پاس کی چھوٹی بڑی ٹیکریوں سے ماہر باہر اٹھانڈر چھلانگ لگاتے، اذان بھرتے اور پھر ہزاروں لوگوں کے اوپر دیو بیکل

پوری ہوگی۔ شندور میں دنیا کے منفرد تین روزہ پولو میلے کی ترتیب یوں ہوتی ہے کہ یہاں مجموعی طور پر تین دن میں کل پانچ میچ ہوتے ہیں۔ دونوں طرف سے چھ چھ گھڑسوار میدان میں اترتے ہیں۔ پہلے چار میچوں میں جیتنے اور مارنے والے دونوں ہی میدان سے باہر ہو جاتے ہیں اور پھر آخری روز اصل اور فائنل میچ ہوتا ہے۔ لیکن اس میچ کا پہلے کھیلے گئے چار میچوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور نہ ہی وہاں سے جیت کر آگے آتا ہے یعنی یہاں کا ہر میچ اپنی جگہ فائنل ہی ہوتا ہے۔ یہاں کھیلی جانے والی پولو کی ایک اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہاں کھیل کا کوئی قانون لاگو نہیں ہوتا۔ اسے یہاں فری سٹائل پولو کہا جاتا ہے۔ دوران کھیل ”لا قانونیت“ کا حال اس حد تک ہوتا ہے کہ اگر گیند

”پرندوں“ کی طرح پروازیں کرتے ہیں۔ لیکن یہ ”پرندے“ جہاں بڑی جسامت کے ہیں، وہیں رنگ برنگے بھی ہوتے اور دل کو موہ لیتے ہیں۔ آخری رات کا وہ منظر بھی اپنی جگہ بہت دلکش و حسین ہوتا ہے جب آسمان رنگا رنگ آتش بازی سے کسی پھولوں بھری وادی کی طرح گل اٹھتا ہے۔

یہ وہ مناظر ہیں جنہیں اتنی بلندی پر مارا ماری کے بعد یہاں پہنچ کر سب سے زیادہ دلچسپ اور دل کو چاہی جاسکتا ہے۔ لیکن حقیقت سامنے آتے ہی دل و دماغ کی کیفیت ہی بدل جاتی ہے۔

شندور میلہ ختم ہوتے ہی ہزاروں غیموں کا شہر تیزی سے ”اجڑنے“ لگتا ہے۔ لوگ گاڑیوں میں سوار ہو کر ایک طرف چترال کی جانب نیچے اترتے ہیں تو دوسری طرف کے قافلے ٹھٹھکی کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ راستے میں مقامی چترالی بیچ، عورتیں اور دیگر لوگ شندور کے دیو مالائی پرستان سے اترنے والے ان قافلوں کو بلا بلا، شور مچا اور خوشیاں منا کر رخصت کرتے ہیں۔ سوزن دھٹکنے تک شندور کی آسانی چھت پر پڑاؤ ڈالنے والے لوگ غائب ہو جاتے ہیں۔

(شندور پوائنٹ نیول، علی عمران شاہین)

ماضی کی دلچسپ یادیں

گزشتہ زمانوں کو یاد کرتے رہنا کوئی اچھی بات نہیں۔ ماضی کو دہانے والا ممکن نہیں، اسی لیے اس میں کھوئے رہنا وقت ضائع کرنے کے مترادف ہی ہے۔ ہر ذی ہوش اور باشعور انسان کے لیے لازم ہے کہ وہ ماضی کے بجائے مستقبل پر نظر رکھے اور اسے بہتر بنانے پر توجہ دے۔ یہ سب کچھ جاننے اور سمجھنے کے باوجود ہم گزشتہ پر امن اور اچھے زمانے کو اپنی یادوں کے ذخیرے سے منانے میں کبھی کامیاب نہ ہوتے۔

۳۰ روز قبل ہمیں اپنے نواسے فارس کے ویزے کے لیے اس کے ساتھ بذریعہ کار لاہور سے اسلام آباد تک سفر

کرتا پڑا تو ہم چار پانچ گھنٹے ماضی کو یاد کرتے رہے، مثلاً جب ہمیں گیس پر چلنے والی اپنی کار میں ۶۰-۳۰ گلو میٹر طے کرنے کے لیے تقریباً ایک ہزار روپے کی گیس بھروانا پڑی تو ہمیں گزشتہ صدی کے ۶۰-۷۰ کے عشرے میں اپنی ۱۲ برس پرانے ماڈل والی کار اوپل کپتان میں لاہور سے چنڈی اور مری کیے جانے والے کیڑے یاد آئے۔ یاد رہے کہ جس سفر پر گیس کی خریداری میں ایک ہزار روپے کا خرچہ آیا ہے، وہ اگر پٹرول والی گاڑی میں کیا جاتا تو اس پر کم از کم اخراجات کا تخمینہ ہزار ہزار کے لگ بھگ ہوتا۔

ہم اگر نئی نسل کو یہ بتائیں کہ ہم اپنی پرانی کھٹارا گاڑی میں سفر ۱۸ روپے میں کرتے رہے تو بھلا کون اعتبار کرے گا؟ اس لیے تفصیل بھی بتانا ضروری ہے، ہماری پرانی گاڑی ایک ٹیکن پٹرول میں ۳۴ میل کا سفر طے کرتی تھی۔ لاہور اور راولپنڈی کا فاصلہ بھی میلوں میں ہمیں اب تک یاد ہے اور یہ ۸۷ میل تھا۔ گویا اس سفر کے لیے ہمیں ۶ ٹیکن پٹرول درکار ہوتا تھا۔ پٹرول کی قیمت ان دنوں ۲ روپے اور آنے لگیں تھی۔ اب آپ خود ہی سوچ لیجئے ہم کتنی ”کمیشن“ رقم میں لاہور سے چنڈی اور چنڈی سے لاہور آ جاسکتے تھے۔

موٹر وے پر سفر کرتے ہوئے ہم ماضی کے جھروکوں سے ماضی میں اسلام آباد کے حالات کا آنے سے موازنہ بھی کرتے رہے۔ اگلے روز حوصلہ ویزا میں حائل مشکلات کو دیکھتے ہوئے ہمیں گزشتہ زمانہ واقعی سہرا محسوس ہوا۔ مثلاً آج سے اٹھارہ برس قبل جب ہم نے امریکی ویزا کی درخواست دی تو اس وقت کوئی فیس نہیں تھی۔ سفارت کاروں نے ہمیں باتوں باتوں میں سمجھ لیا۔ ہم نے ۶ ماہ کا ویزا مانگا تھا مگر جب پاسپورٹ واپس ملا تو ۵ سال کے ٹکٹی بل ویزے کا ٹھپا لگا ہوا تھا۔ ہمارے ایک تاجر دوست نے اس سے بھی کہیں تیس برس قبل کا یہ واقعہ بتا کر ہمیں حیران کر دیا کہ اس زمانے میں امریکہ کا ویزا طلب کرنے والوں کے نام امریکی سفارت خانے سے باقاعدہ شکریے کے خطوط ملتے تھے۔

قرون وسطی کے پرتشدد و ایثار ساقی، چٹائی کے مہیب اور کمریہ مناظر کا دل ہلا دینے والا مشاہدہ کرتے ہیں۔

سرد اور تاریک یہ خانوں میں واقع یہاں کی کال کوٹریاں یورپ کے ان سیاہی مقامات میں شامل ہیں جو مخصوص طرز کے حوالے سے سیاہوں کے لیے باعث کشش ہیں۔ یہ مقامات سیاہوں کو یہ موقع فراہم کرتے ہیں کہ وہ تاریخ کے سیاہ پہلو سے ایک دہشت ناک سفر کی ابتدا کریں۔ ان میں قیدیوں پر تشدد کرنے والے متعدد محققانہ ہتھیار بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر کو دیکھ کر سیاہوں کی تھرخری جھوٹ جاتی ہے اور وہ خوف سے لرزے لگتے ہیں۔ یہ غیر یقینی حد تک شیطانی اور خالمانہ مناظر ہوتے ہیں۔

”نام میں کیا دھرا ہے“

بھارتی ریاست اتر پردیش میں پولیس کا کہنا ہے کہ ایک دولت لڑکے کو مبینہ طور پر اس لیے قتل کر دیا گیا ہے کیونکہ والد نے اس کا وہی نام رکھا تھا جو ایک اونچی ذات والے ہندو پڑوسی کے بیٹے کا نام تھا۔ نیرج کی عمر ۱۵ برس

لندن کا عقوبت خانہ

لندن کا عقوبت خانہ یورپ بھر میں سیاہوں کی دلچسپی کا سب سے بڑا اور اہم مرکز ہے۔ وہ دنیا بھر کے لوگوں کو اپنی طرف بلاتا ہے۔ لوگ اس کی دہشت ناک کے باوجود ڈر سے سب سے اس کی طرف کھینچے جلتے آتے اور دہشت ناک مناظر سے خوف زدہ ہو کر واپس جاتے ہیں۔ یہ لندن برن کی سرد اور خوشی کی علامت بھی جانے والی ہے مرم محرابوں کے نیچے واقع ہے۔ یہ جگہ یقینی طور پر کمزور دل لوگوں کے دیکھنے کی نہیں کیونکہ یہاں آنے والے لوگ



پیرس کا زیر زمین قبرستان

فرانس کے دارالحکومت پیرس کے مرکزی علاقے میں میدوسٹی کے قبرستانوں کی بہتات تھی۔ اس وجہ سے بہت سے ترقیاتی کام نہیں ہو پا رہے تھے اور متعدد منصوبے قفل کا شکار ہو گئے تھے۔ چنانچہ اٹھارویں صدی کے



انتقام پر فرانس کی حکومت نے فیصلہ کیا کہ زیر زمین بڑی بڑی اجتماعی قبریں تیار کر کے ان میں ماضی کے مردوں کی ہڈیاں دفن کر دی جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور صرف ۸۸ ماہ کی مدت میں لگ بھگ ۶۰ لاکھ افراد کی باقیات پیرس کے مرکزی قبرستانوں سے نکال کر ان اجتماعی قبروں میں دفن کر دی گئیں۔ ان کا تعلق ۸۵ء کے زمانے سے تھا۔ یہ باقیات شہر میں بڑی بڑی خلیے نما گاڑیوں میں لاکھوں رات کے اندھیرے میں زیر زمین بنے قبرستانوں میں بڑے بڑے ڈھیروں کی صورت منتقل کر دی گئیں۔

ان نئے قبرستانوں کو عموماً ”ایپائز آف ڈیچ“ کا نام دیا جاتا ہے۔ نئی اجتماعی قبروں پر مشتمل یہ پورا نہایت ورک زیر زمین لگ بھگ ۲۰۰ ریکریوں پر مشتمل

ہے۔ اس میں مردوں کی لاکھوں کروڑوں ہڈیاں رکھی ہوئی ہیں۔ اس کا صرف ایک چھوٹا سا حصہ ہی عوام الناس کے دیکھنے کے لیے کھلا ہوا ہے جو یقینی طور پر خاصا دلچسپ منظر پیش کرتا ہے۔ انسانی ہڈیوں اور بے شمار کھوپڑیوں کو مختلف طریقوں اور شکلوں میں رکھا گیا ہے۔ بعض کو صلیب کی شکل میں رکھا گیا ہے، بعض کو چروں کی شکل میں اور بعض کو اس طرح کہ یہ دیوار کی آرائش بنی ہوئی ہیں بڑے بڑے ڈھیروں کی صورت میں۔ یہ منظر بہت خوفناک ہے، اس لیے انھیں دیکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔

جیل جانے کے بجائے ”ذہنی چیلو“

چین کی حکومت نے حال ہی میں ۴ لاکھ قیدی دینی میں لاکر ان سے تعمیرات کروا کر انھیں پڑھایا، لکھایا اور اچھا شہری بنا کر واپس ملکی ترقی کے لیے تیار کیا۔ اس وجہ سے وہ جرم کرنے کے بجائے اب اچھے شہری بن گئے ہیں۔



تھی اور اس کی لاش ۲۳ نومبر کو ایک گھٹ میں ملی۔ پولیس کا کہنا ہے کہ تیرق کے والد رام کمار سے پڑوسی جواہر چودھری نے اپنے دونوں بیٹوں کے نام بدلنے کے لیے کہا تھا کیونکہ جواہر چودھری اور رام کمار کے بیٹوں کے نام ایک جیسے تھے۔ رام کمار اور جواہر چودھری، دونوں کے دو دو بیٹے ہیں اور ان دونوں کے نام تیرق اور دھیرق ہیں۔ بستی کے ایک سینٹر پولیس اہلکار کا کہنا ہے کہ اس بات پر دونوں خاندانوں میں بہت عرصے سے جھگڑا تھا۔ جواہر چودھری کے دونوں بیٹے فرار ہو چکے۔

2022 میں خوش آمدید

- ☆ امریکا جب بے تار (وائریس) بجلی بھولنے میں کامیاب ہو جائے گا
- ☆ کمپیوٹروں کے شیٹے سکرین اور شمیٹیل بن جائیں گے
- ☆ جب فسترمیں ۲۰۸۰ سال کے پورے کام کریں گے
- ☆ ۲۰۱۲ء میں مرغی کا گوشت مصنوعی طور پر بن سکے گا
- ☆ موبائل فون آج کے سپر کمپیوٹر سے زیادہ طاقتور ہوگا
- ☆ تقصیری ڈی پرنٹر ایجاد ہو جائیں گے
- ☆ سمندری گھاس سے تیل بنے گا

امریکا

کے مشہور موجد، سٹیو جابز نے ایک موقع پر کہا تھا "چیش گوئی کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ مستقبل ایجاد کر لیا جائے۔" یوں بقول سٹیو، طویل مدتی چیش گوئیاں کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

تاریخ پر نظر دوڑائیے، تو معلوم ہوتا ہے کہ چیش گوئیوں کا کاروبار خطرناک ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی کئی چیش گوئیاں تاریخی کسوٹی پر غلط ثابت ہوئیں جنہیں اپنے زمانے میں ۱۰۰ فیصد درست سمجھا گیا تھا۔ دوسری طرف ایسی چیش گوئیاں تاریخ کا حصہ ہیں جنہیں ان کے دور میں ناقابل یقین سمجھا گیا، مگر وہ درست ثابت ہوئیں۔

۱۸۹۹ء میں ایجادات رجسٹرڈ (پٹنٹ) کرنے والے امریکی سرکاری ادارے کے سربراہ نے دعویٰ کیا تھا کہ اب تک جتنی ایجادیں ہوئی تھیں، وہ سامنے آچکی۔ لیکن کبھی نے دیکھا کہ بیسویں صدی میں ایسی انتہائی ایجادات سامنے آئیں کہ انھوں نے نئی نوع انسان کے انداز و اطوار ہی بدل ڈالے۔ اسی طرح کئی ایجادات مثلاً ٹیلی ویژن، کار اور خلائی جہازوں کے متعلق چیش گوئیاں ہوئیں کہ وہ زیادہ عرصہ نہیں چل سکیں گی۔ لیکن وہ بھی غلط ثابت ہو گئیں۔

چیش گوئیوں کی تیسری قسم بھی ہے۔ وہ جو ہونی چاہئیں مگر محض وجود میں نہیں آتی۔ مثلاً عرب بہار، بودو بحران یا حادثہ ۹/۱۱ کے بارے میں چیش گوئیاں۔ لیکن سائنس و ٹیکنالوجی کی محیر العقول ترقی کے بعد خصوصاً مغرب میں مستقبلیات کا باقاعدہ ایک علمی شعبہ وجود میں آچکا۔ اس شعبے سے ششک ماہرین سائنس، معاشیات، عمرانیات وغیرہ کا بنیادی کام یہ ہے کہ وہ مستقبل میں جھانک کر اندازہ لگائیں کہ اگلے دس پندرہ برس میں ایک شعبہ مثلاً توانائی یا شعبہ ٹیکنالوجی کی کیا حالت ہوگی۔ نئے سال کے آغاز پر مشہور امریکی رسالے فورچون

نے ماہرین مستقبلیات سے رائے لی کہ ۲۰۲۲ء تک مخصوص شعبوں کی صورت حال کیا ہوگی؟ نتیجے میں مثبت اور منفی، دونوں قسم کی چیش گوئیاں سامنے آئیں۔ منفی میں سامبر و بہشت گردی اور دنیا بھر میں سیاسی ابتری نے سر فہرست جگہ بنائی۔ تاہم یہ چشم کشا خوش خبری بھی سامنے آئی کہ ذہن چمکا دینے والی سامنتی و ٹیکنیکی ایجادات ہمارے رہنے بسنے اور کام کرنے کے انداز بالکل بدل ڈالیں گی۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ تکنیکی تبدیلیاں امریکی معیشت کو بھی زوال سے نکال کر دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑا کر دیں گی۔ یہ تبدیلیاں اگرچہ بعض لوگوں کو ناگوار گزاریں گی۔ مثلاً باس کو دفتر میں جمہوریت کی آمد قبولی ہوگی۔ کاروبار میں وراثتی سلطنتیں جاتی رہیں گی۔ بلکہ بعض کاروبار تو لیڈر کے بغیر کام کریں گے۔ یہ بین ممکن ہے کہ سب سے بہترین خیال کھنٹی کے جوئیئر ترین افسر یا ادارے کے باہر سے آئے۔

جدید ترین کاروباری رجحانات پر تحقیق کرنے والے امریکی ماہر، ڈان سکوت کا کہنا ہے: "ایک زمانے میں کاروباری حلقوں میں یہ کھاوت مشہور تھی کہ ہمارا بہترین سرمایہ (ملازمین) ہر شام رخصت ہو جاتا ہے۔ لیکن مستقبل میں کمپنیوں کا بہترین سرمایہ شاید دفتر میں داخل ہی نہیں ہوگا۔"

امریکہ کا دفاعی سرکاری ادارہ، ڈریا (ڈیفنس ایڈوانسڈ ریسرچ پروژیکٹس ایجنسی) تو سوشل میڈیا کے ذریعے نئے خیالات اور نئے خیال سامنے لا رہا ہے۔ ادارے کے سربراہ، رچمن دوکان کہتے ہیں: "یہ بین ممکن ہے کہ کوئی ۱۳ سالہ بچی سرطان کا علاج دریافت کر لے!" ڈریا نے مئی ۲۰۰۸ء میں انٹرنیٹ پر ایک کمپیوٹر گیم، فولڈٹ (Foldit) جاری کی تھی۔ گیم میں مقابلہ کرنے والے پروٹین کو دوبارہ (Fold) کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ یہی عمل کئی امراض کا علاج دریافت کرنے کے سلسلے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ آج دنیا بھر میں ڈھائی لاکھ استعمال کنندگان فولڈٹ کھیلتے ہیں۔ ان کی کوششوں

دارو مدار انجی پر ہوگا۔ مغربی یورپ، جاپان اور روس میں نوجوان نایاب ہیں، اسی لیے وہ آگے چل کر خاصے معاشی مسائل میں گرفتار ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس ضمن میں امریکہ خاصا خود کفیل ہے۔

آج امریکیوں کا سب سے بڑا خوف یہ ہے کہ اگلے ۱۰ برس میں چینی ہر وہ شے بنا رہے ہوں گے جو اب

سے ایسے خامرے (انزائم) کا ذخیرہ سمجھنے میں مدد مل رہی ہے جو بندروں میں ایڈز پیدا کرتا ہے۔ ریکن کا کہنا ہے ”جب بہت سارے لوگ مل جل کر ایک مسئلے پر کام کریں، تو اس کا حل نکالنا آسان ہو جاتا ہے۔“

۲۰۲۲ء کا سی۔ ای۔ او (چیف ایگزیکٹو افسر) بھی آج کے برسوں سے مختلف ہوگا۔ تب اسے بڑا پیچیدہ انتظام

کیا میں ریٹائر ہو جاؤں؟



اس آدمی نے اپنا ہیملٹ اتارا تو گھٹیا سر اور سفید جھنوریں سامنے آئیں۔ ادھر ایک ۷۰ سالہ خاتون دفتر میں داخل ہو رہی تھی۔ اس نے کمر میں پیٹ وپا رکھنے والی بیٹی باندھ رکھی تھی۔ تیسری خاتون مونے شیشوں والی عینک پہنے سمارٹ فون کو نگہور رہی ہے۔ اس کے ہندسے مونے ہیں تاکہ صاف دکھائی دے سکیں۔ یہ یوزروں کا کوئی اشتباہ نہیں بلکہ یہ مستقبل کے ملازم ہیں۔

دنیا میں زیادہ سے زیادہ ٹرنک کام کرنے کا رفاہان جز پکڑ چکا۔ یہی وجہ ہے کہ ۲۰۲۲ء میں کام کرتے یوزر سے مردوزن کی تعداد آج کی نسبت گنی ہوگی۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ خصوصاً ترقی یافتہ ممالک میں یوزر سے اتنے صحت مند ہوں گے کہ ۸۰ یا ۹۰ سال کی عمر تک بھی مصروف کار رہیں۔

اگلے ۱۰ برس کے دوران شعبہ طب میں انقلاب آنے کی پیش گوئی ہے۔ مثلاً ۲۰۲۲ء تک مختلف مصنوعی جسمانی اعضا بن جائیں گے۔ لہذا آنکھ، گردہ یا دل بھی خراب ہوا تو بازار سے نیا لے آئیے۔ پھر نئی ادویہ یوزروں کی کئی بیماریوں کا خاتمہ کر ڈالیں گی۔ لہذا انہیں موقع ملے گا کہ وہ فائری کارخانوں میں کام کر سکیں۔ تاہم یوزر سے ملازمین کے باعث نئے مسائل بھی جنم لیں گے۔ مثلاً یہ کہ اگر وہ نشست ہی نہیں چھوڑیں گے، تو نئی ملازمتیں کیونکر جنم لیں گی؟ پھر ادارے جو طلب سے متعلق رقم ملازموں کو دیتے ہیں، وہ بھی بڑھ جائے گی۔

امریکی بتاتے ہیں۔ وجہ یہی ہے کہ چینی بڑی تیزی سے ہر امریکی ساختہ شے کی نقل کرنے میں مصروف ہیں۔ اسی لیے امریکیوں کی اب کوشش ہے کہ وہ ایسی ایجادات تخلیق کریں جن کی نقل اتارنا مشکل ہو۔ ذیل میں ایسی ہی کچھ اختراعات کا ذکر خیر ہے جو ۲۰۲۲ء تک معرض وجود میں آ سکتی ہیں۔

سنبھالنا پڑے گا، کیونکہ گاؤں سے لے کر ملازمین تک کئی لاکھ لوگ بذریعہ فون، موبائل، انٹرنیٹ، سینروں اور دیگر کئی مشینیں اس سے تعلق رکھیں گے۔ جوسی۔ ای۔ او اپنے اوپر ہونے والی معلومات و اعداد و شمار (ڈیٹا) کی بھرمار سہارا لیں گے، کامیابی انہی کے قدم چومے گی۔

مستقبل میں تکنیکی صلاحیتوں سے آراستہ نوجوان بہت اہمیت رکھیں گے، کیونکہ کمپنیوں کی کامیابی یا ناکامی کا

سپر کمپیوٹر سے طاقتور سمارٹ فون

اس وقت دنیا نے انٹرنیٹ سے ۲۰ کروڑ آلات منسلک ہیں۔ ان میں بیشتر تعداد کمپیوٹر، موبائل فون اور پرنٹروں کی ہے۔ لیکن ماہرین کا کہنا ہے کہ ۲۰۲۲ء تک ”پچاس ارب“ آلات انٹرنیٹ سے منسلک ہوں گے۔ ان میں کاروں سے لے کر گھریلو برقی اشیاء تک شامل ہوں گی۔ چنانچہ جب کمپنیوں کو ڈیٹا سائنس والوں کی ضرورت پڑے گی تاکہ وہ کمپنیز اور اقسام کا ڈیٹا منظم کر سکیں۔

۲۰۲۰ء تک ایسے سمارٹ فون دستیاب ہوں گے جن کا پرمیٹریکری گریڈ ہرنز طاقت رکھے گا۔ نیز ان میں کئی گریڈ بائٹ ڈیٹا ذخیرہ ہو سکے گا۔ گویا اس زمانے کا سمارٹ فون

طاقت میں آج کے سپر کمپیوٹر جیسا ہوگا۔ یوں ایسے سمارٹ فون کی بدولت ممکن ہوگا کہ عام آدمی بھی بس اسٹاپ پر سواری کا انتظار کرتے ہوئے اپنے انتہائی پیچیدہ مسائل حل کر سکے۔ یہی سمارٹ فون پھر بے تار (وائریس) انٹرنیٹ ورک کا کام بھی دیں گے۔ کیونکہ انتہائی طاقتور ہونے کی وجہ سے ان کے ذریعے بڑی سے بڑی تصویر بھیجنا بھی ممکن ہوگا۔ ایک رپورٹ کے مطابق ۲۰۲۰ء کا سمارٹ فون بہ لحاظ تیز رفتاری اور ذخیرہ اتنا مؤثر ہوگا کہ اس میں دنیا کے سب سے بڑے کتب خانے، لائبریری آف کانگریس کی ساری کتابوں جتنا مواد (ڈیٹا) سما سکے۔

گھسٹی جگہ کا علاج



وہ دیکھیے، مشہور انگریزی کارٹون، جیٹ سز میں دکھائی جانے والی کار سے ملتی جلتی گاڑی ایم۔ آئی۔ ٹی میڈیا لیبز کی میں کھڑی ہے۔ یہ تحقیقی ادارہ سائنس و ٹیکنالوجی سے متعلق ممتاز امریکی یونیورسٹی، ایم۔ آئی۔ ٹی سے منسلک ہے۔

بجلی سے چلنے والی اس گاڑی کو معمولی مت سمجھئے۔ جب اسے کھڑا کیا جائے، تو

پچیسوا (Chassis) سے نیچے چلا جاتا ہے۔ یوں گاڑی کی لمبائی ۵۰ فیصد کم ہو جاتی ہے۔ اس طرح گاڑی کا رولنگ ریسز کم ہو جاتا ہے۔ جب ڈرائیور اسے ٹب ڈرائیور یا سائٹل ٹب ڈرائیور کے طور پر استعمال کرتا ہے، تو یہ آسانی سے اتر آتی ہیں۔

یہ تجرباتی سٹی کار شہروں میں تیزی سے بڑھتی آبادی اور گھنٹی جگہ کے باعث وجود میں آئی۔ دنیا کی آبادی سات ارب ہو چکی اور اس میں سے آدھے انسان شہروں میں آباد ہیں۔ لہذا آبادی بڑھنے کی وجہ سے شہروں میں جگہ کمیاب ہوتی جا رہی ہے۔ ایسے میں چھوٹی گاڑیاں ہی چلن بن جائیں گی کیونکہ انہی کی بدولت وقت بچانا ممکن ہوگا۔ تیز سائیکلوں سے لے کر گاڑیاں تک کرائے پر لینا معمول بن جائے گا۔

ایم۔ آئی۔ ٹی لیب ہی میں ایسے گھریلو فلیٹ بنانے پر تجربات جاری ہیں جنہیں جب چاہے پکایا یا پکایا جاسکے گا۔ یہ گھر لچک دار لیکن انتہائی مضبوط مادوں سے بنیں گے۔ ماہرین کی رو سے ایک ایسے چھوٹے فلیٹ کی قیمت ۳۰ ہزار ڈالر ہوگی۔

۵۰۰ میل والی برقی کار

اب امریکا اور جاپان کے سائنس دان اسی سائنسی تصور کو حقیقت کا روپ دینا چاہتے ہیں۔ ان کا منصوبہ یہ ہے کہ فوٹو وولٹک سیل والے پینل موصلاتی سیاروں پر نصب کر کے انھیں خلا میں بھیجا جائے۔ چونکہ وہاں بادلی ہوں گے نہ رات، لہذا پینل چوتیس گھنٹے دھوپ سے بجلی بنائیں گے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ وہ پینل زمینی ٹیٹلوں کی نسبت ۲۳ گنا زیادہ موثر ہوں گے۔

جب وافر بجلی بن جائے، خلائی سیارہ انھیں مائیکروویو شعاعوں میں ڈھال کر زمین کی سمت بھیجے گا۔ زمین پر ایک ریسیوران شعاعوں کو دوبارہ بجلی میں بدلے گا۔ وہ بجلی پھر قومی گرڈ میں شامل کر دی جائے گی۔ ادھر جزیرہ ہوائی میں امریکی خلائی ادارے، ناسا کے سائنس دان، جان منٹگنس نے ایک سے دوسرے جزیرے تک بے تار (وائریس) بجلی بکھولنے کا کامیاب تجربہ کر لیا ہے۔

خلائی شمسی بجلی گھر کے قیام میں سب سے بڑی رکاوٹ اخراجات ہیں۔ ایک ایسے بجلی گھر کے قیام پر فی الوقت اربوں ڈالراگت آئے گی۔

تیل کی بڑھتی قیمتوں نے مغرب ہی نہیں چین میں بھی ماہرین کو مجبور کر دیا ہے کہ اب وہ بجلی سے چلنے والی کاریں ایجاد کریں۔ برقی کاروں کے ساتھ بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ابھی تک ایسی میٹری ایجاد نہیں ہوئی جس میں وافر بجلی بھری جاسکے۔ کیونکہ میٹری میں جتنی زیادہ بجلی بھرے گی، کار بھی اتنی ہی دور چائے گی۔



فی الوقت جاپانی کار، نسان لیف کی میٹری اتنی طاقتور ہے کہ وہ ۵۰۰ میل تک جاسکے۔ اب ماہرین کوشش کر رہے ہیں کہ وہ تصحیم از میٹری ایجاد کر سکیں۔ واضح رہے، عام تصحیم۔ آئون میٹریاں مہر بند ہوتی ہیں۔ نیز ان میں ایک بڑا اور بھاری بھرم دھاتی کیتھوڈ ڈالنا پڑتا ہے تاکہ وہ بجلی کا کرنٹ پیدا کرے۔

۱۹۹۵ء میں جاپانی ماہرین نے یہ نظریہ پیش کیا کہ میٹری میں تصحیم اور آکسیجن کے ماپ سے کرنٹ پیدا کرنا ممکن ہے۔ ماہرین اب اسی نظریے کو عملی جامہ پہنانا چاہتے ہیں۔ ایسی میٹری میں دھاتی کیتھوڈ کی جگہ آکسیجن لے گی۔ یوں نہ صرف چھوٹی میٹری تیار ہوگی، بلکہ اسے چارج کرنے پر ممکن ہوگا کہ کار ۵۰۰ میل تک چل سکے۔ یوں شعبہ ٹرانسپورٹ میں انقلاب آجائے گا۔

خلا میں بجلی کیسے بنے گی؟

۱۹۴۱ء میں مشہور امریکی سائنسی افسانہ نگار، اسحاق اسوف نے ایک کہانی تخلیق کی۔ اس میں پہلی بار خلا میں گھومتے ایسے بجلی گھر کا خیال پیش ہوا جو شمسی توانائی کی بدولت بجلی بنا کر زمین پر بھیجتا تھا۔



سمندری گھاس سے تیل کیسے بنے گا؟

دنیا بھر میں بعض فصلیں مثلاً کئی نباتاتی ایندھن (ہائید فیول) بنانے میں استعمال ہونے لگی ہیں۔ اسی لیے کئی کی قیمت بھی بڑھ گئی۔ لیکن اب ہر جگہ سے یہ احتجاجی آوازیں اٹھ رہی ہیں کہ لاکھوں انسانوں کو پیٹ بھر خوراک میسر نہیں، دوسری طرف فصلیں ایندھن بنانے میں کام آ رہی ہیں۔ انسانوں! کچھ تو پوش کے ناخن لو۔ اس احتجاج کے باعث ماہرین کی سعی سے کہ کوئی ایسا پودا ڈھونڈ جائے جو بطور غذا استعمال نہ ہو اور اس سے وافر ایندھن بھی بن سکے۔ چنانچہ اب سائنس دانوں کی نظر کافی (الچی) سے ہوتی ”سمندری گھاس“ (Seaweed) پر پڑ چکری ہے اور یہ بین ممکن ہے کہ اگلے ایک عشرے میں کئی ارب ٹن کھلیں نباتاتی ایندھن اسی سے بنایا جائے۔

سمندری گھاس کئی خصوصیات رکھتی ہے۔ اول یہ سب سے زیادہ تیز رفتاری سے اگنے والا پودا ہے۔ دوم اسے اگنے کے لیے کسی کھاد کی ضرورت نہیں پڑتی۔ پھر اسے دیگر فصلوں کے برعکس زیادہ زمین بھی نہیں چاہیے ہوتی۔ چہاں اس سے بنانا نباتاتی ایندھن چلنے پر مٹی کی نسبت خطرناک ماحولیاتی کمیس کم خارج کرتا ہے۔ سمندری گھاس کی ایک بڑی خاصیت یہ ہے کہ اس کا آدھے سے زائد حصہ شکر (Sugar) پر مشتمل ہے اور ماہرین توانائی کی رو سے یہی مستقبل کا خام (Crude) ایندھن ہے۔ وجہ یہ ہے کہ شکر کو ہتھانول یا بوتانول میں آسانی سے بدلا جاسکتا ہے۔ یہی خاصیت مد نظر رکھ کر امریکا، فرانس اور جاپان میں سائنس دان ایسا کیمیائی عمل تخلیق کرنے کی تہ و دو میں ہیں جو شکر میں پوشیدہ توانائی کو نباتاتی ایندھن میں بدل سکیں۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ ایندھن دیگر کی نسبت سستا ہوگا۔



دنیا بھر میں سائنس دان جانداروں کے غلیظوں کی مدد سے لیبارٹریوں میں گوشت "اگانے" کی کوشش کر رہے ہیں۔ بعض ماہرین طب ٹیسٹ ٹیوب میں موبیٹی پیدا کرنے کی سعی میں محو ہیں۔ دعا یہی ہے کہ مستقبل میں یہ مصنوعی گوشت اور جانور اور انسانیوں میں پروٹین کی ضرورت پوری کر سکیں۔

دنیا کی آبادی ہزار ہا ہو چکی اور ۲۰۲۲ء تک مزید بڑھ جائے گی۔ لہذا بہ موبیٹیوں کی موجود تعداد بھی انسانوں کو گوشت فراہم نہیں کر سکے گی۔ اسی لیے مصنوعی گوشت اور ٹیسٹ ٹیوب مرغ، بھیڑ اور گائے مارکیٹ میں آنا ناگزیر ہے۔ مزید برآں اس طرح ماحولیاتی مسائل بھی حل ہوں گے۔ کیونکہ موبیٹی رہنے کی وسیع جگہ مانگتے، کثیر مقدار میں پانی پیتے و چارہ کھاتے اور بذریعہ ذکار اوزن و دشمن گلیسین چھوڑتے ہیں۔

لیبارٹریوں میں مصروف کار سائنس دانوں کا سب سے بڑا مسئلہ سرمائے کی کمی ہے۔ تاہم آہستہ آہستہ نئی شعبے سے بغرض تحقیق انھیں رقم ملنے لگی ہے۔ حال ہی میں امریکی سائنسی ادارے، پیٹا (PETA) نے اعلان کیا ہے کہ جس ماہر نے جون ۲۰۱۲ء تک مصنوعی طور پر مرغی کا گوشت بنا لیا، اسے ۱۰ لاکھ ڈالر (۹ کروڑ روپے) بطور انعام ملیں گے۔

۱۰ سال بعد دفاتر میں کام آسان بنانے والے نئے آلات آجائیں گے۔ مثال کے طور پر دفتر کی ٹھریکوں پر نصب شیشے بیک وقت سستی پینسل اور لمبی میڈیا اسکرین کا کام دیں گے۔ نیز ضرورت پڑنے پر انھیں دھندلا بھی کیا جاسکے گا تاکہ اندر کے مناظر چھپ سکیں۔

ہر کارکن کے پاس کمپیوٹر ہوگا۔ چنانچہ پاس ای کے ذریعے ہر کارکن کو بتائے گا کہ اسے کیا کام کرنا ہے۔ تاہم پاس کی نگرانی کا تصور ختم ہو جائے گا کیونکہ ہر کسی کو اپنی ذمہ داریوں کا بخوبی علم ہوگا۔ جس نے ذمہ داری سے اپنا کام نہ کیا، وہ خود بخود نظام سے باہر ہو جائے گا۔

نئی کانفرنس معمول بن جائیں گی۔ کانفرنس کے آلات ایک کمپیوٹر سے منسلک ہوں گے۔ اس کمپیوٹر میں موجود سافٹ ویئر ہر بولے کئے لفظ کو کسی بھی زبان میں ترجمہ کر دے گا۔ یوں وہ غلطہ زبانیں بولنے والے بھی پاکستانی ایک دوسرے سے گفتگو کر سکیں گے اور مترجم کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

اس کے علاوہ شب تک قہری ڈی (سہ العبادی کی پرنٹر بھی ایجاد ہو جائیں گے۔ یوں بھٹی کے لیے ممکن ہوگا کہ وہ کسی بھی قسم کی مصنوعہ سالم حالت میں تجرباتی طور پر تیار کر سکے۔ اس طرح مصنوعہ کی خامیاں و خوبیوں سامنے آجائیں گی۔

انسانی دماغ اتنا پیچیدہ ہے کہ جدید سائنسی ترقی کے باوجود اسے پوری طرح سمجھا نہیں جا سکا۔ تاہم سائنس دان کوشش کر رہے ہیں کہ اگلے دس برس میں اس کی مکمل پیمائش کر سکیں۔ وجہ یہ ہے کہ یوں دماغی ہی نہیں کئی جسمانی بیماریوں کا علاج ممکن ہو جائے گا۔

دماغ میں اربوں نیورون موجود ہیں۔ ماہرین نے ہر نیورون کی جینیاتی معلومات، شکل و صورت اور برقی سگنلوں پر تحقیق کر لی ہے۔ نیورونوں میں پوشیدہ ساری معلومات حاصل کرنے کی خاطر ایم۔ آئی۔ ٹی کے محقق نئے نئے روبوٹ بنا رہے ہیں۔ یہ روبوٹ انسانوں کی نسبت ڈیڑھ دفاتر سے کام کریں گے۔

جب بھی انسانی دماغ میں موجود ہر نیورون کا مکمل خاکہ کمپیوٹروں میں محفوظ ہو، جینیاتی علاج (تحرابی) میں انقلاب آجائے گا۔

جسم میں دل دراصل صدر کی حیثیت رکھتا ہے جبکہ دل کو ذریعہ عظم سمجھئے۔ دل سب بات پہنچے کہ ایک زمانے میں دل کو انسانی جسم کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ماضی کے شعرا نے جذبات و احساسات کا مرکز دل کو قرار دیا لیکن جدید سائنس نے انکشاف کیا کہ انسانی جذبات، خیالات و احساسات دماغ میں جنم لیتے ہیں، چنانچہ قدیم شعرا آج پیدا ہو جائیں تو شاید اپنے کئی شعر ضائع ہونے دیکھ کر سر پیٹ لیں۔

اسٹریٹ

کیا ہید یہ

پانچ تاریخی ہوالعجیبیاں



انسان کی زندگی میں ایسے چند حیرت انگیز واقعات ضرور ہوتا ہوتے ہیں کہ وہ ششدر رہ جاتا ہے
 فرش میں ایسے ہی خیر معمولی واقعات کا تذکرہ پیش ہے، جو مکی کو درط حیرت میں ڈال دیں گے

رہنما علی شاہ

اچھا ہوتہ

بڑا ہوتہ



قاتل ٹکسی
 کے دو حملے



نہیں گول حملہ
 ناکا بٹا دیا

کامی کاری

انٹیز ایس کرانت کے دفتر سے ایک تحریری خط موصول ہوا۔ اس خط سے انکشاف ہوا کہ ایڈون نے جس لڑکے کو بچایا، وہ امریکی صدر، ابراہم لنکن کا فرزند، رابرٹ لنکن تھا۔ ایڈون نے بہادری کا جو کارنامہ انجام دیا، اس نے لنکن خاندان میں ہوتھ ہیملی کو متعارف کرا دیا۔ لیکن قسمت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ کئی ماہ بعد ایڈون کے بھائی، جان ولکٹر ہوتھ نے ایسا عمل کیا جو بالکل معکوس تھا۔ یعنی اس نے صدر ابراہام لنکن کو قتل کر ڈالا۔

۲۔ بھائی

ایک بائیک، ایک ٹیکسی

یہ ایک ایسے طبقے کی داستان ہے جس کا رونما ہونا ممکن تھا، لیکن جب وہ انجام پایا اور اس کی بابت لوگوں نے سنایا پڑھا، تو حیرت کے مارے دانتوں تلے اٹھیاں داب لیں۔ واقعے کے متعلق پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ اس کائنات عظیم میں انتہائی اچھے واقعات بھی جنم لے سکتے ہیں۔



انیسویں صدی کے امریکہ میں ایڈون ہوتھ عظیم ترین امریکی اداکار تھا۔ وہ امریکیوں میں دیومائی شہرت کا حامل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ امریکی عام نے اس کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے مین ہٹن، نیویارک جیسے اہم علاقے میں واقع ایک پارک میں ایڈون ہوتھ کا مجسمہ نصب کر دیا۔ عجیب واقعہ کیا پیش آیا؟

جب امریکہ میں خانہ جنگی جاری تھی، تو ایک بار ایڈون بذریعہ ریل نیویارک سے نیوجرسی سٹی گیا۔ جب وہ نیوجرسی اترا تو ہم فیڈر اسے دیکھنے کے لیے اٹھ آیا۔ شوریدہ جھوم کی زد میں آکر ایک لڑکا پلیٹ فارم سے مین اس وقت پھڑی پھر پڑا جب ایک انجن چلا آ رہا تھا۔

اتفاق سے ایڈون سامنے ہی کھڑا تھا۔ وہ لپک کر لڑکے کے پاس پہنچا، اسے اٹھایا اور یوں اس کی جان بچا لی۔ حاضر دماغی اور دلیری کے اس واقعے کی بدولت ایڈون نے وہاں موجود سبھی لوگوں سے وادہ پائی۔ نیز اپنا نام امریکی تاریخ میں زریں حروف سے لکھوایا۔

بعد ازاں زندہ بچ جانے والے لڑکے نے اس واقعے سے متعلق اپنے مضمون میں لکھا: ”جب جھوم کا ریل آیا، تو میں خود پر قابو نہ رکھ سکا اور پھڑی پڑ جا کر۔ میرے اوسان خطا ہو گئے۔ اسی وقت ایک آدمی نے میرے کوٹ کا کالر پکڑا، مجھے اٹھنے میں مدد دی اور چبوترے پر لے آیا۔ جب میں نے مددگار کا شکریہ ادا کرنا چاہا، تو یہ تو مجھ کو حیران رہ گیا کہ سامنے ایڈون ہوتھ کھڑا ہے۔“

فرض کیجیے، آپ ایک نوخیز لڑکے کی حیثیت سے پھڑی پڑ جا کرے اور کوئی مشہور اداکار مثلاً ندیم یا شاہ رخ خان آپ کو بچا لے، تو آپ حیرت زدہ ہو جائیں گے، بس یہی ماجرا اس لڑکے کے ساتھ بھی پیش آیا۔

واقعہ عجیب ترکیوں ہوا؟

۲۔ ہفتے بعد ایڈون کو سربراہ امریکی فوج، جنرل

ایڈون ڈاؤننگسٹ مارچ ۲۰۱۲ء

بیک وقت دو جنم

عجیب واقعہ کیا پیش آیا؟

بینک کلیم امریکہ کا مشہور کارٹونسٹ ہے۔ اس نے ایک کارٹون کردار ”ڈینس دی بینک“ (Dennis The Menace) تخلیق کیا جو ۱۲ مارچ ۱۹۵۲ء کو پہلی بار پبلش امریکی اخبارات میں مزاحیہ کہانی کی صورت شائع ہوا۔

عجیب واقعہ کیا پیش آیا؟

جب کلیم کا ڈینس دی بینک اخبارات کی تریت بنا، تو محض اوقیانوس کے پار برطانیہ میں چند مہینے قبل ایک کامک (مزاحیہ) سیریز، دی بیانو (The Beano) کا شمار نمبر ۳۵۳ وکٹوں پر پہنچا۔ اسی شمارے میں ایسا کارٹون کردار پہلی بار جلوہ گر ہوا جس نے اس کے خالق، ڈیوڈ لاکو عالمی شہرت یافتہ کارٹونسٹ بنا دیا۔ اس کارٹون کردار کا نام ڈینس دی منیک تھا۔

واقعہ عجیب تر کیوں ہوا؟

ویا امریکی اور برطانوی کارٹونسٹوں نے اپنے جو نئے کردار تخلیق کیے، ان کے نہ صرف نام ایک تھے، بلکہ وہ ایک ہی دن منظر عام پر آئے۔ کیا ایسا ہوا کہ امریکی کارٹونسٹ نے برطانوی معاصر کی نقل ماری اور بہت جلد اپنی تخلیق بھی مارکیٹ میں لے آیا؟ یا پھر برطانوی

جولائی ۱۹۷۵ء میں یورپی اور امریکی اخبارات نے یہ خبر صفحہ اول پر چوکھانگ کر شائع کی کہ جزیرہ برمودا کے علاقے ہائلٹن میں ایک ٹیکسی نے ۷۷ سالہ موٹر سائیکل سوار، ارکائن ارنس لیٹن کو مار ڈالا۔



خبر کی خصوصیت یہ تھی کہ پچھلے جولائی کو اسی گلی میں ارکائن کا بڑا بھائی بھی اسی ٹیکسی نے مار ڈالا تھا۔ دونوں لڑکے ۷۷ سالہ تھے اور بقی جان، وہ ایک ہی موٹر سائیکل چلا رہے تھے۔ دیکھیے یہ کیسا ڈیروست اتفاق ہے۔ درست کہ موٹر سائیکل ایک خطرناک سواری ہے۔ یہ بھی تسلیم کہ ہو سکتا ہے، دونوں بھائی تیز پائیک چلا رہے ہوں۔ پھر بھی ایسے اتفاق کم ہی ظہور پذیر ہوتے ہیں۔

واقعہ عجیب تر کیوں ہوا؟

دونوں بھائیوں کی قابل ایک ہی ٹیکسی تھی۔ اسے ایک ہی ڈرائیور چلا رہا تھا اور دونوں ہارسافر بھی وہی تھے۔ کمال کی بات ہے نا؟



دوسرے دن گھر کے باہر مائیکل کی ۲ بیٹیاں اور ۲ بیٹے اپنے بچوں کے ساتھ کھڑے ہوئے اور اخباری فوٹو گرافر نے تصویر کھینچ لی اور واقعی تصویر نے کوشش کر دکھایا۔ ۳ دن بعد لیزہ والدین کے گھر آ گئی۔ اس موقع پر اٹک بارہ خوشی کے لمحات دیکھنے میں آئے۔

واقعہ عجیب تر کیوں ہوا؟

اخباری مضمون لیزہ کی نظروں کے سامنے سے بھی گزرا۔ جب وہ تصویر بغور دیکھ رہی تھی تو اس پر ایک حیرت انگیز انکشاف ہوا۔ تصویر جب کھینچی گئی، تو وہ اسی وقت پس منظر میں فٹ پاتھ سے گزر رہی تھی۔ اسے معلوم نہ تھا کہ اس کا خاندان وہاں رہتا ہے۔ لیزہ یہ بھی نہ جان سکی کہ وہاں تصویر کھینچی جا رہی ہے۔

گویا کیا عجیب اتفاق ہے کہ ۱۰ برس بعد جب لیزہ کا خاندان اس کی گمشدگی کے متعلق ایک اخباری مضمون کی خاطر تصویر پھنوانے لگا تو وہ ان کے پیچھے صرف ۲۰ میٹر دور کھڑی تھی۔ لیزہ نے بعد ازاں اس اتفاق کو ”انتہائی حیرت انگیز“ قرار دیا اور کہا ”شاید قسمت میں یہی لکھا تھا۔“

جاپان کی آسمانی ہوا

ایک قوم خاص طور پر غاصبوں کی زد میں ہو اور اس موقع پر موسم ہمد کو آپہنچے، تو وہ خدا کا شکر ادا کرتی ہے۔ مثال کے طور پر نیپولین اور ہٹلر جیسے جنگ جوؤں نے روس پر حملہ کیا، لیکن دونوں کو برفانی طوفان کے باعث منہ کی کھائی پڑی۔ دونوں واقعات میں حقیقی مجوہ پن یہ ہے کہ نیپولین اور ہٹلر ایسے موسم میں حملہ آور ہوئے تھے جب برف باری کا نام و نشان نہ تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانی تاریخ میں ایسے کئی موسمیاتی مجوہے موجود ہیں جو ہمیں دنگ کر دیتے ہیں۔ مثلاً ۱۸۱۳ء میں غاصب برطانویوں نے واشنگٹن ڈی۔سی کی عمارتوں میں آگ لگا دی تاکہ امریکیوں کا دارالحکومت جل کر راکھ ہو جائے لیکن اسی دن واشنگٹن کی تاریخ کا پہلا ریکارڈ شدہ

کارٹونٹ نے یہ حرکت فرمائی؟ آپ کھڑے سمجھئے، ایسا کچھ نہیں ہوا۔

حقیقت یہ ہے کہ دونوں کارٹونٹ ایک دوسرے سے ناواقف تھے۔ انہیں یہ بھی علم نہ تھا کہ سمندر پار دوسرا فن کار اس جیسا کارٹون کردار ہی تخلیق کر رہا ہے۔ غرض یہ بڑے اونچے پیمانے پر محض اتفاق تھا۔

ڈپسپ بات یہ ہے کہ اس حسن اتفاق کے علاوہ دونوں کارٹون کرداروں میں کوئی مطابقت نہ تھی۔ نینک ٹیم نے اپنے فٹ کھٹ بیٹے کو دیکھ کر اپنا کردار تخلیق کیا۔ ڈیوڈ کا کردار دراصل ایک سابق کامک سیریز کیلون اینڈ ہومس کے کردار، کیلون کی نو تخلیق تھا۔

ٹیم اور ڈیوڈ، دونوں نے بعد ازاں صلاح مشورے سے ملے کیا کہ وہ علیحدہ علیحدہ اپنا کام جاری رکھیں گے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ ڈینس وی ٹینک کے دونوں کرداروں نے اپنے اپنے حلقہ کارئین میں شہرت پائی۔

لیزہ کی واپسی

۱۹۹۷ء میں برطانیہ کی رہائشی ۱۸ سالہ لیزہ بحسب بات پر بغیر بتائے اپنا خاندان چھوڑ کر چلی گئی۔ چونکہ لیزہ کا باپ، مائیکل ڈک مٹی سے شدید ناراض تھا، لہذا اس نے آست و صومٹنے کی کوشش نہ کی۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسے مٹی یاد آنے لگی۔ آخر ۲۰۰۷ء مائیکل نے فیصلہ کیا کہ وہ جہاں میں لیزہ کو ڈھونڈ کر رہے گا۔

عجیب واقعہ کیا پیش آیا؟

چنانچہ اس نے مقامی اخبار، سٹوکنگ فری پریس سے رابطہ کیا اور مدیر کو اپنی داستان سنائی۔ مدیر نے فیصلہ کیا کہ مائیکل کی کہانی شائع کی جائے تاکہ اسے دس برس سے چھوڑی مٹی مل سکے۔ اخباری کہانی کی ضرورت کے مطابق مدیر نے خاندان ہجر کی ایک تصویر کا بھی مطالبہ کیا۔ مدیر کا کہنا تھا کہ تصویر دیکھ کر لیزہ کو یقیناً اپنے پیاروں کی یاد ستائے گی۔



بولاجھانے کہاں سے نمودار ہو گیا۔ اس نے نہ صرف جلتی عمارتوں کی آگ بجھا ڈالی بلکہ برطانوی فوج کا ساز و سامان بھی اڑا لے گیا۔ چنانچہ برطانویوں کو خوار ہو کر پسپا ہونا پڑا۔ لیکن موسمیاتی بولچھبیسوں کی سب سے مشہور مثال وہ ہے جو تاریخ میں ”کامی کا زی“ (Kami Kaze) کے نام سے مقبول ہوئی۔ یہ تیبو بعد کی بات ہے کہ جاپانی خود کش یاٹنوں کے لیے یہ اصطلاح استعمال ہوئی۔

عجیب واقعہ کیا پیش آیا؟

چین اور کوریا سے کیا گیا۔ جب چین پر قبائلی خان کی حکومت تھی اور اس نے جاپان میں فتح یابی بنانے کے لیے ہر ممکن وسائل استعمال کیے۔

ماہ اگست کے وسط میں منگول سپاہ اسی ہاکاٹا بے میں جاپانی فوجیوں سے ٹکرائی جہاں بڑے رسالے اسی سے پسپا ہونا پڑا تھا۔ اس بات بھی ان کی پیشتر جنگی جہاز تیار و برپاد ہو گئے اور منگولوں کی تباہی کا ذمہ دار سمندری طوفان تھا۔

واقعہ عجیب ترکیوں ہوا؟

ممکن ہے، آپ سوچ رہے ہوں کہ شاید جب جاپان میں سمندری طوفانوں کا آنا جانا معمول تھا۔ آپ کی سوچ غلط ہے۔ ہاکاٹا بے میں شدید سمندری طوفان آنا معمول نہیں، پھر منگولوں نے پہلا حملہ ماہ نومبر میں کیا جب جاپان میں سمندری طوفان کا موسم ختم ہو جاتا ہے۔ (جاپان میں موسم گرما کے دوران سمندری طوفان آتے ہیں۔)

جاپانی موسمیات دان بتاتے ہیں کہ ایک سے تین سو سال کے درمیان شدید سمندری طوفان ہاکاٹا بے پر بلند ہوتا ہے لیکن یہ منگولوں کی بد قسمتی ہے کہ وہ جب بھی جاپان پر حملہ آور ہوئے، شدید سمندری طوفانوں کا نشانہ بن گئے۔ اسے اتفاق سمجھئے یا عجیبی مدد!



یہ نومبر ۱۲۷۴ء کی بات ہے جب منگولوں نے سمندر کے راستے جاپان پر پہلا حملہ کیا۔ منگول فوج ۸۰۰ جنگی بحری جہازوں اور ۲۳ ہزار فوجیوں پر مشتمل تھی۔ منگول دو ہفتوں بعد جاپانی بندرگاہ، ہاکاٹا بے پہنچ گئے اور وہاں اپنی ابتدائی چوکی قائم کر لی۔ اس زمانے کی جاپانی شاہی حکومت بہت کمزور تھی۔ لہذا اس صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ منگول سپاہ کے سامنے نہیں ٹھہر پائے گی۔ چنانچہ ۱۹ نومبر کو منگولوں نے حملہ کیا، تو انھیں اپنی جیت یقینی نظر آ رہی تھی۔

عجیبی موسم نے مداخلت کر ڈالی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک زبردست سمندری طوفان نے ہاکاٹا بے پر دھاوا بول دیا۔ وہ آنا تھا جیسے یاٹاں سے نمودار ہوا اور منگولوں کے تین سو بحری جہاز نہالے گئے۔ منگول پر جاپانیوں کے ساتھ مزید ایک دن لڑے، پھر تھکی جلی بنے وگن واپس روانہ ہو گئے۔ ان کی حالت زار دیکھ کر یہ ہاتھ نہیں لگتا تھا کہ یہ وہی منگول ہیں جنہوں نے کوریا سے ہنگری تک دنیا کو بلا ڈالا اور کئی نامی گرامی سلطنتیں نیست و نابود کر دیں۔

لیکن منگول بھی بہت ہارنے والوں میں سے نہیں تھے۔ ۱۲۸۱ء میں وہ زیادہ لاؤٹشکر لیے پھر حملہ آور ہوئے۔ اس بار حملے میں ۳ ہزار جنگی بحری جہاز شریک ہوئے جن پر ایک لاکھ چالیس ہزار فوجی سوار تھے۔ مزید براں یہ حملہ دو اطراف

یادش بخیر

جب ننیدہ بلوچ سردار نے کہا
ہم نے نہ پہلی مرتبہ
پنجاب کی آنکھوں میں
آنسو دیکھے، اگرچہ
آنسو کافی آنکھ کے ہیں

ممتاز بلوچ راہنما
سردار عطاء اللہ میمن
سے ایک یادگار ملاقات کے حوالہ

نظر جمال بلوچ

www.Paksociety.com

ان دنوں کا ماجرا ہے، جب بھٹو صاحب کے دور حکومت میں نیشنل عوامی پارٹی کی حکومت ختم کر کے بلوچستان میں گورنر راج نافذ کر دیا گیا اور صوبہ میں فوجی کارروائی کا آغاز ہوا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے سردار عطا اللہ مینگل کی حکومت کی برطرفی کے ذریعے جمہوریت اور جمہوری روایات کا قتل عام کیا اور بلوچستانی عوام کو احساس محرومی سے دوچار کر دیا۔

ان حالات میں اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان نے صدائے احتجاج بلند کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ بلوچستان کو دوسرا بنگلہ دیش بننے سے روکا جاسکے۔ جمعیت کے ناظم اعلیٰ کی حیثیت سے میں نے اپنے دورے کا آغاز کوئٹہ سے کیا جہاں سائنس کالج میں طلبہ کا بھرپور جلسہ ہوا۔ اس جلسے میں ناشر ہزاروں طلبہ شریک تھے۔ اس موقع پر بھٹو کی طرف سے فوجی کارروائی اور صوبائی حکومت کی برطرفی کی پُر زور مذمت کرتے ہوئے جمعیت کی طرف سے بلوچستانی عوام اور نوجوانوں کے ساتھ مکمل یک جہتی کا اظہار کیا گیا۔

جلسے کے بعد دفتر جمعیت پہنچے تو معلوم ہوا کہ سردار عطا اللہ مینگل نے رات کے کھانے کی دعوت دی ہے۔ یہ ان سے بالمشافہ پہلی ملاقات تھی۔ بہت محبت سے ملے، دعوت کا انتظام بھی خوب تھا۔ چونکہ سائنس کالج کی تقریر کی بازگشت ان تک پہنچ چکی تھی، اس حوالے سے انہوں نے جمعیت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے مجھے یوں خطاب کیا، ”ہم نے پہلی مرتبہ پنجاب کی آنکھوں میں آنسو دیکھے ہیں، اگرچہ یہ آنسو کافی آنکھ کے ہیں۔“

میں نے موقع پاتے ہی کہا ”سردار صاحب! آپ بتائیں کہ آپ نے بلوچستان کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کے حوالے سے کبھی پنجاب یا پاکستان کو آواز دی؟ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت جرنیلوں کی مکرانی رہی ہو یا سیاسی قیادتوں کی، کبھی نے ایک صوبے کی آواز

دوسرے صوبوں تک پہنچنے سے روکی، بدگمانیاں پیدا کیں اور آپ لوگوں کو تلک کی پٹندوں اور دہشت گردوں کے طور پر پیش کیا۔ آپ اپنا مقدمہ دوسرے صوبوں میں پیش کر سکتے تھے۔ لیکن آپ نے بھی خود کو اپنے صوبے تک محدود کر لیا۔ نتیجے دوسرے صوبے تصویر کا دوسرا رخ دیکھنے سے محروم رہے۔ ان حالات میں ان سے کیسے توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ صدائے احتجاج بلند کریں، یا ان کی آنکھ سے آنسو نکلیں؟“

سردار صاحب کہنے لگے ”ہم تلک کی نہیں چاہتے، ہمیں معلوم ہے کہ موجودہ حالات میں ”آزادی“ کے نام پر ہونے والی کوشش ہمیں ایک بڑی غلامی کی دلدل میں ڈھیل دے گی۔ ہم آزادی کے نام پر یا تو بھارت کے غلام بنیں گے یا ایران کے۔ ہمیں ان میں سے کسی کی بھی غلامی قبول نہیں، لیکن ہم کیا کریں، جب ہمیں دیوار کے ساتھ لگا دیا جائے تو جھنجھلاہٹ کے عالم میں حقائق نظر انداز کرتے ہوئے سخت قدم ناکزیر ہو سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ آئندہ فلسطین کو بھگتنا پڑتا ہے۔ ہم نے نوجوانوں کے جذبات کے سامنے بند باندھنے کی کوشش کی ہے۔ اگر حکمرانوں نے ہمیں کوئی راستہ نہ دیا تو یہ بند ٹوٹ بھی سکتے ہیں۔ اس صورت میں ہم کچھ کر سکیں گے۔“

مجھے ان کی باتوں میں غلوں، حب الوطنی اور درومندی کی خوشبو محسوس ہوئی۔ میں نے ان سے کہا، ”ہماری بد نصیبی ہے کہ ملک قائد اعظم اور شہید ملت کے بعد قدر اور شخصیات سے محروم ہو گیا۔ ان سبب نوجوانوں کی مکرانی ہے اور وہ نہیں جانتے کہ کوئی قدر اور شخصیت ان کے مقابل آئے۔ آپ لوگوں کے رویوں نے ان کے لیے مزید آسانیاں پیدا کر دیں۔ آپ بلوچستان سے باہر نکلیں، بلوچوں کا مقدمہ پیش کریں، جمعیت آپ کے ساتھ تعاون کرے گی۔ آپ محسوس کریں گے کہ حقائق جاننے کے بعد دوسرے صوبوں کے عوام کیسے آپ کا ساتھ دیتے ہیں۔“ میں نے انہیں دعوت دی کہ وہ اپنے دورے کا آغاز پنجاب سے کریں، جلسوں کا انتظام جمعیت کرے گی۔

کہنے لگا کہ آپ بس سے نیچے اتر آئیں۔ کالیم صوبہ بلوچستان کو خطرہ ہوا کہ کہیں یہ کوئی زیادتی نہ کریں، اس لیے فوراً کھڑے ہوئے اور کہا کہ یہ ہمارے مہمان ہیں، آپ نے کوئی بات کرنا ہے تو میں حاضر ہوں۔

اس نوجوان نے کہا کہ آپ بھی نیچے آ جائیں۔ لہذا ہم دونوں بس سے اترے۔ بس سے اترتے ہی جیپ کے پانی نوجوان بھی ہمارے گرد جمع ہو گئے۔ ہم سے مصافحہ کیا اور کہا ”سرور عطا اللہ میٹکل نے ہمیں یہ ہدایت کی تھی کہ آئے والے ان مہمانوں کا خیر مقدم کیا جائے، لہذا ہم آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ اب آپ بس کے بجائے ہماری جیپ میں جلسہ گاہ بنائیں۔“

یہ سننے ہی ہم نے ”موچھوں کو تاؤ دیا“ اور اُن کے ساتھ جیپ کی اگلی نشست پر بیٹھ گئے۔ جلسہ گاہ پہنچے تو نوجوانوں کے ساتھ مقامی آبادی کی بھی بڑی تعداد موجود تھی جب کہ فوج نے جلسہ گاہ کو گھیر رکھا تھا۔ ان حالات میں گفتگو کا آغاز ہوا۔ میں نے فوجی جوانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ قوم اپنا پیٹ کاٹ کر آپ کی ضروریات پورا کرتی ہے کہ خطرے کی صورت میں آپ سرحدوں کا دفاع کریں۔ آج وہ اسلحہ جو دشمن کے سینے میں اتارنے کے لیے آپ کے حوالے ہوا، اسی سے آپ اپنوں ہی کے سینوں کو چھلنی کر رہے ہیں۔ یاد رکھو، دنیا کی مضبوط ترین فوج بھی محض اسلحے کے زور پر دشمن کے مقابلے میں کامیابی حاصل نہیں کر سکتی، جب تک اس کی پشت پر بہنوں، بیٹوں اور ماؤں کی دعا گیں نہ ہوں۔ آپ کو اپنے ہی لوگوں سے لڑاتے ہوئے عملاً ناکام، بہنوں اور بیٹوں کی دعاؤں سے محروم کیا جا رہا ہے۔ اس لیے اپنے کردار پر غور کریں۔“

خضدار کی طرح قریباً ہر ضلع میں ہمارے کامیاب پروگرام ہوئے۔ دورہ مکمل ہوا تو حسب وعدہ سرور عطا اللہ میٹکل چٹاب تشریف لائے۔ اُن کا پہلا جلسہ گوہر اقبال میں منعقد ہوا، ایک ہم غنیر اُن کی بات سننے کے لیے موجود تھا۔ تقریر ختم ہوئی تو لوگوں کے جوش و جذبہ

انھوں نے ہماری دعوت قبول کرستے ہوئے شکر یہ ادا کیا اور اگلے جلسے کے بارے میں استفسار کیا۔ میں نے بتایا کہ صبح انشاء اللہ خضدار میں جلسہ ہوگا۔ انھوں نے ہمیں ہر قسم کے تعاون کی پیشکش کی۔ ہم نے شکر یہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں صرف دعاؤں کی ضرورت ہے۔ رات گئے یہ مجلس برخواست ہوئی، ہم وہاں سے بسوں کے اڈے پر پہنچے اور خضدار جانے والی بس میں سوار ہو گئے۔ فجر کے وقت بس خضدار شہر سے کچھ دور تھی کہ اچانک جیپ میں سوار کا اشکوف بردار نوجوانوں نے بس روک لی۔ ناظم صوبہ بلوچستان میرے ساتھ تھے۔ وہ انہیں دیکھتے ہی پریشان ہو گئے اور کہنے لگے کہ یہ پی۔ ایس۔ او کے نوجوان ہیں۔ نہ جانے ان کے عزائم کیا ہوں۔ ابھی یہ بات ہو رہی تھی کہ ایک نوجوان بس میں داخل ہوا اور ادھر ادھر نظر دوڑا کر کہنے لگا کہ تم میں سے ظفر جمال کون ہے؟ میں نے بتایا کہ ”میں ہوں ظفر جمال۔“ وہ نوجوان

ہم علیحدگی نہیں چاہتے۔ ہمیں معلوم ہے کہ آزادی کے نام پر ہونے والی کوششیں ہمیں ایک بڑی غلامی کی دلدل میں دھکیل دیں گی۔

اور اُن کے عقیدت کا یہ عالم تھا کہ وہ بے اختیار اُن کے ہاتھ چوم رہے تھے۔

بھٹو کو مینٹل صاحب کے اس پہلے جلسہ سے ہوا کا رخ بدلنے کا اندازہ ہو گیا، لہذا انھوں نے صورت حال سے نمٹنے کے لیے دو کام کیے، ایک طرف عطا اللہ مینٹل صاحب کو صوبہ بدر کر دیا، دوسری طرف دورہ سندھ کے دوران جب میں شہدادکوٹ پہنچا تو مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ یوں جمعیت کی طرف سے جو تحریک سردار صاحب کی صوبہ بدری اور بلوچستان کے حوالے سے چلنی تھی، وہ ”ناظم اعلیٰ کی رہائی“ کے نعرے میں بدل گئی۔

اس پہلی گرفتاری کے بعد بھٹو صاحب کے پورے دور میں رہائی اور گرفتاری کے حوالے سے آنکھ پھوٹی کا سلسلہ جاری رہا۔ طلبہ تحریک ہونے کے ناتے ہمارا دائرہ محدود تھا اور اپنی حد تک ہم نے ذمے داریوں کو ادا کیا۔ لیکن اُس وقت کے سیاستدان بحیثیت جموئی وہ کردار ادا نہ کر سکے جس کا تاریخ اُن سے مطالبہ اور تقاضا کرتی رہی اور یوں وہ کبھی تاریخ کے مقروض و مجرم ہی ٹھہرے۔

سردار عطا اللہ مینٹل آج ہمارے درمیان موجود ہیں، جبکہ سردار اکبر کبھی اللہ کے حضور حاضر ہو گئے۔ مگر میں آج بھی سمجھتا ہوں کہ صوبے کی یہ دونوں قدر آور شخصیتیں پاکستان کو بہت کچھ دے سکتی تھیں۔ افسوس، اس ملک کے گونا گونہ حکمرانوں نے پاکستان کو ان کی صلاحیتوں سے فائدہ نہیں اٹھانے دیا۔ سردار عطا اللہ مینٹل سے ملاقات ہو تو میں آج بھی ان کے لیے ہی احترام کے جذبات رکھتا ہوں۔ اہل پاکستان اور اہل پنجاب کسی کانڈی اور سیاسی بلوچستان چیلنج کی بات نہیں سمجھتے۔ انہیں اپنے بلوچ بھائیوں کے دکھ درد اور تکلیف کا بخوبی اندازہ ہے۔ اس لیے سردار صاحب کو لاہور آکر اپنے دل کی باتیں کھل کر کرنی اور کہنی چاہیے۔

آج بلوچستان آگ میں جل رہا ہے، لوگوں کو اغوا کیا جا رہا ہے۔ مذہبی نفرتوں کو ہوا دی جا رہی ہے۔ سی آئی اے، را اور موساد کو کھل کھیلنے کا موقع مل رہا

تاریخ آج بلوچوں کی دلی آواز سننے کا مطالبہ کر رہی ہے مگر یہ حکمران تو اپنے قرب و جوار میں جینے اور پسے والے عوام کی آواز نہیں سنتے، تاریخ کی کب سنیں گے۔ کون ہے جو تاریخ کی آواز سننے کو تیار ہو؟

ہے۔ پہنچ پارٹی ہی کی حکومت ہے۔ حکمرانوں کے پاس محبت موجود ہیں لیکن انہیں ملک و قوم کی نسبت صرف اپنے مفاد اور اقتدار سے محبت ہے۔ انھوں نے خود پر این۔ آر۔ او کی چھتری تان رکھی ہے، ملکی وسائل دونوں ہاتھوں سے لوٹے جا رہے ہیں۔ ان میں سے کوئی نہیں جو بلوچستان کا احساس محرومی دور کرنے کے لیے سنجیدہ تدبیر اختیار کرے، بلوچستان کی قیادتوں سے مذاکرات کا راستہ اپنائے اور بلوچستان کی حقیقی قیادت کو سیاست کے مرکزی دھارے میں لانے کے لیے سوچ بچار کرے۔



آئروان جنوں نے اسلامیان کی تاریخ بدل دی

استاد اعظم نے پہلا جھلکا بک میں اپنے زخمی بسٹوں کو دکھ کر لایا تھا

۲۱ سے ۲۳ مارچ

ہماری قومی زندگی میں آج بھی بہارا سکتی ہے

نویسہ احمد

بچے صدیوں کی تاریخ تھی۔ مسلمانوں کی عظمت و شوکت کی داستانیں بھی قصیں اور زوال و پستی کے لیے بھی لیکن تاریخ کے قراء میں مسلم قومیت کا چراغ ہمیشہ فروزا رہا۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ قائد اعظم سبھا پر عداوت پر جنگ لڑتے آئے اور وہیں نے اپنے سارے حریفوں کو چاروں شانے چت کر دیا۔ یہ بہت اور طاقت قائد اعظم میں ان کے چنپہ ایمانی نے پیدا کی تھی۔ اس عظیم قائد نے مسلمانوں کی قیادت کا حق ادا کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال نے فرمایا تھا:

نگاہ بلند، سخن و نواز، جاں پر سوز
یہی ہے رحمت سفر میر کارواں کے لیے

قائد اعظم محمد علی جناح کی بصیرت افروز اور بے لوث قیادت میں قائد آزاد کی کامرانی ۱۹۴۷ء تک

۱۹۴۰ء کا دن

اسلامیان عالم کے لیے باہم اور

۲۳ مارچ

مسلمانانِ ہند کے لیے باہم کے لیے جدوجہد کی علامت ہے۔ اس روز بھارتی مسلمانوں نے قائد اعظم کی قیادت میں ایک نئی اسلامی مملکت کی تشکیل کے لیے عہد و پیمان باہم عداوت پر پانچ اور تین راہوں پر چل گئے۔

قائد سالار کو چونکہ اپنے مقصد کی صداقت پر کامل یقین تھا اس لیے یہ قائد تیز و تیز ہواؤں کے باوجود سوئے منزل چلتا رہا اور ہر سال کی مختصر سی مدت میں اپنا نصب العین حاصل کر لیا۔ یوں دنیا کے نقشے پر ایک عظیم اسلامی سلطنت ابھری، جس کا بانی پرچم جنوب میں بحیرہ عرب سے لے کر شمال کی برقانی چوٹیوں تک ابھرا رہا ہے لیکن یہ طر آوازی صرف ہر برس پر ہی نہ تھا، اس کے

قائد اعظمؒ کے آج لاہور آنے کی خبر عام تھی۔ صبح صبح ہی لاہور شہر اور ملک بھر سے آئے لاکھوں مسلمان ریلوے اسٹیشن کی طرف رواں دواں ہو گئے۔ ریل گاڑی پہنچنے سے قبل ہی ریلوے اسٹیشن کے اندر اور باہر دُور دُور تک انسانوں کا ٹھنڈا مارا سمندر موجیں لے رہا تھا۔ مسلمان اپنے محبوب لیڈر کو خوش آمدید کہنے گھنٹوں جہوم میں کھڑے رہے۔ صبح ۹ بجے فرنیچر میل اپنے وقت پر پلیٹ فارم قہر ایک میں داخل ہوئی۔ انسانوں کے بے پناہ سمندر میں زبردست ہلچل پیدا ہوئی اور فضا اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اُٹھی۔ اس سے قبل ہر ریلوے اسٹیشن پر مسلمانوں کے جہوم منع تھے جو قائد اعظمؒ کو دیکھ کر غمخیز لگاتے۔ قائد اعظمؒ اپنے سیلون سے ہاتھ بلا کر ان کے جوش و جذبے کا جواب دیتے رہے۔

لاہور ریلوے اسٹیشن پر جو بھی گاڑی کھڑی ہوئی، قائد اعظمؒ کا مسکراتا ٹکفٹہ چہرہ ان کے مخصوص سیلون کے دروازے پر نمودار ہوا۔ انہوں نے اپنے دل آویز اور عوام کے دل بیت لینے والے انداز میں ہاتھ ہلایا۔ محترمہ فاطمہ جناح بھی ان کے ساتھ تھیں۔ قائد اعظمؒ کو اپنے سامنے پا کر نعروں میں ایک نیا جوش و جذبہ پیدا ہو گیا۔ نعروں کی شدت سے ریلوے اسٹیشن کے دروازے کا پٹنہ لگے۔ قائد اعظمؒ کچھ دیر اس جوش و خروش کا نظارہ کرتے۔ ہاتھ ہلاتے اور مسکراتے رہے۔

۱۹ مارچ کے المناک واقعے کی وجہ سے آپ نے جلوس کی صورت جانا مناسب نہ سمجھا۔ اعلان کر دیا گیا کہ تمام حاضرین اپنے گھر چلے جائیں۔ بعد ازاں قائد اعظمؒ اسٹیشن سے سیدھے ممدوٹ ہاؤس پہنچے، اُس وقت ساڑھے دس بج چکے تھے۔ ممدوٹ ہاؤس میں ملکی اور غیر ملکی ذرائع ایلاچ موجود تھے۔ قائد ساڑھے گیارہ بجے تک اُن سے مصروف گفتگو رہے پھر وہاں سے سیدھے سیوہسپتال میں زیر علاج ڈرشی خاں سارو کی کی مزاح پڑی کرنے روانہ ہو گئے۔

پہنچا۔ قائد اعظمؒ نے تقسیم ہند اور قیام پاکستان کے مطالبے کے لیے عروس الہاد لاہور شہر کو منتخب کیا اور آل انڈیا مسلم لیگ کا ۲۷ رواں اجلاس ۲۱ تا ۲۴ مارچ ۱۹۳۰ء منٹو پارک میں طلب کر لیا۔

لاہور پنجاب کا دارالحکومت اور سر سکندر حیات وزیر اعظم پنجاب کی یونیٹ پارٹی کا گڑھ تصور کیا جاتا تھا۔ قائد کا یہ اعلان انگریز حکومت اور ہندو قیادت پر ٹکلی بن کر گرلا۔ سر سکندر حیات اور ان کے ساتھی برصغیر کے ۱۰ ارگرو مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گئے تاکہ اپنے آقا انگریز اور ہندو کو خوش کر سکیں۔ یہ ٹوڈی جاکیر دار اور برطانوی ماحول کے ہندوؤں کے پروردہ لوگ بھی یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ انگریز برصغیر چھوڑنے پر مجبور ہو سکتا ہے۔

یونیٹ حکومت نے شخص ۲۳ مارچ کا مسلم لیگ جلسہ عام روکنے کے لیے ۱۹ مارچ کو خاکساروں کی عظیم الشان ریلی اور پریڈ کے مظاہرے پر جس میں ۳۱۳ خاکساروں کا میٹیں شامل تھا، پولیس کارروائی کا فیصلہ کیا۔ پولیس نے بغیر کسی اشتعال انگیزی کے بے تحاشا قابروگی کی اور ۱۰۰ سے زیادہ خاکساروں کو شہید کر دیا۔ یونیٹ حکومت نے پھر طے شدہ پروگرام کے مطابق لاہور شہر کے کچھ علاقوں میں کرفیو نافذ کیا اور شہر میں فوج گشت کرنے لگی۔ سر سکندر حیات نے چند مسلم لیگی لیڈروں کے ذریعے مسلم لیگ کا جلسہ ملتوی کرانے کی کاوشیں شروع کیں مگر قائد اعظمؒ تیار نہ ہوئے۔

مسلم لیگ نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنا ۲۷ رواں اجلاس اعلان شدہ تاریخوں کے مطابق منٹو پارک میں ہی منعقد کرے گی۔ یونیٹ لیڈر سر سکندر حیات نے متعدد وجوہ کا بہانہ بنا کر جلسے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ اس پر مسلم لیگی لیڈروں کے ساتھ ساتھ برصغیر کے مسلمانوں نے شدید احتجاج کیا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ خانی میدان خیموں، قاتلوں اور شامیانوں کا ایک بڑا شہر بن گیا، جگہ جگہ دکانیں اور سٹال لگ گئے۔

ایسی گزری سماں ہے محمد علی جناح
غیروں کے دل بھی سینوں کے اندر دہل گئے
مظلوم کی فغاں ہے محمد علی جناح

باہر سے آنے والے متدوین کی تعداد ۲۰ ہزار کے
لگ بھگ تھی جو ہندوستان کے ہر حصے سے آئے تھے تاکہ
مسلمانوں کے مستقبل اور آئندہ اتحاد عمل کے بارے میں
کوئی فیصلہ کر سکیں۔ ان متدوین کی رہائش اور خور و نوش کا
انتظام بڑا سختی پیش تھا۔

قائد اعظم نے اپنی صدارتی تقریر میں یہ اعلان کیا
کہ مسلمان اقلیت میں نہیں۔ لفظ قوم کی کوئی بھی تعریف
ہو، ہر لحاظ سے مسلمان ایک قوم ہیں، چنانچہ ان کا اپنا علاقہ
اور اپنی مملکت ہونی چاہیے۔ اس اعلان پر جلسہ گاہ میں
فلک بکاف نعرے بلند ہوئے۔ قائد اعظم نے صاف
لفظوں میں واضح کیا کہ اگر برطانوی حکومت نے
مسلمانوں پر کوئی ایسا آئین یا تصفیہ تصویب جسے ان کی تائید
اور منظوری حاصل نہ ہو تو مسلمان زبردست مزاحمت کریں
گے۔ مسلم ہندوستان ایسا کوئی آئین قبول نہیں کر سکتا جس
کے تحت ہندو اکثریت کی حکومت قائم ہو جائے۔ اگر انگریز
دل سے یہ چاہتے ہیں کہ برصغیر کے لوگ امن اور چین سے
رہیں اور خوشحال ہوں تو اس کا ایک ہی راستہ ہے کہ ہندوستان
کو خود مختار قومی مملکتوں میں تقسیم کر کے یہاں کی بڑی قوموں
کو جداگانہ وطن دیا جائے۔ قائد اعظم نے اپنی طویل اور
معجزہ آرا تقریر ختم کرنے کے بعد اعلان متوی کر دیا۔

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء

یہ اجلاس مارچ کے آخری عشرے میں ہو رہا تھا۔ ان
دنوں میں لاہور کا موسم کافی خوشگوار ہوتا ہے کیونکہ سردیاں
رخصت ہو جاتی اور گرمیوں کی آمد آمد ہوتی ہے۔ درختوں
کی شاخوں پر نئے پتے چھوٹے لگتے ہیں اور ہر سو زندگی
مسکراتی اور ہنسی دکھائی دیتی ہے۔

منٹو پارک کے اس حصے میں جہاں آج منار پاکستان
کھڑا ہے، ٹھاس کے قہقہے نہیں تھے جبکہ چٹیل میدان تھا۔

ہسپتال میں آپ ایک ایک دفعتی خاکسار کے پاس گئے۔
شام کو قائد اعظم منٹو پارک میں تشریف لائے جہاں
ہزاروں افراد نے آپ کا استقبال کیا۔ آپ نے مسلم لیگ
کا سبز پرچم ہنڈال کے سامنے لہرانے کے لیے رسم
پرچم کشائی ادا کی۔ بعد ازاں پورے برصغیر سے آئے
ہوئے مسلم لیگ مینبر پیش گارڈ نے آپ کو سلامی دی۔ اس کے
بعد نیشنل گارڈ نے انتظامی معاملات سنبھال لیے۔ اپنی مختصر
تقریر میں قائد اعظم نے پہلا فقرہ یہ ہی کہا کہ میں اپنے
رُشی بیٹوں کو دیکھ کر آیا ہوں۔ اس پر غلوں اور محبت بھرے
فقرے نے مجمع کا جوش و جذبہ سوا کر دیا۔

۲۲ مارچ ۱۹۴۰ء

نماز جمعہ کے بعد مسلم لیگ کے ۲۷ روئ سالانہ
اجلاس کا پہلا سیشن ہوا۔ یہ کھلا اجلاس تھا جس میں
لاکھوں کی تعداد میں مسلمانان ہند شریک ہوئے۔ جلسہ گاہ
میں تیل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ بادشاہی مسجد تک انسانوں
کے سر ہی سر نظر آتے تھے۔ اس جلسے میں باہر سے آنے
والے مسلم لیگی راہنما اور کارکن اپنے اپنے علاقوں کے
مخصوص لباس پہنے ہوئے تھے، ان میں سے بعض عمر رسیدہ
بھی تھے لیکن ان کے عزائم جواں تھے۔ عورتوں کی خاصی
تعداد بھی موجود تھی۔ نعرے لگتے تو یہ عورتیں بھی اپنے
جوش و خروش کا اظہار کرتی۔

قائد اعظم محمد علی جناح کی صدارت میں اس تاریخی
اور عظیم الشان جلسے کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔
جس کے بعد انور قریشی نے میاں بشیر احمد کی قلم پیش کی:

ملت کا پاساں ہے محمد علی جناح
ملت ہے جسم، جاں ہے محمد علی جناح
تصویر عزم، جان وفا، روح حریت
ہے کون، ہے گماں ہے محمد علی جناح
رکتا ہے دل میں تاب و نواں نو کروڑ کی
کہنے کو نالتوں ہے محمد علی جناح
لگتا ہے ٹھیک جا کے نشانے پہ اس کا تیر

www.Paksociety.com

میں پورے برصغیر سے آئے مسلم لیگی قائدین تشریف فرما تھے۔ اس اجلاس میں برصغیر کا کوئی کو ایسا نہیں تھا جس کی نمائندگی نہ ہو۔ اس تاریخی موقع پر بھی ہندوستانی مسلمان ایک پرچم تلے جمع تھے۔

قائد اعظم اس اجلاس میں سفید اپکن اور چوڑی دار پا جاسے میں بیٹوس تھے۔ سر پر اپنی مخصوص ٹوپی پہن رکھی تھی جسے ”جناح کیپ“ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ گلے میں یک چشمی عینک (مونوکل) لٹکی ہوئی تھی۔ محترمہ فاطمہ جناح ان کے ساتھ تھیں۔ نوابزادہ صدیق علی خاں قائد اعظم کی کرسی کے مین پیچھے اپنی پُر وقار شخصیت کے ساتھ کھڑا تھا۔ کھڑے تھے۔

ملاقات کامیاب کے بعد نوابزادہ لیاقت علی خاں نے سالانہ کارکردگی کی تفصیل پیش کی جو منظور کرنی گئی۔ منظور کی کے بعد شیر بنگال ایدالقام فضل الحق نے انگریزی میں قرارداد پیش کی، بعد ازاں اس کا درج ذیل اردو ترجمہ مولانا ظفر علی خاں نے پیش کیا:

”آل انڈیا مسلم لیگ کا یہ اجلاس اپنی اس پختہ رائے کا اظہار کرنا ضروری سمجھتا ہے کہ اسلامی ہند اس وقت تک مطمئن نہیں ہوگا جب تک آئین ہند کا مسئلہ اسر نوٹے نہیں کیا جاتا۔ وہ کوئی تہاقل آئین اس وقت تک قبول نہیں کریں گے جب تک ان کی خواہش و مذاک کے مطابق نہیں بنایا جاتا۔“

”اس اجلاس کی مزید رائے یہ ہے کوئی آئین ملک کے لیے قابل عمل اور مسلمانوں کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتا اگر وہ اس اساس پر مبنی نہیں کہ جغرافیائی لحاظ سے ملحق حصوں کو حدود کی مناسب تبدیلی کے بعد اس طرح ملا دیا جائے کہ ہند کے شمال مغربی اور مشرقی علاقے، جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، آزاد ریاستوں میں بدل جائیں اور ان کے ترکیبی اجزاء خود مختار ہوں۔ نیز ان حصوں اور علاقوں میں اقلیتوں کو ان کی مرضی کے مطابق مناسب اور موثر آئینی تحفظات دیے جائیں تاکہ ان کے مذہبی، اقتصادی، سیاسی اور دیگر حقوق و مفادات محفوظ رہیں

اس میدان میں آئم کے ذریعہ تھے جن کی چھٹاؤں میں بے فکرے اور کھنڈرے لڑکے پنجاب کا عوامی حیل گلی ڈنڈا کھینچتے۔ بدلتے موسم کی خوشگوار فضا میں زندہ دوان لاہور چنگ پازی سے دل بہلاتے۔ خصوصاً اتوار کو اکٹھے ہو کر چنگوں کے بیچ لڑانے کے لیے منو پارک ایک مشہور مقام تھا۔ کھنڈرے اور بے فکرے لڑکوں کو جب معلوم ہوا کہ اس میدان میں مسلم لیگ کا اجلاس ہونا ہے تو وہ گلی ڈنڈا بھول رضا کاروں کے ساتھ مل کر اس ناہوار جگہ کو جلسہ گاہ میں تبدیل کرنے کے لیے شانہ بیٹان آکھڑے ہوئے۔

مسلمانان ہند کی بے کیف زندگی میں قرارداد پاکستان بہار کا ایک جھوٹا بن کر آئی اور ان کے لیے حیات نو کا پیغام لائی۔ ہر سال ۲۳ مارچ کا دن ہمیں یاد دلاتا ہے کہ اگر ہم وہی چند ہزارہ کر لیں جو ۱۹۴۰ء میں تھا، تو ہماری قومی زندگی میں آج بھی بہار آسکتی ہے اور علامہ اقبال کا یہ پیغام یاد رکھیں:

فرد قائم ربط ملت سے ہے، تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں پیروں دریا کچھ نہیں

۲۳ مارچ کی ایک اور اہمیت بھی ہے۔ ۱۹۵۶ء میں جب آئین بنا اور اس میں پاکستان کو اسلامی جمہوریہ قرار دیا گیا تو یہ تاریخی دن یوم پاکستان کے ساتھ ساتھ یوم جمہوریہ بھی کہلانے لگا۔

اس تاریخی دن جلسہ گاہ میں فرزمان توحید کا بے پناہ اہوم تھا۔ اگر کو مسلمانوں کے دلوں کی دھڑکن، ان کے بے تاج بادشاہ، سالار قوم، قائد اعظم محمد علی جناح ۳۰ مارچ ۱۹۵۰ء منٹ پر پنڈال میں داخل ہوئے۔ ٹیچس گارڈز نے آپ کو سلام پیش کی۔ جلسہ گاہ کیا تھا، زندہ انسانوں کے جوش و خروش سے بھرا ایک سمندر تھا، لیکن عظیم راہنما کی موجودگی میں ہر طرف اطم و ضبط نظر آ رہا تھا۔ قائد کو خوش آمدید کہنے کے لیے لوگ احرام کھڑے ہوئے اور پھر بیٹھ گئے۔ قائد اعظم ”کری سمدارت پر روتی افروز ہوئے تو ان کے دائیں بائیں اور عقب

فرمانی۔ حاضرین کی اکثریت انگریزی سے نااہل ہونے کے باوجود بدھ تن کو ش تھی۔ آپ کے خطبے کا مکمل متن تو یہاں درج کرنا ممکن نہیں، چنداقتباسات پیش ہیں:

”مجھے میں یہ نہیں آتا کہ ہمارے ہندو دوست اسلام اور ہندو مذہب کی اصل حقیقت سمجھنے کی کیوں نہیں کوشش کرتے؟ ان دونوں مذاہب کو عرف عام معنی میں لینا درست نہیں۔ درحقیقت یہ ۲ مختلف اور جداگانہ تمدن ہیں اور یہ محض ایک خواب ہے کہ ہندو اور مسلم ایک متحدہ قوم بن جائیں گے۔ یہی تمدن تصور ہماری بہت سی مشکلات کا سرچشمہ ہے اور اگر ہر وقت اس کی تصحیح نہ کی گئی تو یہ ہندوستان کو تباہی کے گڑھے میں دھکیل دے گا۔

”ہماری خواہش ہے کہ ہم اپنے آزاد وطن میں ان اصولوں کو بروئے کار لا کر انھیں ہم موزوں تصور کرتے ہیں۔ روحانی، ثقافتی، اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی زندگی کے ارتقائی مراحل طے کریں۔

”یہ بات بالکل واضح ہے کہ ہم بھی کسی طرح مرحوم ہو کر اپنا موقف ترک نہیں کریں گے۔ ہم نے اپنا نصب العین متعین کر لیا ہے، اب ہم اسے حاصل کرنے کے لیے کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔ ظاہر ہے کہ نصب العین کا حصول کوئی آسان کام نہیں، آزادی محض دلائل سے حاصل نہیں کی جاسکتی۔

☆☆

”اں تو آزادی کی ہر تحریک آگ اور خون کے درمیان سے گزر کر ہی کامیابی سے ہمکنار ہوتی ہے لیکن جس انداز سے تحریک پاکستان کے متوالوں نے اس خوفناک سمندر کو عبور کیا، اس کی مثال عہد حاضر کی تاریخ میں اور کہیں نہیں ملتی۔ ہمارے بزرگوں نے پاکستان قائم کیا، ہماری آئندہ نسل کی آزادی، خوشحالی اور معیشتی زندگی بسر کرنے کی خاطر، اب یہ ہمارا انفرادی اور اجتماعی فرض ہے ہم اس مقدس سرزمین کی حفاظت کے لیے کوئی وقت فروگزاشت نہ کریں۔ آئیے! مل کر عہد کریں کہ ہم اپنی تمام ذہنی و جسمانی صلاحیتیں وطن عزیز کی ترقی و تعمیر اور حفاظت کے لیے وقف کر دیں گے۔

☆☆

اور ہند کے ان حصوں میں، جہاں مسلمان اعداد میں کم ہیں، ان کے لیے اور دیگر اقلیتوں کے لیے ان کی مرضی کے مطابق آئین میں ایسے ہی مناسب اور موثر تحفظات رکھے جائیں تاکہ ان کے بھی مذہبی، تہذیبی، اقتصادی، سیاسی اور دیگر حقوق و مفادات مفادات محفوظ رہیں۔“

”یہ اجلاس مجلس عاملہ کو اختیار دیتا ہے کہ وہ ایک ایسا آئین مرتب کرے جو ان کے بنیادی اصولوں کے مطابق ہو اور جس میں یہ گنجائش ہو کہ متعلقہ علاقے آخر کار وہاں امور خارجہ، رسل و رسائل و حصول اور دیگر ضروری امور سے متعلق اختیار کے مالک ہو سکیں۔“

”قرار داد پیش ہونے کے بعد قرارداد کے بارے میں تقاریر ہوئیں، پھر قرارداد پر رائے شماری ہوئی۔ الفاظ اس جوش و خروش، ولولہ اور غلغلے کو بیان کرنے سے قاصر ہیں جو اس تاریخی قرارداد منظور ہونے کے وقت وہاں نظر آ رہا تھا۔ یہی وہ قرارداد ہے جس کی بنیاد پر یہ مملکت خداداد پاکستان کرۂ ارض پر قائم ہوئی۔ اقوام عالم کی پوری تاریخ میں یہ پہلی مثال ہے کہ کوئی ملک ایک قرارداد کے ذریعے عالم وجود میں آیا ہو۔ اس قرارداد پاکستان نے ہندوستان کو ۲ حصوں میں تقسیم کر دیا۔ مسلمانان ہند کا انگریز سامراج سے آزاد ہونا اور غیر مسلم اقوام کی بالادستی سے ہمیشہ کے لیے نجات حاصل کرنا قرارداد پاکستان کا مہم جوں منت ہے۔ مسلمانان ہند کا مقدر بدلنے میں اس قرارداد کا جو عظیم حصہ ہے، وہ رہتی دنیا تک کوئی نہیں مٹا سکتا اور نہ ہی اس قرارداد کی اہمیت و افادیت میں ذرہ برابر کمی کر سکتا ہے۔ یہ قرارداد آج جس طرح منار پاکستان پر کندہ ہے، اسی طرح ہمارے دلوں پر بھی نقش ہے۔

”قرارداد کی منظوری کے بعد قائد اعظم کا خطاب ہوا۔ آپ کا خطبہ نہ صرف تاریخی دستاویز بلکہ تشکیل پاکستان کے حوالے سے ہماری قومی و دستاویز کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ قائد اعظم نے پہلے اردو میں کچھ ابتدائی کلمات کہے اور اس کے بعد انگریزی میں ایک گھنٹہ چالیس منٹ تقریر

سکیتاریجی

ایک تاریخی کیس کا ماحول
قوالہ کتب سے بھرنی ایک بیل گاڑی عدالت میں لائی گئی تھی

کی لارڈ...! وکیل درسی صفائی نہر مائے تہیں

وکیل استغاثہ نے اپنی پسپائی بڑی خندہ پیشانی سے تسلیم کر لی تھی

حاجت حسین شیخ

ہندو مسلم مسئلہ بنالیا۔ حد یہ کہ چوٹی کے ہندو وکیل سرچج بہادر
سپر وکی خدمات حاصل کی کہیں گویا مدعی صاحب مقدمہ
شروع ہونے سے پہلے ہی جیت چکے تھے۔ اہل شہر نے یہی
بات مشہور کر دی کہ سرچج بہادر نے جس روز یہ مقدمہ لڑنے
کی ہامی بھری، مقدمے کا فیصلہ اسی دن ہو گیا۔ یہ بات
مسلمانوں کو مشتعل کرنے والی تھی۔ آخر مسلمان بھی میدان

باراودھ کی عدالت میں ایک
مقدمہ دائر کیا گیا، جس کے مطابق
• اور لا کھرو پے کا دھوکہ کیا گیا تھا۔
مدعی غیر مسلم پنڈت شری رام
واس تھا اور مدعا علیہ شہر کا ایک مسلمان محمد رمضان۔
مقدمات تو ہوتے رہتے ہیں مگر شرپنہد عناصر نے اسے

ایک

دلائل ۳ اور روز تک مسلسل جاری رہے۔ سارے اوروں میں پل
پل کی کارروائی سنی سانی جاری تھی۔ لوگ زب و اسٹاں کے
لیے اس میں کمی بیشی بھی کر رہے تھے۔

مسلمان کہتے تھے کہ اب قائد اعظم ۳ روز کے جواب
میں ۱۰ روز تک دلائل دیں گے اور پانساہی پلٹ دیں گے۔
گویا مقدمہ نہ ہوا خون ریز جنگ کا میدان ہوا۔ آخر چوتھے
روز قائد اعظم نے اٹھ کر فاضل جج کو مناسب تعظیم پیش کرنے
کے بعد کہا ”می لارڈ! مجھے افسوس ہے کہ میرے دوست
وکیل استغاثہ نے ۳ روز تک دلائل کے انبار لگا دیے جبکہ یہ
عدالت زیر بحث مقدمہ سننے کی مجاز نہیں۔“

یہ کہہ کر انھوں نے پرانی کتاب فاضل منصف کے
سامنے رکھی۔ اس پرانی کتاب میں درج تھا کہ ۱۰ لاکھ اور
اس سے زائد رقم کے مقدمات صرف خصوصی عدالت میں
سنے جائیں گے، جن کی سربراہی شاہی خاندان کا کوئی فرد
کرے گا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ قانون پرانا ہوتا
گیا اور کئی کواں میں ترمیم کا خیال ہی نہ آیا مگر سب کچھ سب
کے سامنے تھا۔ جج صاحب ہونٹوں کی طرح دونوں وکیلوں کو
دیکھنے لگے۔ جج بہادر سپرو آخر بلند مرتبت وکیل تھے۔ انھوں
نے بھی وہ کتاب دیکھی اور پھر آلت پلٹ کر بار بار دیکھتے
رہے۔ پھر انھوں نے بڑے احرام سے سوال کیا ”جناب!
یہ کتاب آپ نے کہاں سے ڈھونڈ نکالی ہے؟“
”آپ جانتے ہیں تو یہ کتاب اپنے پاس رکھ لیں۔“
قائد اعظم نے مسکرا کر کہا۔

”ہم کریں! یہ کہہ کر سپرو صاحب نے وہ کتاب اپنے
ایک ملازم کے حوالے کر دی اور جج سے کہا ”می لارڈ وکیل
صفائی درست فرماتے ہیں، میری ساری محنت اکارت
گئی۔ یہ عدالت واقعی اتنی مالیت کا مقدمہ سماعت فرمانے
کی مجاز نہیں۔“

”کیا آپ اپنے موقف سے دست بردار ہو رہے
ہیں؟“ جج صاحب نے پوچھا۔
”جی می لارڈ! ایسا ہی ہے۔“ سر جج بہادر سپرو نے خندہ
پیشانی سے اپنی پسائی قبول کر لی۔

میں ڈٹ گئے۔ یہ مقدمہ جنگی صورت اختیار کر گیا۔ یہ جج ہے
کہ قسیم ہند سے پہلے ہندو مسلم فسادات کو صرف بہانہ درکار
ہوا کرتا تھا۔ مسلمانوں نے اعلان کر دیا کہ وہ سپرو صاحب
کے مقابلے میں قائد اعظم کو میدان میں اتاریں گے۔ یہ گویا
چیلنج قبول کرنے والی بات تھی۔

مقدمے والے روز امن و امان کے تحفظ کی خاطر
پولیس کی بھاری نفری مشت کرنے لگی۔ سپرو صاحب عدالت
میں داخل ہوئے تو ان کا انداز تشریف آوری دیدنی تھا۔ ایک
نیل گاڑی پر حوالہ جات کی کتب رکھی تھیں۔ ملازمین کی فوج
اور کتابوں سے بھری گاڑی متاثرین کو مرحوم کر رہی تھی۔

عدالت میں مقدمے کا وقت ۱۰ بجے بتایا گیا تھا اور
پونے دس بجے تک قائد اعظم یا ان کے کسی نمائندے کا
نام و نشان تک نہیں تھا۔ حتیٰ کہ مقدمے کے آغاز میں
صرف ۵ منٹ رہ گئے۔ چہ گوئیاں ہونے لگیں کہ
مسلمانوں کے وکیل صاحب غیر حاضر ہو کر عزت بھانا
چاہتے ہیں مگر قانوناً ۱۰ بجے تک عدالت کے ایکاروں کو
انتظار کرنا تھا۔ آخر ۱۰ بجے سے صرف ۵ منٹ بیشتر
قائد اعظم عدالت کے احاطے میں داخل ہوئے۔ نہ کوئی
مشیر نہ ملازموں کی فوج صرف ایک منشی ان کے ساتھ تھا
اور حوالہ جات کی کوئی کتاب بھی ان کے پاس نہیں تھی،
البتہ ایک پرانی اور چھوٹی سی کتاب انھوں نے تمام رکھی تھی
جسے دیکھ کر متاثرین سننے لگے۔

خیر! مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی۔ باہر زلزلہ و باد،
مردہ باد کے نعرات لگ رہے تھے مگر پولیس نے حالات قابو
میں کر رکھے تھے۔ جج بہادر سپرو دلائل پر دلائل دے رہے
تھے اور فرنگی جج سر بلا بلا کر اپنی پسندی کی کانٹھیا فرما رہا تھا۔
قائد اعظم خاموشی سے بیٹھے سن رہے تھے۔ صرف ایک بار
انھوں نے دھیمے لہجے میں کہا، یہ ہے اصل نکتہ کی بات۔

اس پر وکیل استغاثہ نے بھی چونک کر ان کو دیکھا اور
حیران ہوا کہ اس نے کوئی ایسی بات کہہ دی ہے جو قائد اعظم
کو پسند آئی ہے۔ سپرو صاحب عدالت کے برخواست ہونے
تک دلائل دیتے رہے اور اسی پر ہی بس نہ ہوئی بلکہ ان کے

کتابوں کی داستان بھی خوب ہے۔ کبھی انھیں آگ
لگائی گئی تو کبھی دھوا ہوا گیا۔ چرا لیا کبھی تو دفن دیا گیا۔
کبھی یہ شاہی دربار کی زینت بنیں تو کبھی فٹ پاتھ پر
کوڑیوں کے دام فروخت ہوئیں۔

کتابوں سے دوسنی

کتاب سے ہر شے کی شہرہ کی
مباحثات سے روشناس کراتی ہے

کتابوں کی داستان بھی خوب ہے۔ کبھی انھیں آگ
لگائی گئی تو کبھی دھوا ہوا گیا۔ چرا لیا کبھی تو دفن دیا گیا۔
کبھی یہ شاہی دربار کی زینت بنیں تو کبھی فٹ پاتھ پر
کوڑیوں کے دام فروخت ہوئیں۔

کتاب اور علم دو جی معاشی خوشحالی اور معاشرتی امن
کی ضمانت ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جس قوم نے علم و تحقیق
کا دامن چھوڑ دیا، وہ جلد ہی گری۔ مسلم ائمہ کا زوال اس
کی واضح مثال ہے۔ ساتویں صدی سے تیرہویں صدی
تک بغداد علم و ادب کا گہوارہ رہا۔ سقوط بغداد ہوا تو
مسلمانوں کے عظیم کتب خانے فرات میں بہا دیے گئے۔
یہ اس قدر خفیہ و خیر تھا کہ دریا کا پانی ان کی سیاہی سے سیاہ
ہو گیا۔ جب اٹلس میں پندرہویں صدی عیسوی کے آخر
میں اسلامی حکومت ختم ہوئی تو غرناطہ کی بڑی لائبریری کو
بھی ملکہ ازابیلا نے جلوا دیا۔ یہ دور تھا جب مسلمان
کتابیں پڑھتے اور جمع کرتے تھے۔ مگر رفتہ رفتہ علم سے

طرح ہوا اور پانی کے بغیر
جینا ممکن نہیں۔ اسی طرح
کتاب کے بغیر انسانی جفا اور
ارتقاء محال ہے۔ کتاب نے

جس

علم کے فروغ اور سوچ کی وسعت میں بنیادی کردار ادا کیا
ہے۔ دنیا بپ تحریر کے فن سے روشناس ہوئی تو انسان
نے چٹانوں، درختوں کی چھالوں، جانوروں کی ہڈیوں اور
کھالوں، بگور کے پتوں، ہاشمی دانت، کانڈ غرض ہر شے
لکھنے کے لیے استعمال کی، جس سے وہ اپنے دل کی بات
دوسروں تک پہنچا سکے۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے دنیا کی
پہلی کتاب قدیم مصریوں کی ”الاموات“ ہے۔ کچھ مؤرخین
کا کہنا ہے کہ دنیا کی سب سے پہلی کتاب چین میں لکھی گئی
جس کا نام ”ڈیامند سٹرا“ (Diamond Sutra) تھا۔
یہ ایک مذہبی کتاب ہے جو آج بھی ”برٹش میوزیم
لائبریری“ میں محفوظ ہے۔

والدین اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ جو بھی بچہ سیکھنے اور پڑھنے کی عمر کو پہنچے، والدین کو چاہیے کہ اسے اچھی اور مفید کتابیں لا کر دیں۔ شروع میں یہ کتابیں کہانیوں کی بھی ہو سکتی ہیں کیونکہ بچے کو کافی سنا اور پڑھنا پسند کرتے ہیں۔ اس طرح بچے کو مطالعے کی عادت پڑتی ہے۔

اس کے علاوہ والدین بچوں کے سامنے اپنی مثال قائم کر سکتے ہیں۔ فارغ وقت میں ٹی وی دیکھنے یا فون سننے کے بجائے وہ کسی کتاب یا رسالے کی ورق گردانی کر کے بچے کو بھی اس طرف مائل کریں۔ جب بچہ والدین کو مطالعہ کرتے دیکھے گا تو لاشعوری طور پر اسے یہ اور اک لگے گا کہ فارغ اوقات میں مطالعہ ہی کرنا چاہیے۔ ہو سکے تو بچے کو لائبریری بھی لے جائیں۔ کہتے ہیں کہ لائبریری بچے کے دماغ کی بہترین میزبان ہوتی ہے۔ ڈیڑھ ساری کتابیں دیکھ کر بچہ خوش بھی ہوتا ہے۔ وہ اپنی مرضی سے مزاج اور پسند کے مطابق کتابوں کا انتخاب کر کے اپنی دماغی صلاحیتیں آجا کر کر سکتا ہے۔

بچے کسی بھی قوم کا مستقبل ہوتے ہیں اور کتابیں قومی ترقی کی ضامن ہیں۔ چنانچہ اپنے بچوں کی کتابوں سے دوستی کروا کر آپ نہ صرف انھیں زندگی میں ایک بہترین دوست عطا کریں گے بلکہ ملک و قوم کی ترقی میں مدد و معاون بن جائیں گے۔ اچھی کتابیں انسان کو مہذب بناتی اور اس کی شخصیت کو وقار عطا کرتی ہیں۔

آج بھی بیشتر خواتین و حضرات کے نزدیک کتابوں پر رقم خرچ کرنے سے ہمیں بہتر کپڑوں، جیولری اور زندگی کی دیگر آسائشوں پر پیسا خرچ کرنا اہم ہے لیکن یہ تمام چیزیں عارضی اور ضرورت کے تحت استعمال کی جانے والی اشیاء ہیں۔ کتاب سے بڑھ کر دنیا میں کوئی ایسی شے نہیں جو ہمیشہ آپ کی دوست رہے۔ کتاب سے دوستی انسان کو شعور کی نئی منزلوں سے روشناس کراتی ہے۔ سو اگر زندگی میں آگے بڑھنا ہے تو خود بھی کتاب سے دوستی بنی کریں اور اپنے بچوں کو بھی اس بہترین دوست سے روشناس کروائیے۔

دوری مسلمانوں کو ترسوا کی طرف لے گئی۔ آج دنیا کے ۲۷ ممالک ایسے ہیں جہاں سب سے زیادہ کتابیں فروخت ہوتی ہیں، مگر ان ۲۷ ممالک میں ایک بھی مسلمان ملک نہیں۔ انھوں! مسلمان اپنی علمی شان بھلا بیٹھے اور اہل یورپ نے مسلمانوں کے علمی مراکز بالخصوص ہسپانوی مراکز سے استفادہ کر کے تحقیق کی دنیا میں قدم رکھا۔ ہمارے آباء اجداد کی محنت آج بھی لندن کی "ایٹلیا ٹھس لائبریری" میں موجود ہے۔ ان سب کی تعداد لاکھ کے قریب ہے۔ ان میں عربی، فارسی، ترکی اور اردو میں قلمی کتابوں کی بڑی تعداد شامل ہے۔ لندن کے بعد جس لائبریری میں مشرقی زبانوں میں لکھی کتابوں کا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ ۱۸۵۷ء میں مغلیہ سلطنت ختم ہوئی، تو انگریزوں نے لال قلعے کی شاہی لائبریری سے ہزاروں کتابیں لوٹ کر لندن پہنچا دی تھیں۔

کتاب ایک قوم کی تہذیب و ثقافت اور معاشی، سائنسی اور عملی ترقی کی آئینہ دار ہونے کے ساتھ ساتھ انسان کی بہترین دوست بھی ہے۔ کتابوں سے دوستی رکھنے والا شخص کبھی تنہا نہیں ہوتا۔ کتاب اس وقت بھی ساتھ رہتی ہے، جب تمام دوست اور پیار کرنے والے ساتھ چھوڑ دیں۔ اگرچہ آج ٹی وی انٹرنیٹ اور موبائل نے لوگوں کے ذہنوں پر قبضہ کر لیا ہے، لیکن کتاب کی اہمیت اپنی جگہ مسلمہ ہے۔

اسی لیے برسال ۲۳ اپریل کو کتاب کا عالمی دن منایا جاتا ہے۔ نئی نسل میں کتب بینی کا رجحان خالصاً کم ہے۔ بچوں کو مطالعے کی طرف راغب کرنا محض کام میں گیا ہے۔ حالانکہ موجودہ دور میں بڑھتے نفسیاتی مسائل سے بچنے کے لیے آج ماہرین نفسیات بچوں کے لیے مطالعے کو لازمی قرار دے رہے ہیں کیونکہ اچھی کتابیں شعور کو جوا بخشنے کے ساتھ ساتھ بچوں کو بہت سے فضول مشغلوں سے بھی بچاتی ہیں۔ یونانی ڈرامہ نگار، یوری پیڈس ایک جگہ لکھتا ہے "جو نوجوان مطالعے سے گریز کرے، وہ ماضی سے بے خبر اور مستقبل کے لیے مردہ ہوتا ہے۔"

بچوں میں مطالعے کا ذوق و شوق پیدا کرنے میں



آباہے نلاوا دیارِ نبی سے

حیران کر دینے والے
سچے واقعات

اُن فیسر معمولی واقعات کا تذکرہ جو آپ کی سوچ اور فہم سے ماورا ہوتے ہیں
مگر آپ کو حیرت، خوشی اور خوشن بختی کا احساس عطا کرتے ہیں

حبیبہ اشرف مہدی

۱۹۹۰ء میں میری بیوی کے خال خال ایک ماہ کے لیے
عمرہ کی غرض سے سعودی عرب پہنچے۔ وہ امریکا میں
درس دینے والے تھے۔ وہاں تھے۔ ایک ہفتہ مکہ شریف میں
قیام کے بعد خال کا ٹیلی فون آیا کہ تم لوگ بھی عمرہ کرنے
ایک ہفتے کے اندر یہاں آ جاؤ۔ انھیں بتایا کہ اگر تیار ہوا
ہو گا تو ہم ان شاء اللہ ضرور آئیں گے، آپ ہمارے لیے
وُعا کریں۔ انھوں نے کہا کہ خاندان میں اتنے لوگ ہیں،
ہم نے کسی کو نہیں کہا، تمہیں اس لیے کہہ رہے ہیں، ہمیں
”اشارہ“ ملا ہے کہ تمہاری یہاں حاضری ہے اور ایک ہفتے
کے اندر تم لوگ یہاں ہوں گے۔ میں نے انھیں بتایا کہ
ایک ہفتے کے اندر پانچ ہزار اور ویزے کا حصول بہت

چلتا ہے کہ جو کوئی حج یا عمرہ کی
سعادت حاصل کرے، اس کا بارہوا آتا
ہے۔ بغیر بارہوے کے کوئی نہیں
جاتا۔ مشاہدہ میں آیا ہے کہ بے شمار
لوگ خوشحال ہیں اور ان پر کوئی ذمہ داری نہیں، حج
کی سعادت حاصل نہیں کرتے اور دنیا سے چلے جاتے
ہیں۔ اسلام کے پانچ ارکان میں سے ایک حج بھی ہے،
جس کی ادائی صاحب استطاعت لوگوں پر فرض ہے۔
بعض مرتبہ انسان کی زندگی میں ایسے واقعات پیش
آتے ہیں کہ عقل حیران ہو جاتی ہے۔ میرے ساتھ بھی حج
و عمرہ کے سلسلہ میں کچھ غیر معمولی واقعات پیش آئے۔

کہا

کا خط اور کارڈ انھیں دکھایا۔ انھوں نے کہا کہ کسی کو ویزہ دلوانا بڑی ذمہ داری کا معاملہ ہے۔ یہ خط صدیقی صاحب کے نام ہے چنانچہ یہ کام نہیں کر سکتا اور اپنی معذوری ظاہر کر دی۔

میں نے وزارت خارجہ کے تین چار افسروں کے نام لیے۔ انھوں نے بعض کے بارے میں کہا کہ وہ سبکدوش ہو چکے اور بعض کے بارے میں کہا کہ میں نہیں جانتا۔ اس سے پیشتر کہ مجھے جانے کو کہتے، ایک اور رشتہ دار کا نام یاد آیا جن سے میں کافی دیر پہلے ملا تھا۔ جب میں نے ان کا نام لیا تو وہ ایک دم کرسی سے اُٹھ اُچھل گئے۔ کہتے لگے، انھیں آپ جانتے ہیں؟ میں نے کہا بالکل آپ میری بات کرادیں۔ انھوں نے اسی وقت وہاں فون ملوایا اور ان سے بات کی۔ پہلے تو سرکاری باتیں کرتے رہے، پھر میرا حوالہ دیا اور بات کروائی۔ وہ رشتہ دار بڑی دیر تک مجھ سے خیر خیریت پوچھتے رہے اور دفتر میں آنے کی وجہ پوچھی۔ پھر فوری طور پر اموان صاحب سے کہا کہ یہ میرے عزیز ہیں، ان کو آج ہی ویزہ دلوائیں۔ ان کے ”ادکامات“ سننے ہی اموان صاحب بالکل تبدیل ہو گئے۔ مجھے چائے وغیرہ دی اور ایک افسر میرے ساتھ سعودی سفارت خانے بھیجا۔ چند گھنٹوں بعد ویزہ لگا پاسپورٹ میرے ہاتھ میں تھا۔

اب مسئلہ ”زاو راہ“ کا تھا۔ ایک صاحب کو رقم قرض دی تھی لیکن اس کی واپسی تقریباً ناممکن تھی۔ میں کئی برس سے پیسے مانگ رہا تھا مگر ناکامی ہی ہوتی۔ بہر حال جی کڑا کر انھیں ویزہ دکھایا اور رقم مانگی تو انھوں نے ۲۰۰ روپے کا وعدہ کیا۔ ٹھیک ۲۰۰ روپے بعد مجھے پیسے دے دیے۔ یوں میں ٹھیک ایک ہفتے بعد ”مکہ شریف“ گیا اور عمرو کی سعادت حاصل کر لی۔

(۱) میں نے فریضہ حج ۱۹۹۷ء میں ادا کیا۔ اس سے ایک سال قبل میں ملازمت کے سلسلے میں انبٹ آباد میں تھا۔ ایک روز مہینی کے ڈرائیور نے ایک ماہ کی چھٹی مانگی۔ میں نے کہا کہ ایک ماہ کی چھٹی کے لیے تمہیں

مشکل ہے۔ پھر ٹکٹ اور زاو راہ کا بھی انتظام کرنا ہے۔ انھوں نے کہا کہ تم بسم اللہ کرو۔ سارے مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔ سب سے پہلے میں نے جلد پاسپورٹ حاصل کرنے کی درخواست دی جو ۳ روز بعد ملتا تھا۔ پھر انبٹ سے ویزے کے متعلق پوچھا تو اس نے بتایا، کم از کم ایک ماہ میں ویزا ملے گا۔ میں تقریباً مایوس ہو گیا، اتفاق سے اپنے دوست، منیر احمد غازی کا خیال آیا جو اس وقت ذہنی اتارنی جزل تھے۔ میں ان سے ملا اور کہا کہ میں ایک ہفتے کے اندر سعودی عرب کا ویزہ چاہتا ہوں۔ کہنے لگے کہ یہ بہت آسان کام ہے، تم میرا خط اور کارڈ لے کر وزارت خارجہ کے ڈائریکٹر جنرل صدیقی صاحب کے پاس چلے جاؤ، وہ تمہیں ایک روز میں ویزا دلوا دیں گے۔ میں ان کا خط لے کر رات کو بس میں بیٹھا جس نے صبح مجھے اسلام آباد پہنچا دیا۔ میں وزارت خارجہ کے دفتر گیا۔ ابھی دفتر کھلا بھی نہیں تھا، میں انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد لوگوں کی آمد و رفت شروع ہوئی۔ میں نے ایک دو لوگوں سے صدیقی صاحب کے بارے میں پوچھا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ پاکستان سے باہر دوسرے پرگئے ہوئے ہیں۔ یہ بات سن کر بہت مایوس ہوا اور سوچنے لگا کہ اب ویزے کا حصول ناممکن ہے اور اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا رہا۔ پھر خیال آیا کہ صدیقی صاحب کی جگہ کوئی اور افسر کام کر رہا ہوگا، اس سے رابطہ کیا جائے۔ استقبالیے سے معلوم ہوا کہ اموان صاحب ان کی جگہ ڈیوٹی دے رہے ہیں۔ میں نے استقبالیہ ٹھکڑے لے کر کہا کہ اموان صاحب سے بات کروائیں۔ پھر انھیں بتایا کہ مجھے لاہور سے منیر احمد غازی صاحب نے بھیجا ہے۔ کہنے لگے کہ میں منیر احمد غازی صاحب کو نہیں جانتا، میں نے کہا کہ وہ آپ کو جانتے ہیں، میں ان سے آپ کی بات کروا دوں گا۔

اموان صاحب نے کہا کہ آپ بیٹھیں میں آپ کو بلواتا ہوں۔ میں تقریباً ایک گھنٹہ ”استقبالیہ“ میں بیٹھا رہا لیکن انھوں نے نہیں بلوایا۔ آخر میں نے انھیں یاد دہانی کروائی تو بادل خواست مجھے بلوایا۔ میں نے غازی صاحب

کم از کم ۱۵ روز قبل درخواست دینی چاہیے تھی تاکہ
 تمھاری جگہ کسی اور ذرائعہ کا انتظام کرتے۔ ۲ روز بعد تم
 چھٹی پر جا رہے ہو، اتنے تھوڑے عرصے میں نئے ذرائعہ
 کا انتظام کیسے ہوگا؟ اس نے کچھ ایسی مجبوری بتائی کہ مجھے
 اسے چھٹی دینی پڑی۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ ذرائعہ کا
 انتظام بھی کر دے گا۔ جب ۲ روز بعد اس کی چھٹی شروع
 ہوئی اور ذرائعہ کا انتظام نہیں ہوا تو مجھے پریشانی لاحق
 ہوئی۔ اتنے میں ایک چھٹی کا ٹھیکیدار کسی دفتر کی کام سے
 میرے پاس آیا۔ اسے بھی اپنی پریشانی کا بتایا تو اس نے
 کہا کہ میرا بھائی سعودی عرب میں ذرائعہ کر رہا ہے۔
 آج کل ۲ ماہ کی چھٹی پر آیا ہوا ہے۔ کہتا ہے کہ کہیں مجھے
 ۲ ماہ کے لیے ملازمت پر لگوا دو۔ اب کینیڈا میں بیٹھا ہوا
 ہے۔ میں نے کہا کہ اسے فوراً بلاؤ۔ جب وہ آیا تو میں
 نے اس سے ذرائعہ ٹیگ لائسنس اور شناختی کارڈ کی فوٹو کاپی
 مانگی۔ دونوں چیزیں اس نے مجھے دے دیں۔ میں نے
 رجسٹرل مینیجر سے اس کی ایک ماہ کے لیے عارضی ترقی کے
 احکامات جاری کر دیا۔ اتفاق سے اسی روز مجھے ایک
 سرکاری کام کے تحت پشاور جانا پڑا۔ وہاں ہی پر اسی ذرائعہ
 نے باتوں باتوں میں بتایا کہ اس کا والد علم نجوم کا ماہر
 ہے۔ آپ مجھے اپنی تاریخ پیدائش اور پورا نام لکھ کر دیں،
 میں آپ کا زائچہ بنا کر لاؤں گا۔ میں نے اسے مطلوبہ
 معلومات دے دیں۔ دوسرے روز وہ ذرائعہ جسے میرے
 پاس ملازمت کرتے ۲۳ گھنٹے بھی نہیں ہوئے تھے، میرا
 زائچہ بنا لایا۔ اس میں میرا ماضی، حال اور میرے مستقبل کا
 حال لکھا تھا۔ یہ بھی درج تھا کہ میرے بائیں بازو پر ایک
 تل کا ہونا ضروری ہے۔ نیز یہ کہ اگلے سال میں
 حج بیت اللہ سے مستفید ہوں گا۔ جب میں نے اپنے
 بائیں بازو پر دیکھا تو واقعی تل موجود تھا۔ روزِ عمر و زندگی
 میں اس پر کبھی غور ہی نہیں کیا تھا۔ پھر اگلے سال میں حج
 بیت اللہ سے بھی مستفید ہوا۔

میں نے اس ذرائعہ سے پوچھا، تمھارے والد کیا
 کرتے ہیں۔ اس نے بتایا کہ وہ ریٹائرڈ فوجی ہیں۔

نشتیاگلی میں کالینوں کی دکان کے باہر انگوٹھوں کے تھینے
 بیچتے ہیں۔ اس واقعے کے چند روز بعد میرے ایک دوست
 کراچی سے منع خاندان آئے۔ میں انھیں سیر کرانے
 نشتیاگلی لے گیا۔ اتفاق سے مجھے اس ذرائعہ کے والد
 صاحب یاد آئے۔ تھوڑی تلاش کے بعد ان سے ملاقات
 ہو گئی۔ میں نے اپنا تعارف کرایا بل کر بہت خوش ہوئے۔
 میں نے انھیں اپنے دوست سے ملوایا اور کہا کہ ان کا زائچہ
 بھی بنائیے۔

انھوں نے دوست کا نام اور تاریخ پیدائش پوچھی۔
 پھر تھیلے میں سے ایک کاپی نکالی جس پر پہلے سے بہت کچھ
 لکھا ہوا تھا۔ پھر میرے دوست سے کہا کہ اس کے یہ
 ۳۳ صفحے پڑھیے۔ میرا دوست جوں جوں تحریر پڑھتا گیا،
 اس کے چہرے پر ہر اُپار چڑھاؤ آتا رہا۔ جب وہ صفحات
 پڑھ چکا تو اس نے حیران ہو کر پوچھا ”بابا جی آپ نے
 اس میں میرا ماضی، حال اور مستقبل لکھ دیا ہے۔ آپ کو
 کیسے پتا چل گیا کہ میں آدھا ہوں۔“

بابا جی نے کہا ”میری علم نجوم ہے۔“ میرے دوست
 نے خوش ہو کر بابا جی کو کچھ پیسے دینے چاہے لیکن انھوں
 نے لینے سے انکار کر دیا۔

(۲) ۱۹۹۹ء میں ہمارے دفتر میں مسکین نامی شخص
 ملازم تھا۔ جب وہ حج کرنے گیا، میں نے اس سے کہا،
 جب تم حج بیت اللہ کو اور مدینہ شریف حضور اکرم ﷺ کے
 روضہ مبارک پر جاؤ تو میرا سلام عرض کرنا۔ یہ درخواست
 بھی نہیں کرنا کہ میں حج پر آ جا رہا ہوں، میرے آنے کا
 انتظام فرمائیے۔

جب مسکین حج کر کے واپس آیا تو اس نے مجھ سے
 کہا، میں نے آپ کے لیے خصوصی دعا کی تھی۔ مجھے یہ
 ”اشارہ ملا ہے کہ اگلے سال آپ حج بیت اللہ کی سعادت
 سے مستفید ہوں گے۔“

جب میں اگلے سال ۱۹۹۷ء میں حج پر گیا اور
 مدینہ شریف پہنچ کر دعا میں کیں تو مجھے مسکین یاد آ گیا۔ اس
 کی کبھی بات بھی یاد آگئی۔ جب اس نے حج کی پیشگی

اور انھیں بہت کچھ بتایا۔ جب اُس نے میرا ہاتھ دیکھا تو کہا کہ آپ کے ہاتھ میں ایک نئی لکیر بنی ہے۔ وہ اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ آپ حج / عمرہ کرنے جائیں گے یا وہاں سے ہو کر آئے ہیں۔ میں نے اُسے بتایا کہ فی الحال تو میرا جانے کا کوئی پروگرام نہیں، آپ دعا کریں۔ اس نے کہا کہ آپ بہت جلد حج / عمرہ کی سعادت سے فیض یاب ہوں گے۔

(۵) ایک روز ہمارے پرانے پڑوسی کا فون آیا۔ ہمارے اُن سے ۲۰ سال پرانے تعلقات ہیں۔ انھوں نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے، آپ عمرہ / حج پر جا رہے ہیں۔ انھیں بھی بتایا کہ ہمارا تو کوئی پروگرام نہیں۔

انھوں نے بتایا "میں نے خواب میں دیکھا کہ آپ کے مرحوم والدین ہوائی اڈے پر کھڑے ہیں۔ دونوں بہت خوش ہیں۔ ہاتھوں میں پھولوں کے ہار لیے وہ کسی کو الوداع کہتے یا استقبال کو کھڑے ہیں۔ اسی خواب سے ہم نے اندازہ لگایا کہ آپ بہن بھائیوں میں سے کوئی حج / عمرہ پر جایا آ رہا ہے۔ جب حج پر جانے کا کوئی پروگرام نہ تھا لیکن اگلے ہی مہینے بلاوا آ گیا۔ یوں اُن کے خواب کی تعبیر صحیح ثابت ہوئی۔

(۶) جب میں مدینہ شریف پہنچا تو بالکل ٹھیک تھا لیکن دوسرے روز سے میرے گھٹنوں میں سخت درد شروع ہو گیا۔ کسی کروٹ چھین نہیں تھا۔ ایک روز مسجد نبوی میں نماز قصر باجماعت ادا کرنے کے بعد قرآن شریف کی تلاوت کرتا رہا۔ جب مغرب کی اذان ہوئی تو میرے ساتھ ایک بزرگ بیٹھے ہوئے تھے۔ نہایت نورانی شکل کے اور ذکر الہی میں مصروف تھے۔ جب اذان ختم ہوئی تو انھوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے جیسے ہی وہ فارغ ہوئے۔ میں نے انھیں بتایا کہ میرے گھٹنوں میں سخت درد ہے۔ انھوں نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی، بس خاموشی سے میرے گھٹنوں پر دم کیا اور ہاتھ پھیر دیا۔ جلد ہی میری تکلیف ٹھیک ہو گئی اور دوران، رنج پھر نہیں ہوئی۔

مبارک باد دی تھی۔ میں اُس کے لیے دعا کر رہا تھا کہ دیکھا، وہ سامنے سے چلا آ رہا ہے۔ میں نے سوچا کہ میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا؟ جب وہ قریب آیا تو مجھ سے لپٹ گیا اور کہا دیکھیے، میں نے آپ کو "اشارہ" دے دیا تھا کہ آپ کا نام حج میں آ گیا ہے۔ میں نے اُس کا شکریہ ادا کیا اور اُس سے پوچھا وہ کس طرح دوپارہ یہاں آ گیا؟ اس نے بتایا کہ پچھلے سال میں اپنے "ذاتی خرچ" پر حج پر آیا تھا۔ اس مرتبہ چینی کی "قرعہ اندازی" میں میرا نام نکل آیا۔ چنانچہ میں ادارے کے خرچ پر حج کرنے آیا ہوں۔

(۳) ۱۹۹۶ء میں ایبٹ آباد میں تھا۔ ایک روز خواب دیکھا کہ میں مدینہ شریف پہنچ گیا ہوں اور میری بھانجی بھی میرے ساتھ ہے۔ میں اسے "روضہ شریف" کی طرف کھینچتے ہوئے کہہ رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہاں بلا یا ہے تو پہلے "روضہ شریف" پر حاضری دیتے ہیں لیکن وہ مجھے کہتی ہے کہ بازار چل کر خریداری کرتے ہیں۔ اسی کشمکش میں میری آنکھ کھل گئی اور پھر میں خواب بھول گیا لیکن جب حج کا بلاوا آیا تو وہ معجزاتی طور پر میرے ساتھ حج کے سفر پر گئی۔

(۴) ۱۹۹۷ء میں میری تقرری ملتان کے نزدیک واقع ایک قصبے، شجاع آباد میں ہوئی۔ ایک روز ایک آڈٹ ٹیم کے ساتھ سوئی فیلڈ جانے کا اتفاق ہوا۔ گرمی کا موسم تھا اور وہ پھر کا وقت، سخت پیاس لگی ہوئی تھی۔ راستے میں کہیں پانی نہ ملا۔ ہمارا ایک ساتھی متاثر تھا۔ اس نے بتایا کہ راستے میں کچھ فاصلے پر بہت سڑک ایک گاؤں میں اس کے ملنے والے رہتے ہیں، اُن کے گھر چلتے ہیں۔ پانی وغیرہ پینے کے بعد تازہ دم ہو کر سفر جاری رکھیں گے۔ چنانچہ کچھ دور چلنے کے بعد ایک گاؤں میں پہنچے۔ میزبان بڑی محبت سے ملا۔ پانی اور چائے وغیرہ سے توامنع کی۔ گاؤں میں اس کی ڈپھری تھی جہاں وہ لوگوں کا تھوڑا بہت علاج کر لیا کرتا۔

میرے ساتھی نے بتایا کہ یہ بہت اچھا "دست شناس" ہے۔ اس نے سب لوگوں کے ہاتھ دیکھے

کم عمری میں ہارٹ اٹیک

ذاتی صحت سے بے خبر رہنے والوں کے لیے لمحہ فکریہ

ایجاز احمد ڈنگلہ

۲۰۰۳ء میں ۳۹ ہزار افراد کے معاینے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا گیا تھا کہ امراض قلب میں ہفتا ۹۰ فیصد لوگ کولیسٹرول کی زیادتی اور ذیابیطس کے باعث اس کا نشانہ بنے۔ جمشید کی عمر جب ۳۰ سال تھی تو اس وقت سے اس کے جسم میں کولیسٹرول کی سطح زیادہ تھی۔ اس نے کھانے پینے میں بے پیر شروعات کر دی تھی لیکن دھوکوں کے موقع پر جو اکثر ہوتی تھیں، وہ بد پریشی کر بیٹھتا۔

ماہرین کہتے ہیں کہ آپ ہارٹ اٹیک ہونے کے صحیح وقت کا تو اندازہ نہیں لگا سکتے لیکن احتیاط کر کے اس جان لیوا بیماری سے کافی حد تک بچ سکتے ہیں۔ مردوں کو عورتوں کی نسبت ہارٹ اٹیک ۱۰ سے ۱۵ برس قبل ہوتا ہے۔ عموماً مردوں کو ۳۵ سال بعد اور عورتوں کو ۵۵ء سے ۶۰ سال بعد۔

جمشید تو الکحل استعمال کرتا تھا۔ نہ جمشید کو نوشی۔ وہ ورزش بھی کرتا تھا لیکن اس کی بیماری کی وجہ یہ تھی۔ دراصل وہ روزانہ ۱۳ گھنٹے کام کرتا تھا۔ اکثر گھر سے باہر سفر میں رہتا۔ دوسری کمپنیاں سے اس کی کمپنی کا زبردست مقابلہ تھا۔ وہ اکثر فکر مند رہتا تھا کہ مصنوعات کی فروخت گرتے جائے۔ لہذا زیادہ کام اور ذہنی دباؤ نے اسے بیمار کر دیا۔ ڈاکٹروں نے اسے بتایا کہ ۸ گھنٹے روزانہ کام کرنا کافی ہے۔ ۱۱ گھنٹے سے زیادہ کام کرنا دل کے دورے کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ جمشید ڈاکٹروں کی بات سمجھ گیا اور اب ان کی ہدایت کے مطابق زندگی گزار رہا ہے۔

اشیائے خور و نوش بنانے والی ایک بڑی کمپنی میں سیکرٹری تھا۔ وہ ملک بھر

جمشید

میں گھوم پھر کر آرڈر لیتا، اکثر سفر میں رہتا اور سخت محنت و مشقت کرتا۔ کمپنی اس کے کام سے خوش تھی۔ اس کی تنخواہ معقول تھی اور وہ خوشحال زندگی بسر کر رہا تھا۔

ایک رات وہ بیرونی سفر کر کے گھر پہنچا تو اس کی طبیعت سخت خراب ہو گئی۔ وہ فوری طور پر ہسپتال پہنچا۔ اس کے بدن میں انٹنشن ہو رہی اور وہ سوتے گر رہا تھا۔ اسے ایمرجنسی روم پہنچایا گیا، ڈاکٹر نے اس کا بڑی توجہ سے معاینہ کیا اور اسے فوری خبر سنائی کہ اسے ہارٹ اٹیک ہو چکا ہے۔ وہ بڑا حیران ہوا۔

وہ جوان تھا۔ اس کی عمر صرف ۳۳ سال تھی۔ اس سے قبل جمشید نے دل کی تکلیف کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ اسی لیے جمشید کو یقین نہ آیا لیکن جب ڈاکٹر نے اسے بتایا کہ اگر فوری طور پر اسے طبی امداد نہ ملی تو وہ مر بھی سکتا ہے تو اسے یقین کرنا پڑا۔

جمشید کو فوری طور پر آپریشن تھیر پیپنچایا گیا۔ سرجنوں نے اس کے سینے میں ۳ ریویو پن جنھیں سنٹ کہا جاتا ہے، اس کی بندش یا میں کھولنے کے لیے داخل کر دیں۔ اس آپریشن سے اس کی جان تو بچ گئی لیکن کئی سوال اٹھ کھڑے ہوئے کہ اسے اتنی کم عمری میں دل کا دورہ کیوں پڑا؟ اس کے بارے میں خاندان میں کبھی کسی کو دل کی بیماری نہیں تھی۔

ارفع کریم اور بل گیشس

تشنہ بریلوی



ایک غنچہ مرے گلشن میں کھلا، پھول بنا
اُس کی خوشبو سے معطر مرے گلشن کی فضا
میرا گلشن ہی جسیں سارا جہاں اُس پہ فضا
پھسرو و مگر جہاں بھی گیا
سب نے مانگی یہ دعا
کاش اے کاش کوئی معجزہ ہو بہر خدا
معجزہ تو نہ ہوا

اور اشکوں کا ہر اک آنکھ سے پرنا لہہ
ایسا ماتم کبھی دیکھا نہ سنا
باغِ مہر دوس کا دروازہ کھلا
بڑھ کے حوروں نے اُسے پیغمبرِ ایسا
دل کو ڈھارس دو ذرا

موت کے ڈھنگ الگ زینت کے اندازِ حید
اب بھی زندہ ہے ہر اک دل میں وہ پیاری ٹولیا
اُس کے اوصاف تو بل گیشس سے ہی پوچھو ذرا
مانیکر و فینک کا بانی کی جو دولت کا جس سے رسم
بلینیر ایک بھی دیکھا نہیں ہم نے ایسا
اُس نے ارفع کو پٹنا اور اُسے اعجاز دیا
آئن سٹائن کا شاید اُسے وجد ان ملا
شاعرہ بھی وہ بنی شعر لکھا خوب لکھا
ہاں مگر جسم تو کمزور رہا
کتنا ٹیلنٹ ہے اس ملک میں قسا بر یہ ہوا
نئی ارفع تو بنی راہنما

سفرنامہ

نمازی روئے تین سو کو میٹر دور سے
جمعہ پڑھنے آتے ہیں

یہ ذرا جاپان تک

نور الدین احمد ندوی

جاپانی معاشرے میں
گزارے ۳ ماہ کا
اچھوتا حوال



خوبصورت ہوائی اڈا ہے۔

ہوائی جہاز سے ہم عمارت سے ملحقہ عمارت کے ذریعے ہوائی اڈے کی عمارت کے بال کے اندر پہنچ گئے۔ بال چاروں طرف سے بند تھا۔ کچھ مجھ نہیں آ رہا تھا کہ اب کدھر جانا ہے۔ دراصل یہاں سے دوسری عمارت میں جانا ہوتا ہے۔ جہاں انٹرنیشنل کے حوالے سے سب کارروائی ہوتی ہے۔ دونوں بالوں کے درمیان ریلوے لائن ہے۔ یہاں خود کار ریل گاڑیاں چلتی ہیں۔ ایک ریل گاڑی پر اصرے انٹرنیشن والے بال میں جاتے ہیں۔ دونوں عمارتوں کے درمیان ڈیڑھ ۲ کلومیٹر کا فاصلہ ہے جو ۳۰ منٹ میں طے ہوتا ہے۔ پٹری زمین سے بلندی پر ہے۔ ریل گاڑی کا ایک ہی ڈبہ ہے جس میں چالیس پچاس افراد سوار ہو سکتے ہیں، ہم بھی اپنی باری آنے پر ریل گاڑی میں سوار ہوئے اور دوسرے بال میں پہنچ گئے۔ ہمارے ایک طرف ہوائی اڈے سے باہر کی دنیا نظر آ رہی تھی اور دوسری طرف ہوائی اڈے پر کھڑے مختلف ملکوں کے جہاز اپنی نمائش کر رہے تھے۔

جب ہم دوسری عمارت میں پہنچے تو حملے کا کوئی آدمی کام نہیں کر رہا تھا۔ حملے کے کچھ افراد ادھر ادھر آہٹیں میں کھڑے ہاتھیں کر رہے تھے۔ معلوم ایسا ہوتا تھا جیسے انھوں نے قلم چھوڑنا ہی کی ہوئی ہے۔ بہر حال چار پانچ منٹ بعد انھوں نے کام کرنا شروع کر دیا۔ معلوم ہوا کہ ۱۳ بجے ۲۰ منٹ کا وقت ہوتا ہے۔ اس وقت میں بالکل کوئی کام نہیں ہوتا۔ ۱۲ بج ۱۹ منٹ پر ہر آدمی اپنے کام کی جگہ پہنچ جاتا ہے۔

ہر مسافر کو ایک کارڈ دیا گیا جو جاپانی زبان میں تھا۔ ہم نے اشاروں سے بتایا کہ ہم جاپانی نہیں جانتے۔ پھر ہمیں کارڈوں کا ایک پلندہ دیا گیا جس میں ہر زبان میں ایسے کارڈ موجود تھے۔ اردو میں بھی ایک کارڈ تھا۔ ہم نے کہا کہ اس کے باوجود یہ خانہ پڑی ہمارے لیے مشکل ہے۔ ایک محترمہ جن کا حملے سے تعلق تھا، انھوں نے ہمارے کارڈ بھرے۔ چہرے پر کسی قسم کا فصد یا جھنجھلاہٹ

اعلان کر رہا تھا کہ جہاز

اس وقت ۳۰ ہزار فٹ کی بلندی پر محور واز ہے۔ اچانک مجھے اپنے

استاد محرم کی بات یاد آئی جو انھوں نے حفظ قرآن کی تقریب میں مجھے مخاطب کرتے ہوئے فرمائی تھی ”یہاں میری بات یاد رکھنا، یہ قرآن آپ کو آلی بلندیوں پر پہنچائے گا جن کا آپ نے بھی سوچا بھی نہ ہوگا۔“ بے شک استاد صاحب کی بات کا مطلب یہ بلندی نہ تھی لیکن جس ایسے ہی یہ بات یاد آئی۔

۲۰۱۱ء میں جاپان کی ایک اسلامی قلائی تنظیم اسلامک سرکل آف جاپان نے پاکستان سے ایسے ۸۸ حفاظ قرآن کو جاپان آنے کی دعوت دی تھی جو رمضان المبارک میں نماز تراویح میں قرآن پاک سنائیں، نماز جمعہ اور دینی اجتماعات میں خطاب کریں۔ خوش قسمتی سے میں بھی ان منتخب افراد میں شامل تھا جنہیں جاپان جا کر قرآن پاک سنانے کی سعادت نصیب ہوئی۔

۸۸ افراد میں سے ہم پانچ ۲۳ جولائی کو لاہور سے کراچی پہنچے۔ کراچی سے ہم نے سری لنکن ایئر لائن کے ذریعے ۹ بجے بعد کولمبو کے لیے پرواز کرنا تھا۔ ہم نے یہ وقت کراچی ہوائی اڈے پر ہی گزارا۔ سری لنکن ایئر لائن نے تقریباً ساڑھے چار بجے میں کولمبو پہنچا دیا۔ یہاں سے ہمیں جاپان کی پرواز ۵ بجے بعد ملنی تھی۔ ہوائی اڈے پر نماز ادا کرنے کے لیے باقاعدہ جگہ بنی ہوئی تھی۔

سرزمین جاپان پر

۲۳ جولائی کو دوپہر ۱۲ بجے (پاکستان میں اس وقت صبح ۸ بجے تھے) ہم ٹوکیو کے نارینا بین الاقوامی ہوائی اڈے پر اترے۔ ٹوکیو کا پرانا ہوائی اڈہ شہر کی آبادیوں کے درمیان گھر گیا ہے، وہاں اب صرف مقامی پروازیں اترتی ہیں یا کوئی خصوصی پرواز۔ نیا ہوائی اڈہ شہر سے تقریباً ۳۰ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ بہت بڑا اور بہت

نقصی بلکہ منکراہت اور ہماری باتوں پر ہنستا۔ خدا خدا کر کے یہ مرحلہ سر ہوا۔

اب ہم چند روٹیں کاؤنٹروں میں سے ایک کے سامنے قطار میں کھڑے ہو گئے اور جلد ہی ہماری باری آگئی۔ افسر نے پوچھا کہ آپ کو کس نے بلایا ہے؟ ہم نے بتایا کہ اسلامک سرکل آف جاپان نے ہمیں یہاں آنے کی دعوت دی ہے۔ انھوں نے پوچھا کہ ان کا فون نمبر کیا ہے۔ ہم نے فون نمبر بتا دیا۔ (ہم نے محسوس کیا کہ ہمیں پتا چلا لیکن انھوں نے اسلامک سرکل کے دفتر فون کر کے معلوم کر لیا کہ انھوں نے ہمیں بلایا ہے۔) وہاں سے تصدیق کرنے کے بعد انھوں نے ہمارے پاسپورٹس پر مہریں لگا دیں۔

پاسپورٹس پر مہریں لگاتے لگاتے انھوں نے اُن ۲ افراد کو ہم سے علیحدہ کر دیا جو پچھلے سال بھی جاپان آئے تھے۔ انہیں وہ ایک طرف لے گئے۔ ہم ۳ افراد کا تفصیلی انٹرویو لینے کے لیے ایک افسر آگیا۔ ہم نے بتایا کہ ہم ”سین سے“ ہیں۔ ”سین سے“ جاپانی زبان میں استاد کو کہا جاتا ہے اور استاد کا یہاں بہت زیادہ احترام ہے۔ افسر کا رویہ ایک دم بہت مؤدبانہ ہو گیا۔ انٹرویو کے بغیر ایک خاص دروازے سے اُس نے ہمیں باہر جانے کا اشارہ کیا جبکہ عام مسافر ایک اور دروازے سے جا رہے تھے۔ ہم دروازے سے باہر نکل کر پھر کھڑے ہو گئے۔ وہ افسر پھر آیا کہ اب کیا بات ہے؟ آپ اب کیوں نہیں جاتے؟ ہم نے افساروں اور انگریزی کا سہارا لیتے ہوئے کہا کہ ہمارے ساتھی کہاں ہیں؟ وہ بیچارا ہمارے ساتھ آیا۔ ہم غمراہ کی بالائی منزل سے اتر کر نیچے آئے۔ ہمارے ساتھی وہاں کھڑے تھے۔ وہ ان کے پاس ہمیں چھوڑ کر ہنستا مسکراتا چلا گیا۔

ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا تو خدا کا شکر ادا کیا۔ ہم یہ سمجھ کر پریشان ہو رہے تھے کہ ہم تو پہلی مرتبہ آئے ہیں ہم نے کیا جرم کیا ہے جو کوئی ہمیں پکڑے گا۔ ان ساتھیوں کو کسی پرانی غلطی کی وجہ سے پکڑ نہ لیا ہو۔ وہ لوگ اوجھر

پریشان تھے کہ ہمارے ساتھ کوئی مسئلہ بن گیا ہے اور کہیں واپس پاکستان نہ بھیج رہے ہوں۔

ہمارا استقبال کرنے کے لیے سعید بیگ صاحب آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے کہا آئیں پہلے کچھ پانی وغیرہ پی لیں، پھر چلتے ہیں۔ وہاں ایک دکان تھی، وہ اس میں ہمیں لے گئے۔ سب سے پہلے تو یہ بات عجیب سی لگی کہ دکان کا تمام عملہ خواتین پر مشتمل تھا۔ ہم نے بوتلیں اٹھائیں، دکان کھولے اور پینا شروع کر دیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہاں ادائی سے قبل بوتل پینے کا رواج نہیں۔ بہر حال لطیفہ ہو گیا۔

ہم ہوائی اڈے سے باہر آ گئے

ہوائی اڈے سے ہم بذریعہ ہائی وے (ہماری مولروے سمجھ لیں) سعید بیگ صاحب کے ساتھ روانہ ہوئے۔ سڑک کی دائیں طرف سبزہ، پہاڑیاں وغیرہ تھیں اور بائیں طرف جاپان کی مشہور کمپنیوں کے شوروم اور دفاتر۔ چالیس پچاس منٹ سفر کرنے کے بعد ہم ہائی وے سے باہر آ گئے۔ یہاں آبادی کے درمیان ایک مسجد ہے جس کا نام حرام مسجد ہے۔ یہی اسلامک سرکل آف جاپان کا مرکزی دفتر بھی ہے۔

مسجد کے باہر ایسی کوئی علامت نہیں جس سے ظاہر ہو کہ یہ عبادت خانہ ہے۔ صرف ایک بورڈ لگا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حرام مسجد ہے۔ اس کا رقبہ ایک اندازے کے مطابق ۱۰۵۵ مربع فٹ ہوگا۔ پہلی منزل پر وضو کی جگہ، بیت الخلا ہیں اور خواتین کے نماز پڑھنے کی جگہ ہے۔ دوسری اور تیسری منزل پر مردوں کے لیے نماز پڑھنے کا انتظام ہے۔ چوتھی منزل پر باورچی خانہ ہے۔

مسجد حرام میں ہماری ملاقات خرم تحسین سے ہوئی۔ آپ اسلامک سرکل کے جنرل سیکرٹری ہیں۔ عشرت باغی ملے جو سابق امیر ہیں۔ سعید بیگ کھانے کا ہم سے پوچھ کر بچش گئے۔ اس وقت (دوپہر کے) ۱۳ سے اوپر وقت ہو چکا تھا اور ۳ بجے تمام ہوٹل یہاں بند ہو جاتے ہیں۔

جو دو کرائے کا مخصوص لباس پہنا ہوا تھا۔)۔ ہر بجے باغ میں ایک الارم سا بجا اور یہ پورے ملک میں بیک وقت ہر جگہ بجتا ہے۔ الارم بجتے ہی باغ خالی ہو گیا۔

دو رات ہم نے حراسینٹر میں ہی گزاری۔ اگلے دن ۸ بجے صبح بھارت سے بھی ۳۰ حفاظ کرام تشریف لے آئے۔ ظہر کی نماز ادا کر کے ڈاکٹر منصور علی اور میں ملک امانت علی کی کار میں اگلی منزل کی طرف نکل کھڑے ہوئے۔ ڈاکٹر منصور علی کو ٹیٹوک اسٹیشن پر اتار کر ہم باقی وے پر آگئے۔ یہ وہی باقی وے ہے جو ہوائی اڈے سے آ رہی ہے۔ نوکیو شہر آیا تو یہ بلند ہونا شروع ہوئی اور عام زمین سے ساتھ سرفٹ کی بلندی پر چلی گئی۔ سڑک کی دونوں جانب کئی کئی منزلیں نظر آ رہی تھیں۔ نوکیو نامور اپنی بلندیوں سے ہمیں خوش آمدید کہتا نظر آ رہا تھا۔

نوکیو سے ہم جب باہر نکل آئے تو ہماری باقی وے زمین پر واپس آ گئی۔ چار پانچ گھنٹے سفر کرنے کے بعد اتنا دارا پھینچے۔ یہاں ملک امانت علی کے بھانجے افتخار صاحب ہوتے ہیں۔ ملک امانت علی اس وقت اسلامک سینٹر آف جاپان کے امیر ہیں۔ ملک صاحب تو اپنے گھر چلے گئے، میں نے دو رات افتخار صاحب کے گھر ہی گزاری۔ اگلے دن جمعہ تھا۔ ۱۱ بجے ملک صاحب تشریف لے آئے۔ اُن کے آتے ہی ہم ”اقرا مسجد“ کی طرف روانہ ہو گئے۔ ۱۲ بج کر ۱۰ منٹ پر میں نے تقریر شروع کی اور ساڑھے بارہ بجے ختم کی۔

نماز جمعہ کے بعد کئی پاکستانی بھائیوں سے ملاقات ہوئی۔ حنیف گوہل صاحب کافی دیر میرے پاس بیٹھے اور مقامی حالات کے بارے میں بتاتے رہے۔ خواجہین سمیت پچاس ساٹھ آدمیوں نے یہاں نماز ادا کی۔ کئی نمازی سو، دو سو، تین سو کلومیٹر سے یہاں نماز جمعہ کی ادائی کے لیے تشریف لائے تھے۔

نماز ادا کر کے ہم نے مسجد کا معائنہ کیا۔ اسی مسجد میں ہم نے رمضان المبارک (جو اگلے دن شروع ہو رہا تھا) میں نماز تراویح پڑھائی تھی۔ امام کے کمرے میں فریج،

بہر حال ٹیکری کی تیار شدہ اشیاء دوسری دکانوں سے مل جاتی ہیں۔ چیز اور بوتلیں وغیرہ لے کر ہم نے پیٹ کو جاپانی دانے پانی سے متعارف کرایا۔

گھمانے کے بعد مسجد حرام میں ہماری اجتماعی ملاقات ہوئی جس میں ہمیں تفصیل سے تمام حالات سے آگاہ کیا گیا۔ اسلامک سنٹر کی جاپان میں ۶۰ مساجد ہیں۔ چار پانچ مصلیٰ سنٹر ہیں۔ مصلیٰ سینٹر ایک عارضی بندوبست ہوتا ہے مثلاً رمضان المبارک کے لیے یا صرف جمعہ المبارک کے لیے۔ ہر سال دس گیارہ حفاظ قرآن کو پاکستان اور بھارت سے بلایا جاتا ہے۔ اس سال پاکستان سے ۷ اور بھارت سے ۳۰ حفاظ آئے تھے۔ اسلامک سنٹر کے علاوہ تبلیغی جماعت، منہاج القرآن اور دعوت اسلامی والے بھی حفاظ کو بلاتے ہیں۔ جاپان میں اس وقت ۶۰ مساجد ہیں۔ نوکیو میں ترکی نے ایک بہت خوبصورت مسجد تعمیر کروائی ہے۔ اس مسجد میں ترکی کے امام نماز پڑھاتے ہیں۔ نوکیو میں ہی سعودی عرب کی تعمیر کردہ مسجد بھی ہے۔ ملاقات ختم ہوئی تو مسجد کے سامنے باغ میں چلے گئے۔

باغ تقریباً ۳۰ میٹر چوڑا اور ۸۰ میٹر لمبا ہوگا۔ وہیں ہماری ملاقات ڈاکٹر منصور علی سے ہوئی۔ وہ سعودی عرب کے اسلامک سینٹر کی دعوت پر جاپان آئے تھے۔ باغ میں رنگ برنگے لباسوں میں بچے کھیل رہے تھے۔ ان کے لیے ایک طرف چھوٹے وغیرہ لگے ہوئے تھے۔ جگہ جگہ نشیمن لگی ہوئی تھیں۔ بچوں کی مائیں نشستوں پر بیٹھی آپس میں کپ شپ کر رہی تھیں۔ جاپانی ایک خاموش المی قوم ہے۔ بچے بھی خاموشی سے کھیل رہے تھے۔ بہت چھوٹے بچوں کے لیے فوم بچھایا گیا تھا اور وہاں کھلنے رکھے تھے۔ وہ وہاں کھیل رہے تھے۔ باغ کے چاروں طرف سائیکل چلانے کے لیے راستہ بنا ہوا تھا۔ بچے سر پر ٹوپ، جیکٹ اور خاص قسم کے جوتے پہن کر سائیکل چلا رہے تھے۔ سڑکوں پر بھی ہر سائیکل چلانے والا یہی اہتمام کر کے سائیکل چلاتا نظر آیا۔ ایک عورت چھوٹے بچوں کو جوڑو کرائے سکھا رہی تھی۔ (انھوں نے

اقرامسجد میں رمضان المبارک

بنتے کی شام چاند نظر آنے کی امید تھی۔ میں نے ایک نمازی سے پوچھا کہ چاند دیکھنے کا کیا طریقہ ہے؟ انھوں نے بتایا کہ یہاں کی حکومت نے ایک رویت ہلال کمٹی بنا دی ہے جس میں تمام اسلامی تنظیموں کے نمائندے شامل ہیں۔ وہ یا تو خود چاند دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مطلع صاف نہ ہو تو حکومت ملائیشیا کے اعلان پر عمل کر لیتے ہیں۔ جاپان میں ۲۸ میڈسن نہیں ہوتیں۔ سب مسلمان رویت ہلال کمٹی کے فیصلے کو مانتے ہیں۔ اگلے روز یعنی بروز بدھ نماز عشا کی ادا کی کے بعد ۲۰ رات شروع ہوئی۔ رات بہت چھوٹی تھی۔ ۲ گھنٹے بعد صبح کا وقت شروع ہونا تھا اس لیے ہم سوئے نہیں۔ صبح نماز فجر ادا کر کے سوئے اور پھر ظہر کے قریب اٹھے۔ پورا رمضان ہمارے یہی اوقات رہے۔

اگلے دن ایک ڈراما ہو گیا۔ ہمارے ایک نمازی مسجد کی پارکنگ میں گاڑی کھڑی کر کے مسجد کی طرف آرہے تھے۔ مسجد کی پارکنگ آدھا کلومیٹر دور ہے (سچی محلے میں گاڑی کھڑی کرنا جرم ہے)۔ پیدل چلتے چلتے حضرت کا فون آگیا۔ آپ نے اونچا اونچا بولنا شروع کر دیا۔ مسجد کے سرکاری انچارج کو ایک محلے دار نے جا کر شکایت لگا دی کہ اس طرح ایک نمازی اونچا اونچا بولتا ہوا میرے گھر کے پاس سے گزر رہا تھا جس نے مجھے پریشان کیا ہے۔ سرکاری انچارج مسجد میں آیا۔ اسی نے کہا کہ جس آدمی نے یہ "جرم" کیا ہے، وہ اس شخص سے جا کر معافی مانگے ورنہ پھر وہ شخص پولیس سے رجوع کرے گا۔ معافی مانگ کر جان چھڑائی۔

آپ سوچ رہے ہوں گے "مسجد کا سرکاری انچارج" کون ہوتا ہے؟ مسلمانوں نے ہر ملک میں ہی اپنا اور اپنے دین کا نام خوب روشن کیا ہے۔ مسجدوں میں مسلمانوں کے آپس کے جھگڑوں اور مارکٹائی کی وجہ سے مسجدوں کو یہاں سرکاری تالے بھی لگتے رہے ہیں۔ ایک جاپانی سے دوستی

کیپیوٹر، انٹرنیٹ، ٹیلی فون غرض ہر سہولت موجود تھی۔ یاد رہی خانہ مسجد سے تیس چالیس فٹ کے فاصلے پر تھا۔ حقیقت گوئدل صاحب کہتے تھے کہ مجھے یہاں بلدیہ کے دفتر میں کام ہے، چلیں آپ کو بلدیہ کا دفتر دکھالیں۔

بلدیہ آفس

ہم گاڑی میں بیٹھے اور چند منٹوں میں بلدیہ آفس پہنچ گئے جیسے یہاں "ایک شہ" کہتے ہیں۔ عوام کے ہر مسئلہ کا حل یہاں موجود ہے۔ نئی منزلہ عمارت ہے۔ بجلی، پانی، گیس کا مسئلہ ہو، کہیں آگ لگ گئی ہو، فائر بریگیڈ کو بلانا ہو، تھانے کا کوئی کام ہو، عدالتی مسئلہ ہو، زمینوں کے کاغذات کا معاملہ ہو، ہر سرکاری حکم کا کام یہاں ہوتا ہے۔ اندر داخل ہوئے تو سامنے کئی مشینیں سے اپنے متعلقہ شعبے میں اپنی باری کے نمبر کا ٹوکن لیا اور متعلقہ شعبے کی انتظار گاہ میں بیٹھ گئے۔

تھوڑی دیر میں باری آئی۔ گوئدل صاحب ادھر افسر سے ملنے چلے گئے۔ وہ واپس آئے اور ہم ایک مشین کے پاس چلے گئے۔ مشین میں فارم ڈالا۔ سکرین پر فیس کی رقم آئی۔ رقم گوئدل صاحب نے مشین میں ڈال دی۔ فارم پر رقم وصولی کی عمارت چھپ گئی، فارم مشین سے باہر نکل آیا۔ گوئدل صاحب نے متعلقہ افسر کو جا کر فارم دکھایا۔ اُس نے مہر اور دستخط کر کے کاغذات گوئدل صاحب کو دے دیے۔

دفتر کا وقت ۹ سے ۵ بجے تک ہے۔ ۵ بجے سے ۳ صبح پہلے بھی کوئی داخل ہو جائے اور مشین سے ٹوکن لے لے تو بلدیہ والے اُس کا کام کرنے کے پابند ہیں، چاہے ایک گھنٹہ لگ جائے۔ کبھی کسی بھی صورت میں اس دفتر میں (یا جاپان کے کسی بھی دفتر میں) کوئی افسر یا سرکاری ملازم اپنے کام سے غیر حاضر (یا چھٹی) پر نہیں ہو سکتا۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی موجود ہوگا۔ آپ یہ وہاں بھی نہیں سیں گے "صاحب چھٹی پر ہے" یا "صاحب میٹنگ میں ہے" یا "آج آپ کا کام نہیں ہو سکتا کل آئیں۔"

پھل ہے۔ میری بیوی ہو یا کوئی جاپانی، عام درخت کا پھل نہیں کھاتا، انہیں خطرہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ جراثیم سے بھرا ہوا ہوگا۔ یہ لوگ ہمیشہ باغوں میں لگے ڈاکڑوں کی انتہائی نگہداشت میں کچے پھل کھاتے ہیں۔ میری بیوی مجھے بھی کھانے نہیں دیتی، میں چوری چوری کبھی کبھار کھا لیتا ہوں۔

یہاں کئی مکے میں دکانیں نہیں ہوتیں۔ پورے جاپان میں ہمارے ہاں کے بڑے سٹوروں جیسے سٹوروں کا جال بچھا ہوا ہے۔ ہماری مسجد سے ڈیڑھ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک بہت بڑا سٹور ہے۔ ہم وہاں سے اپنی ضرورت کی تمام اشیاء لے آتے تھے۔ اس کے علاوہ ایک پاکستانی نے حلال فوڈز کا کاروبار شروع کر رکھا ہے۔ ان کی گاڑی بھی ہر ہفتے کی شام یہاں مسجد کے باہر آجاتی۔ ان سے ہم گوشت اور پاکستانی مسالے وغیرہ لے لیتے۔ نمازی حضرات بھی ان سے اپنی ضرورت کی چیزیں لے لیتے۔

اس مرتبہ رمضان ۲۰۰۹ء دن کا تھا۔ رویت ہلال کمپنی نے حمید کے چاند کا اعلان کیا۔ اُس کے مطابق ہم نے یہاں عید کی نماز پڑھی۔ تمام نمازیوں سے فردا فردا ملاقات کی۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ جو ذمے داری اپنے سر لی تھی، وہ اس ذات باری کی مہربانی سے بہت خوش اسلوبی سے ادا ہوگئی۔

رمضان کے بعد بھی اکتوبر کے آخری عشرے تک یہاں امامت کرانے کا سلسلہ چلتا رہا۔ اسلامک سرکل آف جاپان کے دوسرے مراکز پر بھی جانے کا اتفاق ہوا۔ واپسی سے قبل ڈزنی لینڈ کا بھی ٹکٹ لگایا، گاڑیوں کا جہاں نیلام (Auction) ہوتا ہے، وہاں بھی ہم گئے۔ ۲۰ اکتوبر کی شام وطن عزیز کی سرزمین پر قدم رکھا اور بحیرہ عافیت واپس پہنچے جانے پر خدائے واحد کی حمد و ثنا کرنے لگے۔

ہوگئی تھی۔ اس کا گھر مسجد کے قریب ہی تھا۔ اچھی طبیعت کا مالک اور رہنما نرمٹ کی زندگی گزار رہا ہے۔ پچھلے سال اس کی بیوی کا انتقال ہو گیا تھا۔ رمضان میں اکثر مسجد میں آجاتا تھا اور جو لوگ جاپانی زبان جانتے ہیں، ان سے گپ شپ کرتا رہتا تھا۔

غالباً اس دن ہمارا سولہواں روز تھا۔ پورے جاپان میں جشن کا سماں تھا۔ پورے ملک میں چلچلیں اور آتش بازی کا زور شور تھا۔ معلوم ہوا کہ اس مقدس دن تمام مُردوں کی روحیں اپنے گھروں میں واپس آتی ہیں۔ یہاں قریب ہی قبرستان ہے۔ جاپانی دوست مجھے وہاں لے گیا۔ ہر قبر دو دو دفائی مریخ فٹ کی ہوتی ہے۔ جاپانی اپنے مُردوں کو جلاتے ہیں۔ ہر جلد یہ آفس کے ماتحت مُردوں کو جلانے کی جگہ بنی ہوتی ہے۔ جلا کر مُردے کی راکھ جو ایک لفافے میں آجاتی ہے، یہاں لاکر دفائی جاتی ہے۔ ایک قبر میں کئی کئی مُردوں کی راکھ دفائی جاتی ہے۔ مقدس دن پر قبروں پر مُردے کی پسندیدہ چیز مثلاً میو، مالے، پیب، وغیرہ رکھے جاتے ہیں۔ قبرستان اس دن کھانے پینے کی چیزوں سے بھرا ہوتا ہے۔

رمضان میں مسلمانوں کی اکثریت کاروبار کم کر دیتی اور اپنا زیادہ سے زیادہ وقت عبادات میں صرف کرتی ہے۔ افطاری اور رات کا کھانا مسجد میں اہتمامی طور پر کھایا جاتا ہے۔ مسجد کے باورچی خانے میں تمام نمازیوں کے لیے کھانا پکایا جاتا ہے۔ تراویح پڑھنے والے صبح ۶:۰۰ کے درمیان ہوتے تھے۔ پانچ چھ جاپانی خواتین بھی روزانہ آتی تھیں۔ یہ سب پاکستانیوں کی بیویاں تھیں۔ پاکستانیوں کے علاوہ ایک دو افغانی، دو بنگالی اور دو افریقی بھی باقاعدگی سے نماز تراویح کے لیے آتے۔ کئی نمازی دو دو تین تین دن اوھر ہی رہتے۔

ایک دن ایک صاحب کہنے لگے کہ میں آپ کے لیے ایک تحفہ لایا ہوں لیکن میری بیوی (جو کہ جاپانی ہے اور ساتھ آئی ہوئی ہے) کو معلوم نہ ہو۔ وہ جاتے ہوئے کہنے لگے، یہ ہمارے گھر میں لگے ہوئے تاشپاتی کے درخت کا



اپنے گیس کا بل گھٹائیں



گیزر کا تھر مواسٹیٹ WARM پر رکھیں

گیزر چوٹے کے مقابلے میں 4 گنا زیادہ توانائی استعمال کرتا ہے۔ گیزر کے مختار استعمال سے اور سرموسم میں اسے دوام پر رکھ کر آپ اپنے گیس کے بل میں سے ایک بڑی رقم بچا سکتے ہیں۔

- گیزر کو مستقل WARM پر رکھیں، صرف استعمال سے 15 منٹ قبل VERY HOT پر منت کریں اور استعمال کے بعد واپس WARM پر لے آئیں۔
- اگر 24 گھنٹے سے زائد دودھ پکے گھر سے باہر جائیں تو گیزر بند کر دیں۔
- موسم سرما کی آمد سے قبل اپنے گیزر کو باقاعدہ چیک کروائیں، انکی سرس اور مرمت کروالیں۔
- گیس کی تمام مصنوعات کی یا قاعدگی سے سرویس کروائیں۔
- ہمیشہ اچھی کوآئی کے گیس آلات اور فیکٹر استعمال کریں جو پاکستان اسٹینڈرڈ اینڈ کوآئی کنٹرول اتھارٹی (PSQCA) کے متعین کردہ معیار کے مطابق ہوں۔
- اس بات کا ہمیشہ راطیمان کر لیں کہ گیس کی تمام مصنوعات اور ان کی فیکٹور میں کہیں نیچے نہ ہو۔

مندرجہ بالا راہنما بایات پر عمل کریں اور گیس کا بل گھٹائیں۔

کھیل
کھلاڑی

کھیلوں کی دنیا

دنیا کے کھیل سے دلچسپ معلومات اور
نئی خبروں کا دل لہانے والا کالم

رانا محمد شاہد

بغیر چھکے کے..... ۲۱۰۵ رنز

برطانیہ کے جونا تھن ٹراؤٹ ٹیسٹ کرکٹ میں چھکے کے بغیر سب سے زیادہ یعنی ۲۱۰۵ رنز بنانے والے پہلے برطانوی
بلے باز بن گئے۔ ان سے پہلے یہ ریکارڈ کیون پیئرسن کے پاس تھا جنہوں نے ۳۴ ٹیسٹ میچوں میں ۲۰۶۱ رنز بغیر چھکے
کے بنائے تھے۔

www.Paksociety.com

گینز انٹرنیشنل کی جانب سے اسے آرام اور پاؤں میں مالش کی اجازت بھی دی گئی تھی۔ اپنی کامیابی پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے انجیٹ کا کہنا ہے کہ وہ اس سے قبل بھی کئی ملکی اور مقامی مقابلے جیت چکا ہے۔

بھارت میں فٹ بالوں کی لاکھوں ڈالر بولی

بھارت میں کرکٹ کے ٹوہن مٹ آئی بی ایل کی کامیابی کے بعد اسی طرز پر شروع ہونے والی فٹ بال پریمیر لیگ کے کھلاڑیوں کی نیلامی شروع ہو گئی۔ بھارت کے مشرقی شہر کولکٹہ میں پریمیر لیگ سوکر کے نئے کھلاڑیوں کی نیلامی ہوئی۔ اس میں ۵۰ ٹیموں کے مالکان نے مل کر فٹ بال کھلاڑیوں اور کوچوں پر ۵۰ لاکھ ڈالر کی بولی لگائی۔ ارچناتن کے سابق سٹرائیکر ہرمن کرپسیہ کی سب سے زیادہ بولی تھی۔ انھیں ۸ لاکھ ۳۰ ہزار ڈالر میں خریدا گیا۔

بنگلہ دیشی ایمپائرز نے کرکٹس کی جان لی

بنگلہ دیش میں ایمپائرز نے کرکٹ کے ۱۵ سالہ کھلاڑی کے سر پر بلا مار کر اس کی جان لے لی۔ بنگلہ دیش کے ضلع کٹورج میں ہونے والے ایک میچ کے دوران فیصلے پر احتجاج کرنے والے نذر السلام کو ایمپائرز نے غصے میں آ کر بیلے باز سے چھینا گیا بلا سر پر دے مارا۔ میچ کے دوران تو کھلاڑی نے کسی قسم کی تکلیف ظاہر نہیں کی لیکن

وکنوں کی تیس ترین سچری کٹوتی ریکارڈ

سید احمد نے ٹیسٹ وکنوں کی تیس ترین سچری کٹوتی ریکارڈ بنا دیا ہے۔ اس سبب ٹیل تک چھپنے میں انھیں صرف ۱۹ میچ کھیلنا پڑے۔ اس سے قبل وقار یونس اور محمد آصف نے ۲۰، ۲۰ ٹیسٹ میچوں میں وکنوں کی سچریاں مکمل کیں۔ ٹیسٹ وکنوں کی تیس ترین سچری کا عالمی ریکارڈ انگلینڈ کے لوہمین کے پاس ہے۔ انھوں نے یہ کارنامہ ۱۶ میچوں میں انجام دیا۔ انگلینڈ کے خلاف اس میچ میں پاکستانی سپنروں نے ۱۹ وکٹیں لیں۔ ایک مرتبہ ۱۹۷۸ء میں انگلینڈ ہی کے خلاف عبدالقادر، توصیف احمد، اور اقبال قاسم جبکہ دوسری مرتبہ ۱۹۸۰ء میں ویسٹ انڈیز کے خلاف عبدالقادر، اقبال قاسم اور محمد نذیر جوینئر نے یہ کارنامہ انجام دیا تھا۔

۱۵۶ کلومیٹر کا سفر ننگے پاؤں

ایک بھارتی نوجوان نے ۱۵۶ کلومیٹر کا فاصلہ ننگے پاؤں طے کر کے عالمی ریکارڈ قائم کر دیا۔ بھارتی ریاست آسام میں ۲۲ سالہ ۷۱ بجیت نامی نوجوان نے ۱۵۶.۲ کلومیٹر کا سفر ننگے پاؤں طے کر کے اپنا نام گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں درج کروا لیا۔ ۷۱ بجیت پولیس میں ملازم ہے۔ اس نے بغیر آرام کیے یہ سفر طے کیا جبکہ



جسٹس جعفری بائیکاٹ شرط لگا کر منکر گئے

سابق برطانوی کپتان اور معروف کمشنر جعفری بائیکاٹ انٹرنیشنل ٹیسٹ میں انگلش ٹیم کی شکست پر اپنے ۳۳ راکر فروخت کرنے کی شرط لگا کر منکر گئے۔ کمشنری کے دوران بائیکاٹ نے برطانوی ٹیم کی کامیابی کا دعویٰ کیا اور کہا کہ اگر ٹیم ہارے تو وہ اپنے تینوں راکر فروخت کر دیں گے لیکن جب صورت حال تبدیل ہوئی تو انھوں نے کہا کہ وہ مذاق کر رہے تھے۔ دوسری طرف انھوں نے یہ بھی کہا کہ میں نے ۲۵ مریض کرکٹ کھیلی اور ۲۳ سال کمشنری کی۔ مگر اس عرصے میں انگلینڈ کو اتنے بڑے طریقے سے ہارے بھی نہیں دیکھا۔

۳۳۸ رنز بنا کر مقابلہ برابر کر دیا۔ یہ چارٹھ سال کے سٹینی خیز مقابلوں میں سے ایک تھا۔ ٹنڈولکر نے ۲۰۱۱ء میں دوسری سچری ورلڈکپ ہی میں جنوبی افریقہ کے خلاف ہائی۔ اس میچ میں ٹنڈولکر نے ۱۱۱ رنز بنائے۔ بھارت نے ۲۹۷ کا ہدف دیا لیکن جنوبی افریقہ نے سٹینی خیز مقابلے کے بعد یہ میچ ۳ روٹ سے جیت لیا۔ حقیقت چاہے کچھ بھی ہو، ۲۰۱۱ء کا سال ثابت کر گیا کہ ٹنڈولکر نے جب سچری کی، بھارت میچ نہیں جیت سکا۔

اسی رات نذرالسلام کو سر میں درو کی وجہ سے ہسپتال لایا گیا جہاں دو وفات پا گیا۔ پولیس نے ایسپائر کے خلاف مقدمہ درج کر لیا۔

تھائی لینڈ عالمی بیڈریس

تھائی لینڈ میں ہونے والی سالانہ بیڈریس میں دنیا بھر سے آنے والے سیاح خوب لطف اندوز ہوئے۔ تھائی لینڈ کے ساحلی شہر پٹیا میں ہونے والی اس دلچسپ ریس میں مقامی لوگوں کے ساتھ ساتھ دنیا بھر سے آنے والے سیاح بھی حصہ لیتے ہیں۔ ریس کے شرکا، مسٹر نما لڑائیوں کو بڑی خوبصورتی سے سمجھتے ہیں۔ گزشتہ ۳۰ سال سے ہونے والی اس منفرد ریس میں ۶ افراد پر مشتمل کئی ٹولیاں حصہ لیتی ہیں۔ اس سال بارش کے باوجود دودھ کو جاری رکھا گیا۔ شرکا، نے اپنے بیڈ کو مختلف شعلیں سے بھی چھیں جنہیں دیکھ کر شائقین خوب محظوظ ہوئے۔ جیتنے والی ٹیم کو انعام میں ایک ٹرافی دی جاتی ہے۔

ٹنڈولکر نے کی سچری بھارت میچ ہارا

دنیا کے کرکٹ میں آن گنت ریکارڈوں کے مالک بھارتی بلے باز چن ٹنڈولکر کے حوالے سے ایک منفی رائے یہ بھی ہے کہ ٹنڈولکر ریکارڈ کے انبار لگانے میں اس لیے کامیاب ہوئے کہ انہوں نے ہمیشہ اپنی افزادی کا کردار کو اہمیت دی نہ ہی اس میں ان کا کوئی کردار نہیں ہوتا اور وہ میچ وزیلے باز نہیں۔ یہ درست ہے یا نہیں اتفاق کہ اکثر ایسا ہوا ہے کہ جب ٹنڈولکر نے سچری کی، بھارت میچ ہار گیا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ۲۰۱۱ء میں بھی ٹنڈولکر نے ۲ سچریاں لیں تو بھارت کیا میچ جیتا؟ جی نہیں، ایک میچ میں بھارت کو شکست ہوئی اور ایک میچ غیر یقینی طور پر نائی ہو گیا۔ ورلڈکپ ۲۰۱۱ء میں ٹنڈولکر نے انگلینڈ کے خلاف ۲۰۰ رنز کی اننگز تراشی، جواب میں اینڈرولسٹن اس نے ۱۳۵ رنز کی جوابی اننگز کھیل کر انگلینڈ کی پوزیشن مضحکم کر دی۔ بہر کیف، آخری دور میں انگلینڈ نے

اوپس

اچھوتے ڈاک ٹکڑ کا احبار

لندن میں جولائی/اگست میں ہونے والے اوپس کی تیاریوں کو آخری شکل دی جا رہی ہے۔ اسی سلسلے میں گزشتہ دنوں پیرا اوپس کے منفرد اور اچھوتے ڈاک ٹکٹ بھی فروخت کے لیے پیش کر دیے گئے۔ برطانیہ کی ملکہ کی تصویر کے ساتھ ساتھ اب عام شائقین اوپس کو کو بھی مستقبل کے حوالے سے اپنی یادوں میں سمو سکیں گے۔ یوں برطانیہ میں رہنے والے شائقین یہ ڈاک ٹکٹ عام دکانوں اور ڈاک خانوں سے خرید سکیں گے جبکہ برطانیہ میں ڈاک کا حکم ”رائل میل“ بھی اس کے علاوہ خصوصی طلائی تحفے اور نمونیں جاری کرنے کے سلسلے میں تیزی سے تیار کیا کر رہا ہے۔

شدید سردی میں

تیراکی کا سالانہ مقابلہ

جرمنی کے دریائے ڈینیوب میں شدید سردی کے باوجود تیراکی کے سالانہ مقابلے منعقد ہوئے۔ ان میں سیکڑوں افراد نے حصہ لیا۔ دریا کے کنارے اس رخ بست موسم میں ہر سال سیکڑوں افراد اکٹھے ہوتے اور گرمی کی شکل میں دریا میں چھلانگ لگاتے ہیں۔ وہ کچھ دیر دریا میں حیرنے کے بعد کنارے پر نکل آتے اور گرم مشروبات سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ۳۵ رمنٹ کی تیراکی میں ۱۵ سال سے زائد عمر کے افراد حصہ لے سکتے ہیں۔

مہر محمد خلیل کے دن پھر گئے

مارچ ۲۰۰۹ء میں سری لنکا ٹیم کو حملے کے دوران موت کے منہ سے نکالنے والے بس ڈرائیور مہر محمد خلیل کے دن پھر گئے ہیں۔ کل کس ڈرائیور آج کا کاروباری بن چکا ہے۔ وہ پاکستان سے فریجیئر منگوا کر مراکش میں فروخت کر رہے ہیں جبکہ جلد ہی وہ نئی شاخ مراکش کے دارالحکومت ریباط میں کھولنے والے ہیں۔ اس سے قبل کاسابا لاکا میں ان کا کاروبار جنوبی کامیابی سے چل رہا ہے۔ مہر محمد خلیل کا کاروباری بننے کے باوجود ایک مرتبہ پھر سری لنکا ٹیم کی بس چلانے کے خواباں ہیں۔

اونچا ترین شاٹ

ٹیسٹ کرکٹ کے ابتدائی دنوں کی بات ہے، آسٹریلیا کی ٹیم کا ایک کھلاڑی جارج جان پلڑ تھا۔ اس بے باز کا قد ۶ فٹ ۶ انچ اور وزن تقریباً ۱۰۲ کلوگرام تھا۔ اسے عام طور پر آسٹریلیائی ہرکولیس کہا جاتا تھا۔ جارج جان پلڑ زوردار نہیں لگانے کا ماہر تھا۔ اس نے آسٹریلیائی ٹیم کے ساتھ انگلینڈ کے ۵۲ دورے کیے اور کل ۷۷ ٹیسٹ میچ کھیلے۔ ۱۸۸۰ء میں جب انگلینڈ کی سرزمین پر پہلا ٹیسٹ اوول کے میدان میں کھیلا گیا تو جارج جان نے ایک اونچی بہت لگائی اور ایسی اونچی کہ گیند کے نیچے آنے تک وہ اپنے ساتھی کے ہمراہ ۲۲ رن مکمل کر کے تیسرے دن کے لیے ٹرا ہی تھا کہ کیچ آؤٹ ہو گیا۔ پلڑ اپنی ٹیم کے لیے پہلی انگلینڈ میں صرف ۲ رن ہی بنا سکا تھا۔ یہ ٹیسٹ کرکٹ کی منفرد شاٹ تھی کہ جس کے نیچے آتے آتے ۲۲ رنز بن چکے تھے۔

کرکٹ کی جگہ فٹ بال

برطانیہ میں ساتواں کرکٹ ورلڈ کپ جاری تھا۔ ایک کے بعد ایک فتوحات سمیٹتی ہوئی پاکستانی ٹیم کے کھلاڑی فریڈنگ روم میں خوش گپیوں میں مشغول اور اپنی پرفارمنس سے محفل کو شگفتہ زعفران بناتے ہوئے تھے۔ ایسے میں لیگ اسپنر مشتاق احمد فٹ بال کے ساتھ مختلف کرتبوں کا مظاہرہ کرنے میں بھی مصروف نظر آتے تھے۔ وہ فٹ بال کو کبھی دائیں پاؤں کی اگلیوں کی مدد سے اوپر اٹھاتے اور کبھی بال لے کر تھوڑا آگے بڑھاتے، کبھی

ڈرمل کرتے اور بونٹی کھیلتے کھیلتے ان کے ذہن میں نہ جانے کیا بات آتی کہ انھوں نے ساتھی کھلاڑیوں کو متاثر کرنے کے لیے (کہ میں کرکٹ کے علاوہ فٹ بال بھی بہت اچھی طرح کھیل سکتا ہوں) فٹ بال کو گل لگا دی۔ بال ہوا میں بلند ہوا اور زوردار دھماکے کے ساتھ شیشے سے جا ٹکرایا، چھن کی آواز آئی اور شیشہ اور ٹیوب لائٹ گر پڑی کرچی ہو گیا۔ اب صورتحال یہ تھی کہ مشتاق احمد کو اپنی شوخیوں کا ضیاع ساتھی کھلاڑیوں کے قہقہوں کی صورت میں بھگتنا پڑا۔

ایک یادگار مہم جوئی

امریکا کی ایک مہم جویم نے چین کا خطرناک ترین دریا شوانکو عبور کر لیا ہے۔ پانی کا بہاؤ ۱۲۰۰۰ کیوسک فٹ فی سیکنڈ تھا۔ سفر کے آغاز میں وہ ایک آبشار سے گزرے۔ پھر اچانک دریا کا حجم دگنا ہو گیا اور کشتیاں گہری کھاٹی میں چلی گئیں۔ وہاں احمد جے میں ایسی آوازیں آ رہی تھیں جیسے چڑیاں مسلسل پانی میں گر رہی ہوں۔ ایک جگہ ایک اور ہنری پانی میں اترے تو وہ اس طرح گھومتے گئے جیسے واشنگ مشین میں کپڑے دھوئے جا رہے ہوں۔ ہنری کا ہیڈلٹ گر گیا۔ اس کی آنکھیں پھر اٹھیں جبکہ ایک آبشار کے نیچے پھنس گیا اور مسلسل آبشار سے لڑتا رہا حتیٰ کہ اس کے ساتھیوں نے اسے بچالیا۔ وہ مہم ادھوری چھوڑ کر واپس لوٹ گئے مگر ان کا کہنا ہے کہ وہ خوش قسمت ہیں کہ کبھی ساتھی زندہ بچ گئے۔



۲۳ مارچ کے موقع پر
ایک دلکھی کرنے والی یاد
عبدالرشید

”ماں! میں نے تمہارے ساتھ جانا ہے“

قیام

پاکستان کے لیے برصغیر کے مسلمانوں
نے تقریباً ۱۰ لاکھ جانوں کا خزانہ
چھوڑ کیا۔ ہندوستان کی تقسیم کے حزم
میں کافرلیں کی سرپرستی میں سکھوں
اور ہندو فنڈوں نے مسلمانوں پر جو ظلم و ستم ڈھایا یہ ایسی قم
تاک داستان ہے جسے بیان کرتے ہوئے آنکھیں بھیگ
جاتی ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ایک ملک سے اتنی بڑی ہجرت
پہلے کبھی نہیں ہوئی۔ تاہم ہمارے ادیبوں نے یہ المناک
باب بیان کرنے میں قدرے بغل سے کام لیا ہے۔ اسی لیے
آج تک قیام پاکستان کے مقدمتہ کا حق واقف نہیں۔
انھیں تو یہ خط پاکستان سونے کی طشتی میں رکھا گیا، وہ
نہیں جانتے کہ یہ سرزمین حاصل کرنے کے لیے کتنی
بٹیوں، ماؤں اور معصوم بچوں نے اپنی جانوں کا خزانہ پیش
کیا۔ پاکستان ہجرت کرنے والوں میں میری ایک عزیزہ بھی
شامل ہیں۔ ان کی کہانی بھی ایک ایسا دردناک باب ہے جو
شاید ان کی موت کے بعد ہی قلم ہو۔ گو وہ اب ۳۰ برسوں کی
ماں ہیں۔ ان کے میاں ایک پٹھان سناہنی کے مالک اور
صاحب حیثیت ہیں۔ مگر وہ جس کرب میں مبتلا ہیں، وہ ایک
ماں ہی جان سکتی ہے۔ ان کی ایک بیوی، معصوم اور بچوں کی
بچی دریائے یاس کے کنارے رو رہی تھی۔

یعنی جب ان کا قافلہ دریائے یاس کے قریب پہنچا، تو
سکھ درندوں نے حملہ کر دیا اور بے یار و مددگار قافلے کو تھق
کرنے لگا۔ میری عزیزہ اپنی ۱۶ اور ۲۰ سالہ بچیوں کے ساتھ
درختوں کے ایک جھنڈ میں چھپ گئیں۔ بدقسمتی سے جاتے
ہوئے ۳۰ سکھوں نے ماں بٹیوں کو چھپتے دیکھ لیا۔ ابھی ایک
سکھ نے کہا ”تو معراج دین دی گزرتی تے نہیں؟“ (تم
معراج دین کی بیٹی تو نہیں؟)

میری عزیزہ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگیں ”ہاں میں اس
بلایب باپ کی بیٹی ہوں۔ تم نے میرے ماں باپ کو شہید
کر دیا، لو مجھے بھی مار ڈالو۔“
مگر سکھ کہنے لگا ”تیرے باپ نے ایک مرتبہ مجھ پر
احسان کیا تھا اور پکیری میں میرے حق میں گواہی دی تھی۔
اس کا مجھ پر برا احسان ہے۔ میں تجھے دریا پار کرادوں گا۔“
میری عزیزہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس سکھ کے ساتھ چل
پڑیں۔ ابھی چند قدم ہی چلے ہوں گے کہ ایک اور جھتے نے
حملہ کر دیا۔ شام ہونے میں ابھی تھوڑا سا وقت تھا۔ دریائے
یاس کا پانی ہر چیز بہا لے جا رہا تھا۔ بارش اور بجلی گوندنے
سے مظہر اور بجلی خوفناک ہو گیا تھا۔ دو سکھ کہنے لگے ”میں دونوں
بچیوں سمیت تمھیں دریا پار نہیں کر دے سکتا۔ صرف ایک بچی
ساتھ لے لو، دوسری بچیوں چھوڑ جاؤ۔“

اسی اثنا میں شور بلند ہوا۔ جس میں مظلوموں کی
چنج و پکار اور آہیں شامل تھیں۔ سکھ جتے پکے پکے بے آسرا
لوگوں کو مار رہے تھے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میری عزیزہ نے
اپنی چھوٹی بچی کو تھوڑے سے چپے سے کرکیر کے نیچے بٹھایا
اور بڑی کو لے کر چل پڑی۔ چھوٹی بچی نے چلا کر کہا
”ماں! میں نے تمہارے ساتھ جانا ہے۔“ سکھ نے ایک
زوردار چھینڑ اس کے منہ پر مارا جس سے وہ زمین پر گر گئی۔
سالوں مشروں بعد بھی میری عزیزہ ہنستے ہنستے رو پڑتی اور روتے
روتے ہنس پڑتی ہیں۔ ایک دن مجھے سے کہنے لگیں ”بھائی! مجھے
موت کیوں نہیں آجاتی؟ کاش وہ سکھ مجھے وہیں قتل کر دیتا۔ مجھے
ایسی سزا تو ملنی۔ مجھے بئی روہینہ بہت یاد آتی ہے۔ وہ نہ جانے
کس حال میں ہوگی۔ اس کی آواز میرے کانوں میں گونجتی ہے
”ماں! میں نے تمہارے ساتھ جانا ہے۔“



سروے

یہ نادانی ہے یا اندر کی کمزوری کا اظہار

دوسروں کے تہوار
منانے میں اتنی
بے تباہی کیوں

www.paksociety.com

مشریہ حسنم

پاکیزگی ہے اور وہ بناوٹ اور تصنع سے عاری ہیں۔ ہمارا
دین زندگی میں آسانی پیدا کرتا اور راستہ دکھاتا اور اپنے
ماننے والوں کو دوسروں سے مختلف، منفرد اور اچھا بناتا
ہے۔ اس کے علاوہ اس کی عبادات، رسم و رواج سبھی
دوسروں سے مختلف ہیں اور انہیں اپلو خاص دوسروں سے
مختلف رکھا گیا ہے اور اس کی تلقین بھی کی گئی ہے۔

بھگتے ہوئے لوگ پھر لوٹ آئیں
محبت کے ان کو اگر چند مل دیں
کہ مغرب سے مرعوب لوگوں کو غائب
صدفِ محمدؐ کا کوئی عمل دیں
ہمارے دین کی پہچان محبت، بھائی چارہ اور سادگی
ہے۔ اسی لیے اس کی رسم و رواج اور تہواروں میں

www.paksociety.com

چاہیے، تاکہ وہ راہ سے نہ ہلک سکیں۔

شاہد کشمیری پہلے گورنمنٹ شالیمار کالج، پانچویں وادی اور

پچھلے چند مشروں سے دیگر مذاہب و اقوام کے طور طریقے اور رسم و رواج سے ہمہ از سے اپنائے جا رہے ہیں۔ صورت حال یقیناً تشویش ناک ہے کہ ہماری قوم کے چند بھٹکے ہوئے آہو جوٹوئے حرم چائا بھول چکے، ان تہواروں میں بھرپور شرکت کرتے ہیں۔ ہندوؤں کی تہذیب اور مغرب کی ثقافتی یلغار اپنی مصنوعی کشش سے ہمارا دامن دل و نگاہ کھینچ رہی ہے۔ کافروں اور مشرکوں کے تہوار منانے میں بے تابی اور اپنوں سے دوری ہمارے جذبہ ایمان کی کمزوری، ملی روایات سے دوری اور تہذیبی شعور میں کمی کی علامت ہے۔ اگر ہم نے بروقت ہوش کے ناخن نہ لیے تو ہماری تہذیبی برپادی یقینی ہے۔

روپیہ شاہین رکن قومی اسمبلی (پنجاب، پی ایچ ایم) رکن صوبہ گلگت بلتستان

امیر ریگم ٹرسٹ کے تحت ہم نے اجتماعی شادیوں کی بنیاد رکھی اور اب تک ۰۰ بچوں کی شادیاں کروا چکے۔ یہ شادیاں سادگی اور مذہبی روایات کے مطابق کروائی گئیں۔



ہمارا مذہب اسلام ہمیں بھائی چارے کا سبق دیتا ہے۔ چنانچہ ہمارا مقصد معاشرے کے بے وسیلہ لوگوں کی مدد کرنا ہے۔ صدر پاکستان، وزیر اعظم، وزیر اعلیٰ، گورنر اور دیگر اہم شخصیات عظیم بچیوں کو اپنے دست شفقت سے رخصت کرتی ہیں۔ اس طرح امیر و غریب اکٹھے بیٹھ کر بھائی چارہ کی فضا قائم کرتے ہیں اور یہی ہمارے مذہب کا درس ہے۔ اس لیے ہمیں سینٹ ویلٹائن جیسے دوسروں کے تہواروں کی قطعاً ضرورت نہیں۔ اپنے تہواروں اور سوچ پر فخر کرنا چاہیے۔

حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

”جس نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی، وہ کل

قیامت کے دن ان ہی میں شمار ہوگا۔“ (ابن ماجہ)

ہمارے تہوار مثلاً نکاح، ولیمہ، عیدین، شب برکت، رمضان المبارک اور عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم بڑے نفیس، خوبصورت اور قابل احترام ہیں جن میں کہیں بھی نمائش یا خود نمائی نہیں۔ لیکن کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے بعض ہم وطن اپنے تہوار چھوڑ کر ماڈرن کپڈائٹ کے چکر میں دوسروں کے مذہبی و ثقافتی تہوار مناتے اور رسوم بڑے فخر سے اپنانے کی نادانی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ کیا مہندی شادی پر دھوم دھڑکا، ویلٹائن ڈے، ایپل فیل، اور اور بسنت وغیرہ ہمارے تہوار ہیں؟ آئیے دیکھتے ہیں کہ مختلف مذاہب فکر کے لوگ ان کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں۔

حاجی میاں امین جگدرن تحریک پاکستان (گولڈ میڈلسٹ)

ہمارا مذہب اسلام انتظامیہ ہے کہ وہ تمام آسمانی مذاہب کی عزت کرنے کا درس دیتا ہے۔ یہودیوں اور عیسائیوں کا مذہب بھی آسمانی ہے لیکن اسلام آنے کے بعد پچھلے تمام مذاہب اور ان کی کتب جن میں انہوں نے خود ہی تبدیلی کر لی تھی، متروک ہو گئے۔ اسلام ہی سچا اور آخری مذہب ہے چنانچہ ہمیں دین کے بتائے گئے تہواروں اور ہدایات پر عمل کرنا چاہیے۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے یہی ہماری پہچان ہے۔

کر نل محمد سلیم ملک کارکن تحریک پاکستان (گولڈ میڈلسٹ)

میں غیر اسلامی تہواروں مثلاً ویلٹائن ڈے، بسنت وغیرہ کے سخت خلاف ہوں۔ آخر بسنت منانے سے ہمیں کیا حاصل ہوتا ہے؟ کروڑوں روپے کا سرمایہ ضائع ہو جاتا ہے، جو پاکستان کی ترقی اور خوشحالی کے لیے خرچ ہونا چاہیے۔ اسی طرح ویلٹائن ڈے منانے میں کیا فائدہ ہے؟ ہماری ہی نسل بے راہ روی کا شکار ہو جاتی ہے۔ ہمیں بچوں کو اپنے مذہب کے بارے میں صحیح طرح آگاہ کرنا

عفت علوی شہزادہ ملک سرور پرنسپل پاکستان

زمانے میں گھو یا نر پٹن کے زیر اثر دنیا چھوٹا سا گاؤں بن گئی ہے۔ لہذا اب دینا لوبی ہماری مٹی تہذیب و ثقافت قرار پائی۔ اس کے زیر اثر آج دنیا کی اکثر اقوام تہذیب و ثقافت اور تمدن کے باغ میں ایک دوسرے سے بہت زیادہ اخذ و استفادہ بھی کرتی ہیں۔ نتیجے میں ایک قوم یا علاقے کی مذہبی، ثقافتی و تمدنی روایات دوسری اقوام یا ممالک میں بھی رواج پاری ہیں۔ ان میں سے ایک ویلنگٹن ڈے بھی ہے۔



ہم لوگ دوسروں کے تہوار اور عالمی دن بہت شوق سے مناتے ہیں، یہ سوچے بنا کہ یہ صحیح ہیں یا نہیں، مثلاً "ویلنگٹن ڈے" زور و شور سے منا کر بدکاری کی تقلید کرتے ہیں جو ہمارے مذہب میں جائز نہیں۔ ہمیں چاہیے کہ غیروں کے تہوار منانے سے پہلے اس کی تاریخ ضرور پڑھ لیں، تاکہ گناہ گار ہونے سے بچ سکیں۔

تقسیم طاہر پرنسپل ادارہ جمالی معذراں لاہور



ہمارا مذہب بہت سادہ اور رحمتوں والا ہے۔ لیکن ہم نے دوسروں کے تہوار منا اور خدائی کر کے خود کو مصیبتوں میں پھنسا لیا۔ جیسے شادیوں پر مہندی اور تیل

کی رسم پر بے جا مصروف اور کھانے کا زیاں جس پر لاکھوں روپیہ ضائع ہو جاتا ہے۔ اگر ہم اپنے مذہب سے مثال لینا چاہیں تو پیارے رسولؐ کی پیاداری جی حضرت فاطمہؓ کی شادی سامنے ہے۔ کائنات کی سب سے عظیم ہستی ﷺ کے جگر کا ٹکڑا اور ایسی سادگی سے پیادہ سبحان اللہ۔ آپؐ نے شادی نہ کرتے ہوئے حضرت علیؓ سے فرمایا، اپنی ذرہ بھر بچہ، کیونکہ ان کے پاس کچھ نہ تھا۔ اس سے حضرت فاطمہؓ کا ایک جوا۔ جائے نماز، آنا پینے کی پتلی اور کھانا پکانے کے لیے ٹھوڑے سے برتن خریدے گئے۔ نکاح میں مجبور اور دودھ سے تواضع ہوئی۔

برجیس اولیس محلہ لاہور گرماٹر سکول لاہور

آج کے مسلمانوں کا ایمان کمزور ہو چکا ہے، اسی لیے وہ دوسرے مذاہب کے تہوار منانے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ مثلاً ویلنگٹن ڈے اور یسٹ جیسے غیر اخلاقی اور بے

سمندر منصور پرنسپل ادارہ لاہور

تہوار منانا بُری بات نہیں، مگر یہ دیکھنا ضروری ہے کہ کوئی خاص تہوار منانے کے ہم اپنا مذاق تو نہیں اُڑا رہے، جیسا کہ اپریل فول۔ اس روز انگریزوں نے بہادر شاہ ظفر کے بیٹوں کو قتل کر کے ان کے



سر ملٹ میں سجا کے پاب کے ساتھ پیش کیے اور کہا "اپریل فول"۔ لہذا یہ تہوار منانا اپنا ہی مذاق اُڑانے کے مترادف ہے۔

زاہد ہمایا شاہ شاعر ادیب / انڈیا میں آفیسر حکومت پنجاب

دنیا میں یہ روایت رہی ہے کہ معاشروں میں حاکم اقوام کی تہذیب و ثقافت رفتہ رفتہ رائج ہوگئی۔ تاریخ عالم گواہ ہے کہ جب بھی کسی زبردست قوم نے دوسری کو بزدل شمشیر مغلوب کیا، تو وہاں اپنی تہذیب اور تمدن کو رائج کیا۔ یہ سلسلہ ازمنہ قدیم سے چلا آ رہا ہے۔ آج کے

ادیبہ حسن ملک، ملر

بعض لوگ بدیہی تہوار مثلاً ویلنٹائن ڈے، بسنت، اپریل فول اور شادیوں کی بے جا رسمیں اپنا کر اپنے آپ کو روشن خیال اور ماڈرن ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ہمیں حضور کی زندگی کو مثال بنا کر ان پر عمل کرنا چاہیے اور یہی ایک مسلمان کا فرض ہے۔

مکرم خان قرین، مونہا ٹیک، سیان، بھٹی ریکارڈ ہاؤس

ہمیں بے شک ہر مذہب کا احترام کرنا چاہیے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ان کی رسوم بھی اپنا لیں۔ ہم مسلمان ہیں لہذا ہمیں اپنی رسومات اور تہوار ای مذہبی ہوش و جذبے سے

منانا چاہیے۔ یہی ایک مسلمان کی شان اور ایمان ہے۔ دین اسلام سے وابستہ ہونا ہم پر اللہ تعالیٰ کا خاص کرم اور احسان ہے۔ ہمارا دین ہمیں جو احکام اور ہدایت دیتا ہے، اسی پر عمل کرنے میں ہماری فلاح اور بقا ہے۔

ارم قریشی، بی۔ این بی۔ ایل، کینٹ

اگر ہم اپنی نئی نسل کو اپنے مذہب کی سچی تعلیم دیں تو وہ ویلنٹائن ڈے جیسے تہوار نہ منائیں۔ ویلنٹائن کو محبت کا دن سمجھا جاتا ہے۔ لوگ معاشرے کی غیر ضروری اور پرانی گھٹن زدہ روایت سے گھبرا کے اسے منانا پسند کرتے ہیں۔ اگر ہم اپنے مذہب کی روایات پر عمل کریں تو ایسے دن منانے کی بھی کوشش نہ کریں کیونکہ اسلام اتنا حدت پسند مذہب ہے جس میں ہمارے سب مسائل اور پریشانیوں کا حل موجود ہے۔



حیاتی کے شکار تہوار جو ہمارے مذہب میں ہرگز شامل نہیں۔ یہ تہوار منا کر وقتی خوشی حاصل کرنے والوں کو یہ احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ جانی و مالی نقصان

کے علاوہ اپنی آخرت بھی خراب کر رہے ہیں۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمیں دین اسلام کی اصل روح چاہیے، جو کہ نیکی کرنے اور پچھلانے کا درس دیتا ہے۔ اس لیے مسلمان بہن بھائیوں سے گزارش ہے کہ ایسے تہوار منانے سے خود گریز کریں اور ارد گرد دوسرے لوگوں کو بھی سمجھائیں۔



حافظ محمد کاشف محمود، سولہ ایف، فی۔ بی۔ اے، لاہور

بسنت کا تہوار اصل میں ہندوؤں کا ہے، مسلمانوں نے ان کی نقلی کرتے ہوئے اپنا لیا۔ یہ ایک قاتلانہ دن ہے کیونکہ مکی معصوم بچے قتل ڈور سے پھول کی طرح کھنکھنے سے پہلے ہی مر جاتا

جاتے ہیں۔ غیر مکی تہوار منانے والوں سے درخواست ہے کہ وہ غور کریں، کیا غیر مسلم لوگ ہمارے تہوار مثلاً عید میلاد النبی ﷺ، شب قدر یا عیدیں مناتے ہیں؟ پھر ہم ان کے فضول تہواروں پر کیوں پیسا ضائع کرتے ہیں؟ ہمیں اچھے مسلمان اور شریف شہری ہونے کے ناطے ایسے دنوں کو بڑھاوا دینے کے بجائے شرم کرنا چاہیے اور جو رقم ان فضول تہواروں پر صرف ہوتی ہے، وہ اپنا کل ستوار نے پر خرچ کیجیے۔



بیت
حالا



بھارت کی سب سے بڑی ریاست میں مسلمان بادشاہ گزرن گئے

مسلمانوں کی مخالف انتہا پسند ہندو جماعتیں
بھی اُن سے ہاتھ ملانے پر مجبور ہو گئیں

www.paksociety.com

رضوان علی

جگہ رام مندر تعمیر کرنے والی بھارتی سیاسی جماعت کسی
طور مسلمانوں کے لیے مفید ثابت ہو سکتی ہے؟ لیکن
اقتدار کی لہلا کے بھی رنگ ڈھنگ نرا لے ہیں۔ اُسے
پانے کی خاطر بعض سیاست دان گدھے کو بھی پاپ بنانے
پر تیار ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ بھارت کی سب سے بڑی
ریاست، ایل۔ پی۔ (انڈیا) میں بی۔ پی۔ کی کوئی

اکتوبر ۲۰۱۱ء کو لکھنؤ

میں بی۔ پی۔

(بھارتی جٹ پارٹی)

کا ایک انوکھا جلسہ

منعقد ہوا۔ اس جلسے میں ۹۹ فیصد حاضرین مسلمان تھے۔

یہ انجمن کی بات تھی کیونکہ باری مسجد شہید کر کے اس کی

۸/ اکتوبر

یہ انجمن کی بات تھی کیونکہ باری مسجد شہید کر کے اس کی

معاملاً درپیش ہے۔
یو۔ پی کی آبادی تقریباً ۲۰ کروڑ ہے۔ یعنی یہ بحیثیت مملکت دنیا کا پانچواں بڑا ملک ہے۔ اس میں ۱۸ سے ۲۰ فیصد گویا ۳ کروڑ ۶۰ لاکھ سے ۴ کروڑ مسلمان بستے ہیں۔ یہ آبادی انھیں کئی اہم مسلم ممالک مثلاً عراق، مراکش یا تیونس سے بھی بڑی اکائی بنا دیتی ہے۔

یو۔ پی ریاستی اسمبلی کی ۴۰۳ نشستیں ہیں۔ ان میں سے "۱۳۰" نشستوں کے انتخابات میں مسلمانوں کے ووٹ کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب اپریل، مئی میں ریاستی انتخابات کا اعلان ہوا تو تمام قومی و مقامی سیاسی پارٹیاں مسلمان راہنماؤں و عوام سے دوستی کی پیشکشیں پڑھانے لگیں۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کے آگے پیچھے پھرنے لگیں۔

واضح رہے، ۱۹۷۷ء سے ۱۹۹۲ء تک مسلمان کانگریس کو ووٹ دیتے رہے لیکن اسی سال باری مسجد کی شہادت نے مسلمانوں کو کانگریس سے بدظن کر دیا۔ انھوں نے پھر دولت راہنما، ملائم سنگھ یادو کی سماج وادی پارٹی کو ووٹ دیا۔ لیکن جب ملائم سنگھ بی۔ ہے۔ پی کی کو ووٹیں جا بیٹھا تو مسلمان اس سے بھی ڈور ہو گئے۔ انھوں نے پھر ایک اور دولت راہنما، مایادونی کی پارٹی کو ووٹ دیا جو عرصہ دراز سے برسرِ اقتدار چلی آ رہی ہے۔ مایادونی نے مسلمانوں کے کام کیے، لیکن اتنے نہیں جن کی انھیں توقع تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان اب مایادونی سے بھی خوش نہیں۔

اس لیے اب کانگریس و بی۔ جے۔ پی، سماج وادی پارٹی، مایادونی کی بی۔ ایس۔ پی (بہوجن سماج پارٹی) پھر پوربھی کر رہی ہیں کہ کسی طرح زیادہ سے زیادہ مسلم ووٹ اپنی طرف منتقل ہو سکیں۔ دوسری طرف مسلمانوں کی بھی بہت سی سیاسی جماعتیں نمودار ہوئی ہیں، تاہم وہ کسی نہ کسی قومی یا مقامی بڑی جماعت ہی سے وابستہ ہیں۔

کانگریس کا اقدام
یو۔ پی کے مسلمانوں کا دل جیتنے کے لیے موجودہ



دنیائی کی سست فالتو کی

جس کو وصلہ جب نہ بنے اسے
کئی فت اور لوگوں میں مت از کر دیا

رہ فیصل



”اروٹی“۔ جیوتی نے بھی اپنے نام کی لاج رکھی اور زندگی کو
نیا ملبوم بنانے کا سب بنی۔

جیوتی دراصل ماں کے پیٹ ہی میں ایک جینیاتی
مرض، اچونڈرو پلاسیا (Achondroplasia) میں مبتلا
ہو گئی تھی۔ یہ ٹھکنے پین کی ایسی قسم ہے جس میں کرکری پدی
کی نشوونما میں نقص کے باعث انسان بڑھ نہیں پاتا۔ جب
وہ ۳ سال کی ہوئی، تب والدین کو اس مرض کا پتا چلا
کیونکہ جیوتی اتنی مڑکی ہو جانے کے باوجود پتی ”کاکلی“
نظر آتی تھی۔ چنانچہ وہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔
تب رجننا اور کشن پر انکشاف ہوا کہ ان کی بیاری پٹی
معمول کے بچوں سے الگ ہے۔

شروع میں تو قدرتا وہ قہم و اندوہ کا شکار رہے لیکن
جب انھوں نے دیکھا کہ سوائے پست قامتی کے، جیوتی
میں کوئی خامی نہیں، تو انھوں نے مقدر کا لکھا قبول کر لیا۔
ادھر جیوتی نے جوں جوں شعور سنبھالا، اس نے اپنے
ٹھکنے پین کے باعث احساس کمتری کا شکار ہونے سے انکار
کر دیا۔ اس کے ہمراہ جیوتی نے اپنی بظاہر خامی کو خوشی

یہ ۱۹۹۳ء کے وسط کی بات ہے، بھارتی
شہر ناگ پور کی ہاسی، رجننا اسی نے
اپنے حکم کا اسکین کرایا۔ وہ ۶ ماہ کی
حاملہ تھی اور اسے یقین تھا کہ اب بچہ
اسکین میں نظر آ جائے گا۔ لیکن ڈاکٹر نے اسکین کیا تو کچھ
نظر نہ آیا۔ ڈاکٹر نے اسے بعد میں اسے کو کہا۔ چنانچہ افسردہ
رجننا حرا ابیں چلی گئی۔
اگلا اسکین ۳ ماہ ہوا جب حمل کے ۹ مہینے پورے ہو
چکے تھے۔ حیرت انگیز طور پر تب بھی چھوٹا سا دھبائی ظاہر
ہوا۔ ڈاکٹر نے رجننا اور اس کے شوہر کشن کو بتایا کہ بچے کی
نشوونما صحیح نہیں ہوئی، اگر وہ زندہ پیدا بھی ہوا، تو وہ پندرہ
منٹ بعد موت اس کا مقدر بن جائے گی۔ یہ سن کر
میاں بیوی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

مگر ڈاکٹروں کے بھی اندازے غلط ثابت ہوئے۔ گو
رجننا کی بیٹی صرف ۳ پاؤنڈ کی تھی، مگر وہ زندہ رہی۔ یہ
رب تعالیٰ کا بڑا معجزہ تھا۔ اسی لیے ماں باپ نے بیٹی کا نام
جیوتی رکھا، اسی شکریت لفظ کے معنی ہیں ”زندگی“ یا

طبی معاینہ کیا۔ ۳ بار پینائٹس کے ذریعے حیاتی کا قد ۱۲۳/۱۰۰ شمار ہے۔ رائج اور وزن ساڑھے پانچ کلو گرام تھا۔ حیاتی سے قبل ۲۲ سالہ امریکی، برصغیر جارجیا دنیا کی سب سے پست قامت لڑکی تھی لیکن حیاتی اس سے پورے ۷/۱۰ سینٹی میٹر چھوٹی تھی۔ یوں وہ باضابطہ طور پر دنیا کی سب سے چھوٹی لڑکی یا صنف نساں سے تعلق رکھنے والی رکن بن گئی۔ واضح رہے، حیاتی ان بہنوں میں کھانا کھاتی اور پانی پیتی ہے جو عموماً گڑبگڑ کے لیے بازار سے ملتے ہیں۔

حیاتی انسانی تاریخ میں سب سے پست قامت لڑکی نہیں۔ یہ اعزاز ہالینڈ کی پالین مشررز کو حاصل ہے جو ۱۸۷۹ء تا ۱۸۹۵ء زندہ رہی۔ وہ صرف ۲۳ رائج قد رکھتی تھی۔ چونکہ ٹھنڈے انسانوں کی بلڈیاں بھر بھری ہوتی ہیں لہذا وہ کم ہی جیتے ہیں۔ حیاتی بھی مسلسل دوا نہیں کھاتی ہے تاکہ تندرست رہے۔ ایجوکڈ ریاضیاسیا پیدا ہونے والے ۲۵ ہزار بچوں میں سے صرف ایک کو نشانہ بناتا ہے۔

حیاتی حقیقتاً اپنے پست قامت ہونے پر رب تعالیٰ کی شکر گزار ہے کیونکہ بقول اس کے اسی وجہ سے اسے دنیا بھر میں نام و مقام ملا۔ پھر گینز ریکارڈ ہولڈر کی حیثیت سے اسے یورپ اور جاپان کی سیر کرنے کا بھی موقع ملے گا۔ حیاتی کو اس امر پر بھی مسرت ہے کہ موصوفہ نے عالمی نقشے میں ناگ پور کو نمایاں کر دیا۔

حیاتی کی خود اعتمادی اس بات سے بھی عیاں ہے کہ وہ میٹرک پاس کر چکی ہے۔ اب وہ یونیورسٹی سے تاریخ یا معاشیات کے مضمون پر ڈگری لینا چاہتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ عظیم یا علم الہی دولت ہے جو ایک محتاج و غریب کو بھی نہال کر سکتی ہے۔

حیاتی بحیثیت انسان ہمارے سامنے ایک بڑا سبق بھی لاتی ہے۔ وہ یہ کہ کامیابی اور ناکامی کے پیمانے میں ایک انسان کا قد کوئی حیثیت و اہمیت نہیں رکھتا۔ کامیاب انسان وہی ہے جو تمام تر مشکلات کے باوجود اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے۔ اس لحاظ سے حیاتی کو یقیناً ایک فتح مند لڑکی تصور کیا جائے گا۔

ہوا یہ کہ پست قامتی کی وجہ سے حیاتی اپنے محلے میں مشہور ہو گئی۔ جب وہ ۱۰ سال کی تھی، تو اس کا قد صرف ایک فٹ تھا اور وہ نوزائیدہ بچی نظر آتی لیکن وہ بالغ بچیوں کی طرح باتیں کرتی، تو سبھی اسے دلچسپی سے دیکھتے۔ مرکز ونگاہ بن کر حیاتی کو خوشی ہوتی۔ یوں مثبت طرز فکر نے حیاتی پر غم و مایوسی کو طاری نہ ہونے دیا اور وہ عام بچوں کی طرح زندگی گزارنے لگی۔

البتہ جب وہ پمپلی بار اسکول گئی، تو اسے دیگر بچیوں میں چھوٹے کچھ خوف محسوس ہوا۔ ظاہر ہے، بڑی بڑی اینٹی لڑکیوں نے شروع میں اس کا مذاق اڑایا۔ شاید کسی نے ڈراما و حکمایا بھی ہوگا لیکن جب جماعت کی لڑکیاں اس سے ٹھل مل گئیں، تو انھیں یہ احساس ہوا کہ یہ بڑی سادہ مزاج اور نیک طبیعت لڑکی ہے۔ یوں حیاتی کی مقبولیت نے جماعت میں بھی قدم بٹھا لیے۔

جماعت میں حیاتی نئی مٹی میز کرسی پر بیٹھتی ہے۔ گھر میں بھی اس کا کتا سا بستر ہے۔ کپڑے بھی خصوصی ڈیزائن کے تیار ہوتے ہیں۔ اس کی ۲ کمرنیں اور ایک بھائی ہے۔ چاروں مل جل کر رہتے ہیں۔ درحقیقت والدین اور بھائی بہنوں کی مدد کے ذریعے ہی حیاتی میں خود اعتمادی آئی اور اس نے اپنی معذوری کو بوجھ نہیں سمجھا۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اداکارہ جینا حیاتی کی سب سے بڑی ترنما ہے۔ انھی اسے کانڈا زبان کی ایک فلم میں کردار بھی مل گیا ہے لیکن وہ پانی وود چارٹر "خان بادشاہوں" کے ساتھ کام کرنا چاہتی ہے۔ شاد نوح اور سلمان خان اس کے پسندیدہ اداکار ہیں۔

مستقبل میں ممکن ہے کہ حیاتی کی خواہش پوری ہو جائے کیونکہ اب وہ دنیا کی سب سے چھٹی لڑکی ہونے کے باعث بین الاقوامی شہرت رکھتی ہے۔ پچھلے سال ماہ دسمبر میں مختلف شعبہ ہائے زندگی کے ریکارڈ جمع کرنے والے مشہور برطانوی ادارے، گینز ورلڈ ریکارڈز کا ایک نمائندہ مع ذرا ناگ پور پہنچا۔ انھوں نے پھر حیاتی کا قد ناپا اور



ادب اُردو

انسانی فطرت کی
بھول بھلیوں کا فسانہ

جیونی کا قاتل

سید قاسم حسین

ایک شخص کا پڑکار قصہ اس کی کامیابی
یہ تھی کہ کسی کو لٹھ بھر کے لیے بھی اس پر شک
نہ کرنا تھا ہاں اس کی زندگی کی کنکھائی
نے اس کی زندگی ضرور ادھیر بنانا ہی تھی

مینجر

صاحب اب تک نہیں آئے تھے۔ ان کا انتظار کرتے پورا ایک

گھنٹہ ہو گیا تھا۔ میری جیب میں ان کے نام میرے ایک دوست کا لکھا سفارش رقعہ پڑا ہوا تھا۔ اس میں پُر زور الفاظ میں لکھا تھا کہ حامل رقعہ کو جس طرح بھی ہو سکے، دفتر میں ملازم رکھ لیجیے۔ حصول ملازمت کی کوشش مجھے کراچی پہنچ لائی تھی۔ بکری جہازوں کی مرمت کرنے والی اس کمپنی میں میرے لیے یقیناً کشمکش اٹھ سکتی تھی۔ دفتر بند ہو چکا تھا۔ پھر بھی چپراسی اخلاقی مینیجر صاحب کی واپسی تک کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اس خیال سے کہ مینیجر صاحب کے دوست کا دوست ہوں اور ان سے ملنے لاہور سے آیا ہوں، کوا کولا پلا دیا۔ یوں بھی باہر کی چٹپلائی دھوپ، سمندر کی گرم گرم لہ اور طویل سفر کی تھکن کمرے میں داخل ہوتے ہی ختم ہو گئی۔

اس چھوٹے سے کمرے کو بجلی کی طاقت سے برف کی طرح جگ بنالیا گیا تھا۔ لمبی چوڑی آبنوی میز پر آٹھ اونچے مونا شیشے بچھا تھا۔ ٹیلیفون کے ساتھ ایک خوبصورت چھتری والا ٹیبل لپ بجل رہا تھا جس کی بجلی بجلی سبز روشنی شیشے کے عجیب و غریب قلم دان، لال نیلی پنسلوں اور گھومنے والی ٹی کری پر پڑ رہی تھی۔ کرسی کے دائیں طرف دیوار کے کونے میں ایک چھوٹی میز پر پھولوں کا گلدستہ رکھا ہوا تھا۔ کمرے کے تیس ماحول میں پھولوں کی بھیجی بھیجی خوشبو پڑی ہوئی تھی۔

قلم دان کی طرف سے ایک ڈیوٹی ریجی ہوئی میری طرف آ رہی تھی۔ آئے آئے محترمہ تحریف لائیے، آپ کا ہی انتظار تھا۔ آپ وقت گزارنے کے لیے بہترین سامگیاں ہیں۔ میں غیبتی سے کھیلنے میں مصروف ہو گیا۔ پہلے میں اسے بھاگ جانے کی مہلت دیتا۔ جب وہ مین میز کے کونے میں پہنچ کر غائب ہونے لگتی، میں پھر راستہ روک کر اسے انہی کے ساتھ ساتھ بیچ میدان میں لے آتا اور اسے چھوٹے چھوٹے پتھر کھانے لگتا۔ کوئی ایک فٹ کے

دائرے میں وہ دیر تک میری انگلی کے اشارے پر ناجی رہی۔ پھر جانے مجھے کیوں خیال آیا کہ اسے ایک انچ کے اندر اندر پتھر کھائے جائیں تو کیسا رہے گا؟ دائرہ محدود ہوتے ایک انچ میں سمٹ گیا۔ کسی مجبور کو اور زیادہ مجبور کرنے میں کتنی لذت ہے! انیسویں کو مجبور کرنے میں فرقان کو بھی ایسی ہی لذت ملی ہوگی۔

آٹھ برس پہلے کی بات ہے، رشید نے مجھے اپنے کاؤں بلایا۔ ہم دونوں بانگ میں مالی کی کوشنری کے باہر بیٹھے مالٹے کھا رہے تھے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ درختوں کے سائے ان کے آس پاس جم کر رہ گئے تھے۔ ہرے ہرے پتوں میں منہرے مالٹے چمک رہے تھے۔ بانگ کی شمالی کھائی کی طرف سے ایک شخص آہستہ آہستہ ہماری طرف آیا۔ اس نے اوور کوٹ پہنا ہوا تھا۔ منہ میں سگریٹ تھا، بغل میں کتاب تھی۔ اس کے سر پر استادہ سرس کے اونچے بیڑی کی آخری شاخ پر ایک کالی چڑیا خاموش بیٹھی تھی۔ کالی چڑیا کے پیچھے بہت دور گہرائی میں نیلے آسمان کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے کسی چیز کو بھی دوام حاصل نہیں۔ آسمان کا یہ چھوٹا سا نیلا ٹکڑا، خاموش کالی چڑیا، اداس اداس چلتا ہوا آدمی اور یہ بانگ سب ایک دن یوں ہی خراماں خراماں لڑچک جائیں گے۔

انگلے ہی لمحے میں نے محسوس کیا کہ بے ثباتی کے اس ہولناک احساس کا سبب نے آدمی کی عجیب و غریب چال ہے۔ قدموں میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ استقامت مجھے تھی اور کوئی تیسری چیز بھی جسے میں اس وقت سمجھ نہ سکا۔ رشید نے بتایا "یہ شخص میرا بھائی دوست ہے، بہت گریٹ آدمی ہے، نام بھی فرقان عظیم ہے۔ اچھے کھاتے پیتے گھرانے کا فرد ہے۔ چار سال سے میرے ہی پاس رہتا ہے۔ غالباً میرے بغیر زندہ بھی نہیں رہ سکتا۔ تھوڑی دیر کے لیے بھی ادھر ادھر ہو جاؤں تو پاگل ہو جاتا ہے۔ فلسفے اور ادب کا شیدائی ہے۔ میں جب بھی شہر جاؤں، اس کے لیے کتابیں خرید کر لاتا ہوں۔ اسے میرے اور کتابوں کے سوا دنیا کے کسی اور کام سے دلچسپی نہیں۔"

مالی رنگ کی ہو گئی تھیں۔ بس اسی وجہ سے اس کا چھپا ہوا ماننا کھانے سے طبیعت میں میل سا آجاتا۔ اس کی روح پر چھایا ہوا میل میری روح میں داخل ہوتا محسوس ہوتا۔

شام ہو گئی، مگر رشید اپنے کاموں میں مصروف رہا، ہمارے پاس نہ آیا۔ فرقان نے مجھے اس کا آکڑوں والا کلیت دکھایا۔ تمباکو کی بخیری دکھائی۔ کوفو میں گئے بیٹھے ہوئے دکھائے۔ گوبھی، گاجر اور مولیٰ کی الگ الگ کیاریاں دکھائیں۔ اس سفر کے دوران میں وہ خاموش نہیں رہا۔ اس نے ادب، فلسفہ، شاعری، سیاست، ہر موضوع پر مجھ سے باتیں کیں۔ ہر موضوع پر اس کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ اس کی رائے بڑی جتنی تلی اور حقیقت پسندانہ ہوتی تھی۔ سب کچھ ٹھیک تھا مگر سچے میں استقامت اور لڑکھاہٹ کے ساتھ ساتھ وہ تیسری چیز کچھ تھی جو اب پھر میری سمجھ میں نہ آ رہی تھی۔ ایسا واضح شخص قائل نہیں ہوسکتا۔ مگر اس کی آنکھوں کی زندہ چمک اور انگلیوں میں جتنے ہوئے دھنیں میں آخر تعلق کیا ہے؟ جس کی آنکھوں میں چہنے کی ایسی انگ ہے، وہ اپنے آپ کو دھنیں کے دم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا۔

باتوں ہی باتوں میں وہ میرے اس قدر قریب آگیا تھا کہ اس کی چال اور لہجے میں چھپی تیسری چیز کے متعلق کچھ جاننے کا خیال خود بخود ختم ہو گیا۔ دوستی کے لوسکیلے احساس نے گھو پڑی میں اگنے والے شاخ در شاخ خیالات کی جڑیں کاٹ دیں۔ میرا دوست اصل میں رشید تھا اور میں اسی کے بلاوے پر یہاں آیا تھا لیکن وہ ہماری نئی دوستی کے ذور مضبوط کرنے کے لیے کئی چنگ کی طرح اوجڑا اور ڈول رہا تھا۔ ہم اسے دور ہی سے بھی اپنے مکان کی بالائی منزل میں جاتا دیکھتے، بھی مزارعوں کے پاس کھڑا دیکھتے۔ اس کا تعاقب کرتی فرقان کی خاموش نگاہیں رشید کے اس خیال کی توثیق کر رہی تھیں "غالباً یہ میرے بغیر زندہ بھی نہیں رہ سکتا۔"

جد یہ ہے کہ رشید رات کو کھانے کے وقت بھی ہمارے پاس نہیں آیا۔ بس ایک منٹ کے لیے کھیل لے کر آیا اور کہنے لگا "بھئی معاف کرنا تم اتنی دور سے آئے ہو اور میں خاطر مدارت نہیں کر رہا۔ دراصل مجھے سخت بخار

وہ جب بالکل قریب آگیا تو ہم احتراماً کھڑے ہو گئے۔ اس لیے بھی کہ وہ ہم دونوں سے عمر میں بھی بڑا تھا اور پھر اس کے پورے وجود پر چھائی متانت نے ہمیں مجبور سا کر دیا تھا۔ متانت سے بھی زیادہ خاص چیز اس کی آنکھوں میں گوندتی وہ بے قرار چمک تھی جو زندگی کو پوری شدہ سے ہر کرنے والوں کی آنکھوں میں خود بخود پیدا ہوجاتی ہے۔ چہرے اور ماتھے پر نکیریں، جھریاں، پتینا نہیں تھیں۔ روح کو پھل دینے کی چمک کے اعصابی آثار تھے۔ نفوس اچھے خاصے جسے خود بہ صورت اور نوک دار تھے۔ شیو بڑھی ہوئی، گلدی پر بال بڑھے ہوئے، قمیص کا غلیظ کارل ایک طرف سے اوور کوٹ میں چھپا ہوا اور دوسری طرف سے بڑے بے ہنگم طریقے سے باہر کو بڑھا ہوا۔ کالے کالے ناخن بڑھے ہوئے، ٹاک کے بال بڑھے ہوئے، شخصیت میں تراش خراش کی ضرورت تھی۔

تعارف کے لیے ہاتھ بڑھایا تو میں نے ہاتھ مانانے سے پیشتر یونہی ہنس کر کہا "رشید صاحب! آپ کے یہ دوست مجھے قائل معلوم ہوتے ہیں۔" یہ بات کہتے ہی مجھے خوشی محسوس ہوئی کہ اس کی چال میں جو چیز میری سمجھ میں نہ آ رہی تھی، اسے میں نے خود پر واضح کر لیا۔

رشید نے اپنے دوست کی طرف باعینی نظروں سے دیکھا جس کا مصافحے کے لیے بڑھا ہوا ہاتھ واپس اپنی جگہ چلا گیا اور اس کی چمک دار نظریں برابر مجھ پر جمی رہیں۔ رشید نے کہا "میں ابھی آتا ہوں، آپ دونوں باہیں کریں۔"

وہ چلا گیا تو میں اپنے والے موندھے پر ہانپ بیٹھا۔ وہ رشید والے موندھے پر بیٹھتا بیٹھتا چار پائی پر بیٹھ گیا۔ اس نے مجھ سے کوئی بات بھی نہ کی۔ بس مالے چھیل چھیل کر مجھے دینے لگا۔ مالے پر چھری کی نوک رشید کے مقابلے میں بڑی نفاست سے چلاتا، چار آر پار نکیریں ڈال کر چھری سے وہ چھلکے اتارتا، پھر چھری ہی سے مالے کا ایک ایک بال دھیرے دھیرے اتارتا، نظر کی باریکی مالے پر معمولی سا بال بھی فوراً ڈھونڈ لیتی۔ اس کے حرکت کرتے ہاتھوں کی دو اگلیاں سگروں کے دھوئیں میں جل جل کر

ہو گیا ہے۔ لو یہ کہیں لو، باقی جس چیز کی ضرورت ہو، اوپر سے منکوا لیتا۔“ سب دے کر وہ پھر اوپر چلا گیا۔

کھانا کھاتے ہی میں تو اتنا فلیل ہو گیا۔ آخری غنودگی میں دیکھا تھا کہ فرقان لب کی روشنی میں کتاب کھولے بیٹھا ہے مگر پڑھ نہیں رہا۔ تقریباً آدھی رات کے وقت کسی نے لحاف کا پلہ ہٹا کر مجھے جگایا۔ میں فوراً اٹھ کر دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا اور پورے ہوش و حواس سے اپنا سانس روک لیا۔ ٹھپ اندھیرے میں میری آنکھیں غور سے اس منہجر کو دھوڑتی پھر رہی تھیں جو ابھی مجھے قتل کرنے والا تھا۔

بیشک کے روشن دان سے اندر آنے والی چاند کی ہلکی ہلکی روشنی میں مجھے بس ایک سایہ نظر آیا جو دونوں ہاتھوں سے ہستر پر مجھے دھوڑ رہا تھا۔ ”بھئی کہاں چلے گئے آپ؟“ یہ لب و لہجہ قاتل کا نہیں ہو سکتا، میں نے اپنا اتارنا بتانا چاہا لیکن جیسے سانس نے کاٹ رکھا تھا، سانس روکے کھڑا رہا۔ وہ اپنی چار پائی کی طرف گیا تو میں نے چاہا کہ چپکے سے بھاگ جاؤں، لیکن وہ فوراً ہی واپس آیا۔

اس نے دیا سلائی جلائی اور بس کر بولا ”ارے آپ مجھ سے ڈر گئے۔“ میں ندامت اور خوف سے ملے جلے جذبات کے ساتھ اس کے ہاتھوں کی طرف دیکھتا رہا۔ جب اطمینان ہو گیا کہ ہاتھوں میں تو کچھ نہیں، دل میں کچھ ہو تو ہو، میں چار پائی سے نیچے اتر آیا۔

اس نے چپکے سے کہا ”چلو میرے ساتھ باہر چلو۔“ میں نے بھی چپکے سے جواب دیا ”تو بہت مشکل بات ہے۔ اس سردی میں آپ باہر کہاں لے جا رہے ہیں مجھے؟“ بولا ”پہلے تو سہمی کسی کی زندگی اور موت کا سوال ہے۔“ میں نے کہا ”جو بات کرنی ہے یہیں کر لیجیے۔“ بولا ”مجھے تنہائی چاہیے۔“

میں نے ذرا بلند آواز سے کہا ”تنہائی تو یہاں بھی ہے۔“ کہنے لگا ”آہستہ بولو، جلدی چلو، ابھی آجائیں گے۔“ میں کچھ مجبوراً کچھ اعلا فوجا سننے بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا اوور کوٹ پہنا، ریز کے چپل پہنے، سڑکوں کی ڈبیا اور ماچس اٹھائی۔ میں رشید کا کمر باندھ کر اس کے ساتھ ہولیا۔

بیشک کا دروازہ آہستہ سے بند کر کے اس نے کہا ”خود آہستہ چلو کوئی، جاگ نہ جائے۔“ اس بات سے مجھے پورا یقین ہو گیا کہ کوئی گہرا راز ہے جو میرے سینے میں اتارنا چاہتا ہے۔ اور وہ منہجر کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ بالکل یوں لگ رہا تھا جیسے مجھے قتل کی طرف لے جایا جا رہا ہے۔ فرقان نے گنگو کا آواز کیا ”دو پہر کو آپ نے میرے متعلق جو رائے دی تھی۔“

میں نے کہا ”ارے صاحب! وہ تو مذاق کی بات تھی۔“ فرقان بولا ”مگر میرے لیے بہت عجیب بات ہے۔“ میں نے کہا ”میں آپ سے حافیہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے محض مذاق کیا تھا۔“

فرقان ایک دم تلخ ہو گیا ”مذاق مذاق میں قتل بھی ہو جاتے ہیں، آپ نے میری کس بات سے یہ اندازہ لگایا؟ کیا مجھ میں کوئی قاتلوں والی بات آپ کو نظر آتی تھی؟“ اچانک جھوٹ نے مجھے پہنچنے کی ایک نئی راہ دکھائی ”جی ہاں! جب آپ نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو میں نے آپ کے ہاتھ کی کلیں دیکھ لی تھیں۔“

فرقان میرے قریب کھسک آیا اور اپنا ہاتھ آگے بڑھا کر بولا ”اب غور سے دیکھیے، یہ قاتل کا ہاتھ نہیں ہو سکتا۔ میں نے کبھی کسی کا قتل نہیں کیا، میں تو ایک چوٹی تک نہیں مار سکتا۔“ میں اس کے ہاتھ کی کلیں دیکھ کر بظاہر غور سے دیکھنے لگا۔

میں دست شناسی (پاسٹری) پر اعتقاد نہیں رکھتا، پھر بھی بعض لوگوں کا کٹر دھوکا دیتا رہا تھا۔ میں نے محض دکھانے کی خاطر اس کی کلیں دو گنوب ٹول ٹول کر دکھائی، اس نے میری دھوکے کے لیے یکے بعد دیگرے کئی دیا سلائیاں چلا کر مسلسل روشنی بہم پہنچائی۔ آخر میں نے فیصلہ سنایا ”جناب دو پہر کو مجھے دھوکا ہوا تھا۔ دراصل یہ کلیں جو انگوٹھے کی طرف مڑ گئی ہیں، اس نے آپ کو بچا لیا۔ اگر یہ دماغ کی کلیں سے مل جاتی تو یقیناً آپ سے قتل کا ارتکاب ہو جاتا مگر اب آپ بال بال بچ گئے۔“

فرقان بولا ”آپ مجھے بتا رہے ہیں۔ آپ کا دو پہر کا مشاہدہ ٹھیک تھا، میں نے تو ایک قتل کر رکھا ہے۔“ میں نے اپنے لہجے میں وثوق پیدا کرتے ہوئے کہا

”میں نے ایسے پکڑ رکھا ہے شروع کیے، اسے خوب ہی اپنے اشاروں پر بچایا اور اس رات وہ اسے چکڑ دیتا یہاں اس کنوئیں کی مینڈ تک لے آیا۔ یہ نہ سمجھے کہ وہ اسے مسلما چاہتا تھا، ہرگز نہیں، اس خیال سے وہ تو بے کر کے گھر سے لٹکا تھا۔“

”آؤ قیامت کی رات تھی وہ۔ یہی چاند ان کے سروں پر چمک رہا تھا اور وہ کہہ رہی تھی، میں تجھ سے اتنی محبت کرتی ہوں کہ اگر تو محض مذاقاً بھی مجھے کنوئیں میں چھلانگ مارنے کے لیے کہے تو ابھی کوہِ پروں کی۔ اس شخص نے آڑمانے کے لیے نہیں بس وہی ہی ازراہ مذاق اس سے کہا، اچھا ذرا کوہ کو تو دکھا، تجھے کتنی محبت ہے۔ ابھی یہ فقرہ لڑکی نے پورا سنا بھی نہ تھا کہ جہم سے پانی میں گرنے کی آواز آئی۔“

”اس شخص کو یہ سوچنے میں کئی منٹ لگے کہ یہ مذاق ہے یا سچ، کچھ ہو گیا۔ ایسی جذباتی کہانیاں اس نے پڑھی تو بہت تھیں مگر کبھی آج تھی۔ ان دنوں کنوئیں میں یہ باتیں نہ تھیں۔ پانی سزا ہوا تھا اور اس شخص کے پاس اپنے دوست اور اس کے مزارعوں کو دیکھنے کا کوئی جواز نہ تھا۔ اگر کوئی جواز تھا تو یہ کہ وہ خود بھی کنوئیں میں گر پڑا۔ پانی کی دلدل میں دیر تک بچھ پڑا جس چلانے کے بعد آخر کار اسے وہ لڑکی مل گئی مگر وہ جاچکی تھی۔ اس شخص نے بھی گہرائیوں میں اترنے کی پوری کوشش کی لیکن لوگوں نے اسے بچالیا۔ ہوش میں آنے کے بعد موصوف نے اپنے دوست کو بتایا کہ جب رات کو اٹھا تو اس کی بہن کسی کے ساتھ بھاگ رہی تھی۔ اس نے ان کا تعاقب کیا۔ وہ شخص تو فرار ہو گیا اور نسیہ نے کنوئیں میں چھلانگ لگا دی۔ اسے بچانے کے لیے دو بھی کو پڑا۔“

میں نے کہا ”فرقان صاحب! سوال یہ ہے۔“
فرقان جھنجھلا کر بولا ”میری بات ابھی ختم نہیں ہوئی۔ اس شخص کو نسیہ کے مرنے کا کوئی افسوس نہ تھا۔ اس نے موت کو بھی اہمیت نہیں دی۔ زندگی میں جو کچھ ہو رہا ہے، اس کے نزدیک فقط وہ اہم ہے۔ اب اس میں یہ احساس شدت پکڑ گیا کہ اس نے دوست کو جھوٹا دیا ہے۔ اس سے جھوٹ بولا ہے۔ اگر وہ اس سے صاف صاف کہہ دیتا، ہاں دوست تیری، بہن میری ہی وجہ سے چلی گئی ہے تو اس کے

”میں جتنا! آپ میں قتل کرنے کی صلاحیت ہی نہیں۔ ہاتھ کی کوئی گھیر جرمانہ ذہنیت کا پتا نہیں دیتی۔ پھر آپ کا ماتھا بھی میں نے پڑھا ہے۔ قیافہ شناسی کا کوئی اصول آپ کے مجرم ہونے کا سراغ نہیں دیتا۔ پھر آپ کی آنکھوں میں جو معصوم سی چمک ہے، وہ مجرم کی آنکھوں میں ہونی نہیں سکتی۔ کسی ریاضت کرنے والے ہی کی آنکھوں میں یہ خاص چمک ہوتی ہے۔“

فرقان بولا ”ریاضت اپنے گناہ چھپانے کے لیے بھی تو ہو سکتی ہے۔ آپ نے وہ پیر کو مجھے قاتل کہہ کر ایک عجیب عذاب میں مبتلا کر دیا۔ آج تک مجھے اپنے قاتل ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں پورا یقین نہیں تھا مگر آج آپ نے مجھے یقین دلادیا۔ اب یہ یقین ہی میرے لیے عذاب بن گیا ہے۔“

میں نے کہا ”آخر قصہ کیا ہے، کچھ تو پتا چلے، مجھے اپنا دوست سمجھو اور جو کچھ آپ کے دل میں ہے، سب اگل ڈالو۔“
فرقان بولا ”قصہ بہت معمولی ہے۔ ایک شخص تھا، بہت ہی بھولا بھالا، سیدھا سادھا، ذہین اور شوخ۔ اس نے ایک لڑکی سے محبت کی۔ لڑکی کچھ عرصے کے بعد اس سے چین گئی۔ کوئی اور اسے اپنے ساتھ اٹھانے شہر لے گیا۔ وہ شخص اس ناکامی کو برداشت تو کر گیا مگر کچھ اس انداز سے کہ ماں باپ سے چھڑ کر الگ رہنے لگا۔ سارے دوست احباب سے کنارہ کر لیا۔ چپکے چپکے شراب اس سے چمت گئی اور شراب کے بعد عورت اور برعورت کو، جو بھی اس کے سامنے آئی، چوہنی کی طرح مسل کر لڑ جاتا۔ بے شمار چوہنیاں اس نے روند ڈالیں۔ پھر جب اس نے سوچا کہ ایک چوہنی بھی تو راہ میں ایسی نہیں آتی جو اس سے بچ کر نکل جائے یا سے کاٹ ہی لے، تو اس نے چاہا کہ شہر چھوڑ کر کہیں دور نکل جائے۔ وہ شخص ریل میں بیٹھا جا رہا تھا کہ راستے میں ایک شخص

اسے ملا۔ وہ اس کا دوست بن گیا اور چند روز کے لیے اسے اپنے گاؤں لے گیا۔ وہاں اس نے ایک بہت ہی خوبصورت، بخوری بخوری سی چوہنی دیکھی، جس نے پہلے ہی دن اسے اپنی نشی آنکھوں سے زور سے کاٹ لیا۔ اب اس

آئی۔ اس کے غائب ہونے ہی دروازہ خود بخود بند ہو گیا۔ بارڈر بڑی دیوار اور کواڑ آپس میں یوں پیوست ہو گئے کہ بغور دیکھنے سے دروازے کی کلیں نظر آئیں۔

اب میں اسی حیرت زدہ کمرے میں اکیلا رہ گیا۔ اوہو، میری بیوقوفی کہاں چلی گئی؟ میں نے پوری میز پر تلاش کیا۔ کالغذوں کی کوکری کو اٹھا کر دیکھا، نیلیفون اور ٹیبل لیپ تک اپنی اپنی جگہ سے مل گئے۔ آخر وہ مجھے پھل کی دم سے چینی مل گئی۔ میں پھر اسے انجلی کے ساتھ ساتھ بیچ میدان میں لے آیا۔ بہت خوب متحہ، آپ ہمیں تنہا چھوڑ چکی تھیں۔ اب کے دروازہ دکھا تو بچی کے ساتھ ساتھ چھ سال کا لڑکا بھی نمودار ہوا۔ دونوں کے چہروں میں غضب کی مشابہت تھی۔ گورے گورے نیلیوی چہرے، تکیے نقوش اور لوک دار بڑی بڑی آنکھیں اور ان کی زندہ اور محسوس سی چمک۔

لڑکے نے پوچھا ”آپ تس سے ملنا چاہتے ہیں؟“ میں نے بڑے ادب سے کہا ”مینجر صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔“

لڑکے نے پھر پوچھا ”ہمارے ابو سے ملنا چاہتے ہیں؟ وہ تو امی کے ساتھ باہر دیے ہیں۔ شام کو آئیں دے۔“ لڑکی نے اپنا ہاتھ سا ہاتھ اٹھا کر کہا ”وہ ریے امارے ڈیڈی۔“

میں نے گھوم کر اس دروازے کی طرف دیکھا جہاں سے داخل ہوا تھا۔ میں نے کہا ”یہاں تو کوئی بھی نہیں۔“ لڑکا ہنس پڑا ”ارے تیے بدحو ہیں آپ، ہمارے ابو

نظر نہیں آتے۔ وہ ریے سائے۔“ میں نے پھر گھوم کر دیکھا۔ دروازے کے اوپر ایک

سنہرے فریم کی تصویر میں یہ دونوں بچے فرقان کی گود میں بیٹھے مسکرا رہے تھے۔ فرقان کی آنکھوں کی چمک میں کچھ اور بھی زندگی آگئی تھی۔ بال سنورے ہوئے تھے۔ چہرے پر صحت کے آثار نمایاں تھے۔ شخصیت میں بڑی تراش خراش تھی۔ پتا نہیں مجھے کیا ہوا، میں دیوانہ وار میز پر اپنی بیوقوفی دھونڈنے لگا۔ وہ میز کے آخری کونے پر پہنچ کر غائب ہو رہی تھی۔ میں نے اسے وہیں مسل دیا۔

ضمیر کو وہ دکھ نہ جھیلنے پڑے، جو وہ اب تک جھیلتا رہا ہے۔ اسے خوب معلوم تھا کہ اگر وہ گاؤں سے چلا گیا تو چند دن کے بعد ہی دوست کو یہ احساس ہو جائے گا کہ میری بہن کا قاتل وہی تھا اور اصل وہ بد قیامت تک بھی نہ سمجھ سکے گا۔

”اپنے جھوٹ کو چھپانے کے لیے باقاعدہ ریاضت کی ہے۔ ایک مہے کے لیے بھی اس نے اپنے دوست کو تنہا نہیں چھوڑا کہ کہیں تنہائی میں سچائی اس کے کانوں میں اپنا جادو نہ بھروسے۔ لیکن دوست تم نے سارا ظلم تو دیا۔ جس وقت تم نے کہا تھا، رشید صاحب! آپ کے یہ دوست مجھے قاتل معلوم ہوتے ہیں تو تمہیں کیا معلوم، رشید نے مجھے کن نظروں سے دیکھا تھا۔ میری ساری ریاضت اکارت چلی گئی۔ وہ اسی لمحے مجھے اپنی بہن کا قاتل سمجھنے لگا اور اسی لمحے سے وہ مجھ سے دور ہوتا چلا گیا۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے بھی مجھ سے جدا نہیں رہ سکتا تھا مگر وہ آج میرے پاس آیا ہی نہیں۔ تم نے یہ کیا کر ڈالا دوست، مجھے مذاہب میں ہٹکا کر دیا ہے۔ اب مشورہ دو مجھے کیا کرنا چاہیے۔ کیا یہاں سے بھاگ جاؤں یا اعتراف جرم کروں۔“

میں نے کہا ”بھاگنے سے یا اعتراف کر لینے سے کچھ بھی نہ ہوگا۔ اعتراف کر لینے سے اس کی بہن واپس نہیں آ جائے گی۔ اس پر خاموشی ہی کا پردہ پڑا رہنے دو، بھاگ جانے سے تمہاری زندگی کا مسئلہ حل نہیں ہو جاتا۔ تم بھاگ کر کہیں اور ڈراما پیدا کرو گے۔ تمہاری روح کا خلا فرار ہونے سے پُر ہوگا نہ اعتراف کر لینے سے۔ اصل علاج یہ ہے کہ تم ایک بیوقوفی اور اصل وہ۔۔۔ بس آخری بیوقوفی۔“

☆ ☆ ☆

میں نے لمبی چوڑی آبنوی میز کے شیشے پر اب تک بیوقوفی کو خدا جانے کتنے پتھر کھلا دیے تھے۔ میں نے دیکھا کہ میرے میز کے دوسرے سرے پر ایک چار پانچ برس کی بیماری کی لڑکی کھڑی ہے، میں ایک دم حیران رہ گیا کہ یہ کہاں سے آئی ہے؟ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی اور گھومنے والی کرسی کے عقب میں دیوار پر لگے سنہرے ہینڈل پر ہاتھ رکھا۔ دروازہ کھل گیا، چوں کی آواز نہ

ادب اُردو

وارث

اختر عباس

ایک بیٹی کا دلخراش ماجرا
اس کی ماں نے اُسے
اپنا وارث بنا ڈالا تھا

www.paksociety.com

www.paksociety.com

ماچس

کی تیلی ابھی جلی ہے۔ ایک شعلہ سا لپکا ہے اور کئی اگر بقیات سلگنے لگی ہیں۔

دھواں اوپر جا رہا ہے۔ خوشبو چاروں طرف دھیرے دھیرے سفر کر رہی ہے اور میں سوچ رہی ہوں ”بس یہی ہے انسانی زندگی کی کہانی، کچھ اس سے زیادہ ہوتو مجھے بھی بتاؤ“

دادی وہ سب کی تھیں پر میری دادوتھیں۔ جانے کیا بات ہے، وہ رخصت ہو میں تو گھر میں کبھی کے تاثرات مختلف تھے۔ خود مجھ کو یوں لگا جیسے میرے قدموں میں جھکا آسمان کا ایک پلند ہو گیا ہو۔ میری دسترس اور پہنچ سے دور نکل گیا ہو۔ دادو دوسرے لوگوں کی پہنچ سے تو پہلے ہی دور نکل گئی تھیں۔ کبھی بھی یہ ہوتا ہے کہ کچھ لوگ ان دروازوں جیسے ہوتے ہیں جو جانے کے باوجود بھی سب پہ نہ کھلتے ہیں، نہ اندر جانے کی راہ دیتے ہیں۔

چند سال قبل دادو جب ہمارے گھر آئیں تو یہ دروازہ بند ہو چکا تھا۔ چونکہ تازہ تازہ بند ہوا تھا۔ کواڑ ابھی زنگ آکود نہیں ہوئے تھے۔ اس لیے تھوڑی محنت اور مسلسل کوشش سے میں اس کو اس قدر کھولنے میں کامیاب ہوئی گئی کہ جس سے اندر بھاٹکا جا سکتا ہو۔ اندر ایک سنسانی اور ویرانی کا عالم تھا جہاں کوئی خوابش زندہ تھی نہ آرزو باقی تھی۔ حالانکہ سنا ہے خوابشیں تو زندگی ہیں۔ نہ ان کا کوئی اول ہوتا ہے نہ آخر۔ انہی سے زندگی لگتی ہے۔ یہ نہ ہوں تو زندگی بھی خالی ہو جاتی ہے۔

ابو، دادو کا ہاتھ پکڑے جب گھر لوٹے تھے تو ہم سب کو ایک جانب لے جا کر کہا تھا۔ ”دیکھو! دادو کی یادوں کا خزانہ چوری ہو گیا ہے۔ دل کے گودام میں اب سب بوریاں خالی پڑی ہیں۔ تم ان کو بھر سکو تو بہت خوش کن بات ہوگی۔ مگر ان خالی بوریوں کو مٹو لئے مت بیٹھ جانا۔“ چند ماہ بعد اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کھانے سے فارغ ہوئے تو دادو نے ابو سے کہا:

”بیٹا عبدالہا! میرا بڑا بی چاہنے لگا ہے کہ تیری یہ رانو، پھولوں کی طرح مینکے اور کسی بے فکری چیز یا کی طرح

چپکے۔ اس کے اندر بڑی ہی محنتی روح ہے۔ یہ چھوٹی اور ناتواں ہو کر بھی حکم چلاتا اور دلوں کو گرمانا جانتی ہے۔ نہ کوئی زور نہ زبردستی، لیکن اپنی خدمت اور محنت سے یہ عکرماری کرتی ہے۔ سننے دور میں تراشے ہوئے لب و رخسار اور شوق رنگت سے زیادہ اسی سانچے میں ڈھکی لڑکیاں راج کر رہی گی۔“

دادو اتنی ہی اچھی تھیں جیسی ان کی بات۔ پھر وہ راج کیوں نہ کر سکیں؟

ممکن ہے اس لیے کہ بھارت کے شہر گرداسپور سے پاکستان آتے ہوئے ان کے میاں، اپنی بیوی اور بچوں کو شکلوں اور ہندوؤں کے گھڑسوار جتوں سے بچاتے ہوئے اپنی جان ہی بار بیٹھے تھے۔ جس کے سر کا سا نہیں نہ رہے، وہ بھلا کیا راج کرتی، کس کے سر پر کرتی؟

ہاں ایک بیٹے کا آسرا تھا۔ عبدالہا، بھتی اپنے ابو کی بات کر رہی ہوں۔ دادو کی عجیب عادت تھی کہ وہ نام پورا ہلاقی تھیں حتیٰ کہ گھر کے کام کاج والے حسینے کو بھی غلام حسین کہہ کر بلاتی تھیں اور نام مقبول آواز کون کریں لپکتا تھا جیسے پٹرول کو کچھ کر شعلہ لپکتا ہے۔ نوکر کچھدار ہو تو گھر والوں سے تنخواہ کے علاوہ عزت بھی پاتا ہے۔ حسینا..... محاف کیجئے! غلام حسین بھی اسی قبیلے سے تھا۔ ایک روز کیا ہوا کہ ہم لوگ باہر لان میں بیٹھے تھے۔ دادو کی آواز آئی تو ابو تیزی سے لپکے۔ امی نے روکا بھی کہ حسینے کو بلادری ہیں۔ ابو کے بغیر بولے:

”بابا! وہ بیٹے میری ماں ہیں۔ جب میں گھر پہ ہوں پھر ان کی بات سنتا میرا حق ہے۔ فرض والی بات تو الگ ہے۔ غلام حسین تو میرے کہنے پہ ان کی خدمت کرتا ہے نا۔“ دادو ہمارے گھر آ کر بڑی شانت ہو گئی تھیں۔ بلکی پھٹکی، مطمئن۔ شاید گھر کہتے ہی اس کو ہیں جہاں آدمی مطلوب ہو..... محبوب ہو..... جن کے در و دربار کے درمیان اس کا وزن ہی نہ ہو، وہ اس کا گھر کی گھر ہو سکتا ہے۔

یہ گھر ہی تو ہوتا ہے، جہاں ساتھ ساتھ جیا جاتا ہے۔ ایک ساتھ دھوپ اور ایک ساتھ بارش سہی جاتی ہے۔ جہاں

جیل جانا

گزشتہ دنوں میرے ایک دوست کو لٹلی سے پولیس پکڑ کر لے گئی۔ یاد رہے کہ یہ لٹلی میرے دوست نہیں پولیس کی تھی۔ لہذا اسے فوراً یعنی ۳۰ دن بعد چھوڑ دیا گیا۔ مجھے اس خوش قسمت پر رشک آ رہا تھا جسے باوجود جیل میں رہنے کی سعادت نصیب ہوئی ورنہ یہاں جانے کے لیے بڑے بڑے لوگوں کو بھی کمٹوں تقریریں، توڑ پھوڑ، مار کٹائی اور نہ جانے کیا کیا ٹاپنڈیہ فعل کرنا پڑتے ہیں، پھر کہیں جا کر انھیں ٹیل جانے کا موقع ملتا ہے۔ لیکن مجھے حیرانی ہوئی کہ لوگ اسے رہا ہونے کی مبارکباد دے رہے تھے۔ حالانکہ مبارکباد تو اسے اس بات کی دینی چاہیے تھی کہ اب وہ عام آدمی نہ رہا تھا۔ کیونکہ عام آدمی جیل جاتے ہی اتنا اہم ہو جاتا ہے کہ اس کی ملاقات کے لیے کئی کئی سفارشی رشتے لانا پڑتے ہیں۔ کمٹوں انتھار کرنا پڑتا ہے تب کہیں جا کر وہ جبر وکوں سے جھٹک دکھاتا ہے۔

جیسے کسی نے کبھی آنکھ بھر کر نہیں دیکھا ہوتا، اسے دیکھتے ہی آنکھیں بھر جاتی ہیں۔ جیل جانا دراصل شرافت کی نشانی ہے۔ شریف وہ ہے جو جرم نہ کرے اور جرم ہمیشہ وہ کرتے ہیں جو ٹیل سے باہر ہوتے ہیں۔ بلکہ جیل تو دنیا کا وہ خطہ ہے جہاں سب سے کم چوریوں، ڈاکے اور قتل ہوتے ہیں اور پھر ٹیل بنانے کا اس سے بڑا فائدہ اور کیا ہوگا کہ جو بھی ملنے آئے اس سے یہ ذرا نہیں ہوتا کہ ابھی قرض مانگ لے گا۔ مجھے جب سے یہ پتا چلا ہے کہ چاند پر پانی نہیں ملتا۔ لمبی لمبی راتیں، طویل دن، سخت موسم اور سانس لینے کے لیے آکسیجن نہیں، تب سے مجھے جیل جانا تو چاند پر جانا ہی لگتا ہے۔

(ڈاکٹر یس بی، "شیطان" سے اقتباس)

ہو جاتا، کوئی زخموں کے باعث چلنے سے معذور ہو جاتا تو قافلے والے اپنی زندگیوں کے اگلے میں، اسے وہیں ویرانے کی نذر کرتے اور آگے بڑھ جاتے۔ انہی راستوں پہ انھیں بے شمار آدمہ کھائی لاشیں ملیں۔ لے قافلوں کے ہجرت اڑنیشان اور سامان ملے۔ ان کو دیکھ کر زندگی اور بیماری لگنے لگتی۔ آزادی اور حفاظت سے نئے ملک کی سرزمین پہ پہنچنا خواب جیسا لگنے لگتا۔

ایک شام جب دل تو آگے بڑھنے پہ آمادہ تھے مگر ناکلیں سڑ کے لیے آگے بڑھنے سے قاصر ہو گئی تھیں۔ قافلے نے ایک کنوئیں کے پاس پڑا ڈالا۔ بھوک اور پیاس سے بُرا حال تھا۔ چند نو جوانوں نے بھاگ کر کنوئیں سے پانی نکالا اور پھر پانی نکالنے والے بوکے کو ہی منہ لگا دیا۔ انھیں وہ بارہ پانی نکال کر پینا اور قافلے کے کمزور اور ناتواں لوگوں کو پلانے کا موقع ہی نہ ملا۔ وہ پانی جس جس نے پیا، اس کی انتھاریاں کاٹتے ہوئے گزر گیا۔ وہ جو چند لمحے قبل قافلے میں سب سے جوان اور طاقتور تھے، بے جان پڑے تھے۔ ان کے ہونٹوں اور کانوں سے خون رس رہا تھا۔ اس دیکھ بھرے منظر نے اتنا دبا دیا تھا کہ کبھی اٹھ کر آگے چل دیے۔ تھوڑی دور تک جاتے ہی ایک جگہ پھر بہت سانا ہوا سامان اور کتے پھنسے جسم ملے۔ ان مرنے والوں کے زخم ابھی تازہ تھے۔

کبھی خوف سے رک گئے کہ خیال قمار لے اور لوٹنے والے لیسرے زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے۔ سانس درست ہوئے تو احساس ہوا کہ بھوک نے بُرا حال کر دیا ہے۔ متلاشی لگا ہوں سے ادھر ادھر دیکھا تو چپ چپا کہ کئی مرنے والوں کے سامان کے ساتھ کھانے کی پٹیاں پڑی ہیں۔ مگر اب کے کسی میں ہاتھ بڑھا کر پٹلی اٹھانے کی ہمت نہ تھی۔ کئی بڑے بوڑھوں نے بتایا کہ بندو اور سکھ جتنے راستے کے ہر کنوئیں میں زہر مالتے گئے ہیں۔ انہی بزرگوں میں سے ایک پر بھی زہر چھڑک گئے ہوں۔ انہی بزرگوں میں سے ایک دانے مشورہ دیا کہ ایسا کرتے ہیں، یہ کھانا پہلے کسی بچی کو چکھا دیتے ہیں۔ کچھ ایسا ویسا ہوا تو کم سے کم قافلے کے

دوسرے لوگ مرنے سے بچ جائیں گے۔ اس تجویز پر نہ کسی نے ہائی بھری نہ انکار کیا۔ مگر سب کی نظروں میں ایسی بچی کو ڈھونڈنے لگیں جسے قربانی کی حیثیت چڑھایا جاسکے۔

پھر لگائیں میری ۹ سالہ عائشہ بی بی پر جا کر ٹھہر گئیں۔ وہ بنار سے تپ رہی تھی اور میری ٹانگ پر سر رکھے رو رہی تھی۔ پہلے وہ دیکھتے رہے، اسے لگا ہوں میں تو لتے رہے پھر ایک آواز آئی ”تمہاری تو اتنی ساری بیٹیاں ہیں اور یہ تو ویسے بھی بیمار ہے۔ پتا نہیں اتنے لمبے سفر میں بچکتی بھی ہے یا دم۔“ وہ دیتی ہے۔ اے..... اس سے زیادہ مجھ سے سنا ہی نہیں گیا۔ میں بنگلی کی سی تیزی سے اس پولٹی کی طرف لپکی، جس کا زہر میری بیمار بچی کے جیسے میں آتا تھا۔ میں زور زور سے چیخ رہی تھی، بڑبڑا رہی تھی اور زمین پر گری پولٹی سے دونوں ہاتھوں سے کھارہی تھی۔

”میں ماں ہوں اپنے جگر کے کٹڑے کو کیسے قربان ہونے دوں۔ تم نے زہر کی تصدیق ہی کرتی ہے ناں.....“ لو میں نے کہا لیا۔ اب دیکھو اور انتظار کرو کہ میں زہرہ پتی ہوں یا مر جاتی ہوں۔ مگر اپنی بچی کو جو میری وارث ہے، کیسے مرنے دیتی۔“

کئی لوگ تیزی سے میری طرف بڑھے تھے تاکہ مجھے اس حماقت سے روک سکیں مگر میں تب تک آجھی پولٹی کھا چکی تھی اور جس آدمی کے ہاتھ سے چھینی تھی، وہ پکا ہکا کھڑا کچھ رہا تھا۔ وہ جیب دکھ اور خوف سے بھرے لقمے لقمے کھا چکی تو میری آواز بند ہو گئی اور میں بے بسی اور بے چارگی سے زمین پر گر گئی۔ میری غالی اور اس اس آنکھیں کسی بھی خواب اور خیال، امید اور یقین سے آزاد تھیں۔ حتیٰ کہ ان میں کوئی آنسو تھا، نہ حسرت، نہ گلی، نہ شکوہ، نہ کوئی آس نہ امید۔ اذیت برداشت سے بڑھ جائے تو آنکھوں سے ساری آنسو ہی پٹی لیتی ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔“

جب دادو نے اپنی بات یوں سمیٹی تھی جیسے کوئی چہرے پہ آنی اداسی سیٹے۔ یا کوئی ماتھے پہ پڑے ہل سمیٹ لے۔ عائشہ کو میں نے اپنا وارث مان لیا۔ ساری چٹیاں بیاہ دیں۔

اس روز ابو نے پہلے بار بتایا ”جب میں دادو سے ملنے آخری بار، ان کے گھر گیا تھا تو شام ڈھلے بہت دیر ہو

موتی کی قیمت

ایک بڑا اور بدنام شخص علم و دان کی باتیں کر رہا تھا۔ لوگوں نے اس کا مذاق اڑایا اور بولے ”بھلا اس کی باتیں کیوں کوئی سنتے؟ یہ تو ایک نہایت بُرا اور بدنام زمانہ شخص ہے۔“

وہیں سڑا جی بنو جو تھا۔ اس نے کہا ”لوگو! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ یہ شخص جو جتنی باتیں کر رہا ہے اسے غور سے سنو اور ذہن نشین کر لو کیونکہ اس شخص کی حیثیت غلط طور پر سمجھی ہے۔ غلط طور کے ذیل ہونے سے موتی کی قیمت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔“

(عبدالسمیع، لاہور)

”راؤ بیٹی! تیری پھوپھو نے بھی کیا قسمت پائی ہے۔ اس کی ماں بھی جس نے اس کو وارث بنانا، وارث بنایا اور وہ خود بے وارثی ہو گئی۔ گھر میں ماں نہ ہو، ماں جیسی کوئی چیز تو ہو..... دعا کا دروازہ تو کھلا رہتا ہے۔ میرے آنے سے وہ نیک بخت تو اس نعمت سے بھی محروم ہو گئی۔“ پھر وہ پھوپھو کو روئے لکھیں۔ ساتھ وہ پپ پڑھنے لگیں جو مجھے سینے سے لگا کر ستایا اور گایا کرتی تھیں:

بھری تے آیا ہیر اے
راؤ نال دکھ ونڈیا
ساڈے حصے آیا ڈھیر اے

(بھری کے درخت پر ہیر لگ گئے ہیں۔ جیسے ہیر بانٹتے ہیں اسی طرح میں نے راؤ نے اپنا دکھ بانٹا تھا۔ اب میری قسمت دیکھ کر راؤ کے ہاتھ تو زیادہ کچھ نہیں لگا البتہ دکھ کا سارا ڈھیر میرے حصے میں ہی آ گیا ہے۔)

ماچس کی تیلی ابھی جلی ہے۔ ایک شعلہ سا لپکا ہے اور کئی اگر بتیاں سلگنے لگی ہیں۔ دھواں اوپر جا رہا ہے اور خوشبو چاروں طرف دھیرے دھیرے سفر کر رہی ہے اور میں سوچ رہی ہوں ”بس بیٹی ہے داد کی کہانی، کچھ اس سے زیادہ ہوتو مجھے بھی بتلاؤ!“



بچی تھی۔ بچی مٹی ہوئی تھی۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا، ہاتھ سے بھجایا۔ تمھاری پھوپھو سڑھیاں پھٹا گئی، بڑ بڑاتی، پیچھے اتر رہی تھیں تو برتن گرنے کی آواز آئی۔ مجھے اندر لے جا کر اس نے لابی میں بٹھا دیا۔ موم بتی جلائی اور اوپر چلی گئی۔ اوپر جاتے قدموں کی آواز مدھم ہوئی تو ایک جملہ میرے کانوں میں پڑا۔ وہ اپنی بیٹی سے کہہ رہی تھیں:

”سائن کر گیا تو کیا ہوا۔ جلدی سے اٹھا کر پلیٹ میں ڈال لو۔ بڑی اماں کو دے آؤ، انھیں اس کی عادت ہے۔“ وہ جملہ ایسا زہر تھا جو میرے کانوں میں پڑا اور روح تک اتر گیا۔ مجھے اپنی ماں سے وہاں ہونے والے سلوک کا اندازہ ہوا اور میں یہ نشان کر اٹھ کھڑا ہوا کہ ماں جی کو یہاں ایک لمحے کو نہیں رہنے دوں گا۔ میں ان کے کمرے میں گیا تو وہ دروازے سے لگی کھڑی تھیں۔ آنسو ان کی آنکھوں سے نکلنے کی راہ پانے والے تھے کہ میں ان کے گلے جا لگا۔ ماں جی! میں آپ کو لینے آیا ہوں۔ بہت رہ لیا آپ نے یہاں اپنی وارث کے ساتھ۔ وہاں میرے علاوہ راؤ بھی ہے۔ اسے بھی تو اپنی داد کی خوشبو آنے دیں۔ اسے بھی تو اپنے سائے میں بڑا ہونے کا موقع دیں۔“

ماں جی نے تیاری کی، بیگ اٹھایا اور میرے ساتھ آ گئیں۔ ایک عابدہ سا تھا جو ہم دونوں کے بچ ہو گیا تھا۔ آپ کہ اس لمحے کا ذکر نہیں کرنا۔ میرے ساتھ ساتھ ان جملوں کا زیر ان کے کانوں میں بھی اترتا تھا۔ وہ درد انھوں نے بھی سہا تھا۔ یہ دکھ اس بیٹی نے دیا تھا جس کو انھوں نے اپنا وارث بنایا تھا۔ جس کے حصے آنے والا نہ ہو خود کھایا تھا۔ اس لیے ہوتا ہے کبھی کبھی، کچھ لوگ دکھ اور شدت درد سے ان دروازوں جیسے ہو جاتے ہیں جو چاہنے کے باوجود نہ کھلتے ہیں نہ اندر جانے کی راہ دیتے ہیں۔ بس خاموش اور بند ہو جاتے ہیں پھر اسی خاموشی میں ہی شہر ٹوٹاں جانتے ہیں۔“ دادو نے جانے سے چند روز پہلے مجھے اپنے پاس بٹھایا اور خود کلامی کے انداز میں بولیں:

امریکی
ادب

امریکا کے ممتاز افسانہ نگار کے قلم سے

معافی

ایک پولیس افسر کا دل چھو لینے والا مجرا
اسے بہت دیر بعد اپنے ”حب“ کا احساس ہوا

برنارڈ مالموڈ
پروفیسر برنارڈ مالموڈ



www.Paksociety.com

کینال

سرپرست برکھت کرتی پولیس
گاڑی نے گرمیوں کی ایک
صبح موڑ کا۔ گاڑی میں
بیٹھے ۳ پولیس والوں میں

سے ایک نے سڑک کنارے چلتے، سیاہ ٹوپی پہنے ایک
بوڑھے کو انہی کے اشارے سے پاس آنے کو کہا۔ بوڑھے نے
سوچی چنی کی مدد سے ایک بڑا ڈبا اپنے کندھے پر لٹکا رکھا
تھا۔ دوسرا چھوٹا ڈبا ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔
”اے دوسرا آؤ۔“

لیکن پھیری والے بوڑھے نے سنا نہیں یا پھر وہ توجہ
نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ بدستور چلتا رہا۔ یہ دیکھ کر ایک
نوجوان سپاہی پھرتی سے گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر کودا۔
تیز قدموں سے چلتا قریب پہنچا اور بوڑھے کے کندھے
سے لٹکے ڈبے کو ٹوکھا مارتے ہوئے ہاتھوں کی پوری طاقت
سے اپنی طرف یوں گھسایا جیسے وہ گھاس پھوس کا بنا ہو۔
بوڑھے پھیری والے نے حیرت اور خوف سے نوجوان
پولیس والے کو دیکھا۔ بوڑھا بہت تجفٹ اور دبا چلتا تھا
لیکن اس کی آنکھیں بڑی روشن اور چمکدار تھیں۔ ایک لمحے
کے لیے سپاہی نے اسے غور سے دیکھا پھر بولا:

”کیا تم بہرے ہو؟“

بوڑھے پھیری والے کے ہونٹ اس طرح ہلے جیسے
کہہ رہا ہو کہ ہاں وہ بہرا ہے۔ مگر تھوڑی دیر بعد چٹا کر کہا
”تم نے مجھے دھکا کیوں دیا؟“

بوڑھے پھیری والے نے اپنی گردن آواز سے
نوجوان پولیس والے کو حیرت زدہ کر دیا۔ وہ بدستور بولا
”جب میں نے تمہیں پکارا تو تم رے کیوں نہیں؟“
”کب پکارا تھا؟ کیا تم نے میرا نام لیا؟“ بوڑھے
پھیری والے نے چہرے سے پیلے وائٹ کھینچ کر کہا۔

”تمہارا لائنس کہاں ہے؟“

”کون سا لائنس؟ کیسا لائنس؟“

”چالاک مت ہو، پھیری لگانے کا لائنس۔ ہم نے
تمہیں جینس پیچھے دیکھا ہے۔“

بوڑھا پھیری والا غامض رہا، اس نے یہ الزام نہیں جھٹایا۔
”اس بڑے ڈبے میں کیا ہے؟“
”۱۰۰ روٹ۔“

”کیا؟ کیا کہا تم نے؟“

”بکلی کے ۱۰۰ روٹ والے بلب۔“

”اور دوسرے میں؟“

”۶۰ روٹ۔“

”کیا تمہیں پتا نہیں کہ پٹر لائنس پھیری لگانا جرم ہے؟“

بوڑھے نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے چاروں
طرف نظر دوڑائی لیکن وہاں گاڑی میں بیٹھے اوجیز عمر کے
اوتھتے سپاہی کے سوا کوئی دوسرا نہیں تھا۔ نوجوان پولیس
والے نے اپنی نوٹ بک کھولی اور بولا:

”ڈبا خالی کرو۔ کہاں رہتے ہو؟“

بوڑھے نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”جلدی کرو، لہو۔“ گاڑی میں بیٹھے اوجیز عمر پولیس
والے نے چٹا کر کہا۔

”ایک سیکنڈ، اللہ، یہ بوڑھا بڑا آڑیل ہے۔“

نوجوان سپاہی نے پھر چٹس سے بوڑھے کو ٹوکا دیا۔

وہ اب بھی نیچے زمین کو تنک رہا تھا۔ آخر کار وہ بولا:

”میرے پاس لائنس ہانے کے لیے رقم نہیں۔“

”لیکن تمہارے پاس بلب خریدنے کے لیے تو رقم
ہے۔ کیا تمہیں پتا نہیں کہ تم اپنی قانونی فیس ادا نہ کر کے
اس شہر کے ساتھ دھوکا کر رہے ہو۔“

بوڑھے نے کوئی جواب نہ دیا۔

”بولو۔“

”جلدی کرو لہو۔“ گاڑی میں بیٹھے سپاہی نے کہا۔

”یاد تم خود یہاں آچاؤ، یہ بوڑھا بکرا تو بول کر ہی
نہیں دیتا۔“

اب دوسرا پولیس والا ہولے ہولے چٹا گاڑی سے
باہر آیا۔ وہ بھاری بھر کم جسامت اور بھورے بالوں والا
مغض تھا۔ چہرہ پسینہ سے چمک رہا تھا۔ بولا: ”بابا! آپ
اس کے سوالوں کا جواب کیوں نہیں دیتے؟“

تھوڑی دیر انتظار کے بعد لہو بے چین ہو گیا اور زور سے بارن بجانے لگا۔ دوسری منزل کی کھڑکی کھلی، والٹر نے زیر جامہ پہنے بھانکا اور بولا "صرف ۵ منٹ لہو، اپنا سینہ خشک کر رہا ہوں۔"

کچھ دیر بعد والٹر تیز قدموں سے چلتا واپس آیا۔ گاڑی دو بارہ بل پر آئی۔ ایک جگہ بھیڑ کی وجہ سے گاڑی کو آہستہ کرنا پڑا۔ بوڑھے نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گاڑی کا دروازہ کھولا اور بل کے خشکے کی طرف دوڑا۔ وہ عجوانہ طور پر مخالف سمت سے آتے ہوئے شرابوں اور نرکوں کی زد میں آتے آتے بال بال بچا۔ پھر کودتا ہوا فٹ پاتھ پر آیا اور بل کے خشکے پر چڑھ گیا۔ لہو نے بھرتی کے ساتھ بوڑھے کا پیچھا کیا اور اس کے کوٹ کا پیچھا کرنا پڑا۔ اپنی طرف کھینچا۔ بوڑھا بل سے چھلانگ لگانے کو تیار تھا۔

لہو نے خشکے کے ساتھ اسے زمین کی طرف کھینچا۔ بوڑھا زمین پر گرا اور اس کا سرفٹ پاتھ سے ٹکرایا۔ ٹوپی انجیل کر دوڑ چا کر۔ لیکن بوڑھا بے ہوش نہیں ہوا، زمین پر لیٹا کر اہتا اور دونوں ہاتھوں سے منہ اور سینہ لپٹا رہا۔ دونوں پولیس والے حیرت زدہ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کیا جائے؟ اسی دوران ایک بوڑھی عورت وہاں سے گزری جو شہید گرمی کے باوجود سر پر شال اوڑھے ہوئے تھی۔ کندھے سے دستے والی نوکری لگی ہوئی تھی جس میں پانچ سیٹ والے نمکین بسکٹوں کے ڈبے بھرے تھے۔ بوڑھی رکی تاکہ معلوم کر سکے کہ کیا ہوا ہے۔ پھر زمین پر گرے بوڑھے کو دیکھتے ہی چلائی "یو اسائن۔"

لیکن بوڑھے نے اس کی طرف نہیں دیکھا، وہ لگاتار اپنا سینہ پٹتا رہا۔

"کیا آپ اس کو جانتی ہیں؟" لہو نے پوچھا۔
 "ہاں یہ بلو اسائن ہے، ہمارے محلے میں رہتا ہے۔"
 "کہاں؟"

عورت نے تھوڑی دیر سوچا پھر بولی "میرے والد کا

بوڑھا بھیسری والا جسم اڑا کرے، دونوں پولیس والوں کو گھورتا رہا۔ اس وقت تک وہاں کافی لوگ جمع ہو گئے تھے، لیکن لہو نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں بھاگوا دیا۔

"ٹھیک ہے والٹر۔ مجھے جھٹکری دو۔ یہ بوڑھا تھا نے جائے گا۔" نو جوان سپاہی نے فیصلہ کر لیا۔

والٹر نے نو جوان پولیس والے کو غیر یقینی انداز سے دیکھا، جیسے یہ چور یا "کیوں؟"

"پولیس کے کام میں مداخلت۔"

لہو نے بوڑھے کا بازو پکڑا اور چلنے کا اشارہ کیا۔ تھیں بلوں کا چھوٹا ڈپا بوڑھے کے شانے سے گر پڑا۔ وہ اسے اٹھانے نہ سکا، تو خود بھی گھٹنوں کے بل گر۔ والٹر نے لہو کی مدد کی اور دونوں نے بوڑھے کو گاڑی کی پچھلی نشست پر ڈال دیا۔ نو جوان پولیس والے نے بوڑھا پکھنچ کر گاڑی کے پچھلے حصے میں رکھا۔ جیسے ہی گاڑی روانہ ہوئی، ایک دکان کے سامنے ٹھہرے آدمی نے چھوٹا ڈپا اٹھایا اور چلا کر بولا: "جناب! آپ یہ ڈپا بھولے جا رہے ہیں۔" لیکن دونوں میں سے کسی نے آواز نہیں سنی اور بوڑھا۔ وہ تو ایسے لگتا تھا جیسے سنائی نہیں جاتا۔

تھا نے جاتے ہوئے وہ روک لیٹن بل سے نذرے۔
 "ایک سینڈ لہو اپیل پار کرنے کے بعد گاڑی موڑ کر میرے گھر کے سامنے روک دینا۔ میں پسینے میں نہا گیا ہوں۔ اب تھیں تبدیل کرنا چاہتا ہوں۔"

لہو بولا "ابھی نہیں، پہلے ہم اس بکھت بوڑھے کو حوالہ میں بند کریں۔"

لیکن والٹر نے اپنی بات زور دے کر دہرائی اور کہا کہ اس وقت تک بہت دیر ہو جائے گی۔ لہو ہانا نہیں چاہتا تھا لیکن آخر کار ہار مان لی۔ والٹر کا گھر پیل سے زیادہ دور نہیں تھا۔ دونوں نے کوئی بات نہیں کی۔ جب والٹر گاڑی سے اترا تو بوڑھے پھیری والے سے کہا "اگر تم جرمنی میں ہوتے تو وہ لوگ تمہیں قتل کر دیتے۔ ہم تو صرف اتنی ہی قانونی کارروائی کر رہے ہیں جس کے نتیجے میں تمہیں زیادہ سے زیادہ ایک ڈالر جرمانہ ہوگا۔"

کرتے تھے کہ بلواسائن سینکڑ اونیو پر واقع اشیائے صرف کی ایک بہت بڑی دکان کا مالک تھا۔ لیکن پھر اس کا کاروبار تباہ ہو گیا۔ پھر اس کی بیوی مر گئی اور لڑکی آگ میں جل مری۔ اسے کوئی لاعلاج خارش کی بیماری ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اب یہ پھیری لگا کر بجلی کے بلب چلتا ہے۔

”کیا تمہیں اس کا پتا معلوم ہے؟“

”نہیں، لیکن اس نے کیا کر ڈالا؟“

”جو کچھ بھی اس نے کیا ہے، سزا سے نہیں بچ سکتا۔“

والٹر بولا۔

”خدا حافظ بلواسائن اچھے اسکول پڑھتا ہے۔“ بوڑھی عورت نے معذرت کی۔ بسکٹوں کی نوکری اٹھائی اور پھل دی۔ اب بوڑھے نے اپنا منہ اور سینا تو چننا بند کر دیا۔ وہ سکون سے زمین پر لیٹا رہا۔ سورج کی تیز شعاعوں کے باوجود بوڑھے نے آنکھیں نہیں جھپکائی تھیں۔

”اسے جانے دو۔“ والٹر نے اپنے ساتھی سے کہا۔

انھوں نے بوڑھے کو کھڑا کیا۔ گوٹ سے مٹی بھاڑی۔ مڑی مڑی ٹوٹی اس کے سر پر رکھی۔ پھر اپنی گاڑی میں بٹھایا۔ چند ہی منٹ بعد بوڑھے کو بلیوں والے ڈبے کے ساتھ ٹھیک اسی جگہ چھوڑ دیا جہاں سے پکڑا تھا۔

لیکن اُس رات جب اپنا گھٹ مکمل کرنے کے بعد لہجہ نے والٹر کو گھر کے سامنے اتارا تو یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہی بوڑھا وہاں کھڑا تھا۔

”سنو لیو؟“ والٹر نے ساتھی کو روکنا چاہا لیکن وہ تیزی سے گاڑی نکال کر لے گیا۔ اب والٹر کو جہاں ہی بوڑھے کا سامنا کرنا تھا۔ بوڑھا اپنے بیوں والے ڈبے کے ساتھ ویسا ہی دکھائی دیا جیسے آج صبح۔ سوائے ایک فرق کے کہ اب اس کی ٹوٹی مڑی مڑی تھی اور چہرے پر متھکن کے آثار تھے۔

”تمہیں کیا چاہیے؟“ والٹر نے پوچھا۔

بوڑھے کے بیوتھ بے۔ اس نے بلیوں کے ڈبے کی طرف اشارہ کیا اور کہا ”میرے بلیوں کا چھوٹا ڈبہ؟“

”کیا؟ کیا ہوا اس کو؟“

”کہاں ہے؟ کیا کیا تم نے اس کا؟“

والٹر نے تھوڑی دیر غور کیا تو اسے بوڑھے کا چھوٹا ڈبہ یاد آ گیا۔

”تمہیں یقین ہے کہ تم نے اسے کہیں اور نہیں چھپایا؟“ والٹر نے سختی سے پوچھا۔

بوڑھے نے والٹر کی طرف دیکھا تک نہیں اور خاموش کھڑا رہا۔

والٹر کو گھبراہٹ ہونے لگی۔ بولا ”ٹھیک ہے، ہم کوشش کریں گے اسے تلاش کرنے کی۔ لیکن پہلے میں رات کا کھانا کھانا چاہتا ہوں، مجھے سخت جھوک لگی ہے۔“

والٹر نے پیر پر چڑھا۔ وہ مڑ کر بوڑھے سے کچھ اور کہنا چاہتا تھا لیکن اوپر سے بیوی آئی تو وہ ٹوٹی آواز کر اس کی طرف مسکرایا اور اندر داخل ہو گیا۔ کھانے کے بعد والٹر کی خواہش تھی کہ وہ تھوڑی دیر آرام کرتے ہوئے ریڈیو سے لیکن اس نے وردی اتار کر گھر کے کپڑے پہنے اور بیوی سے کہا کہ وہ قریب ہی جا رہا ہے۔ اس کے سینے پر بوجھ سا تھا۔ بوڑھا ٹھیک اسی جگہ موجود تھا جہاں اس نے چھوڑا تھا۔

”چلو، میری گاڑی گیراج میں ہے۔“

بوڑھا اپنے ڈبے کے ساتھ والٹر کے پیچھے پیچھے آ گیا۔ گیراج میں والٹر نے اسے گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ بوڑھے نے اپنا ڈبہ گاڑی کے پیچھے حصہ میں رکھا اور خود بھی بیٹھ گیا۔ والٹر گاڑی چلاتا، ٹیل پار کرتا اس جگہ آیا جہاں صبح انھوں نے بوڑھے کو اٹھایا تھا۔ گاڑی کھڑی کی، پارٹی پارٹی سامنے کی تینوں دکانوں میں گیا اور اپنا پونیس کارڈ دکھاتے ہوئے دریافت کیا کہ کسی نے بوڑھے کا ڈبہ تو نہیں دیکھا؟ کسی کو بھی اس کا علم نہیں تھا، سوائے تیسری دکان کے ایک کھڑک کے۔ اس نے بتایا کہ شاید ڈبہ منجے کے ایک شخص کے پاس ہے۔ کھڑک نے اس شخص کا پتا دیا۔ یکدم اسے ایک خیال آیا اور اس نے تھانے فون کر کے کھڑک سے پوچھا کہ وہاں بلیوں کا کوئی چھوٹا ڈبہ تو نہیں؟ کھڑک نے جواب دیا کہ آج اس نے کوئی ڈبہ وصول نہیں کیا۔ واپس آکر والٹر نے بوڑھے سے پوچھا کہ ڈبے میں کتنے بلب تھے؟

پھر بنو سے ۵ روڈالر کا نوٹ نکالا اور بوڑھے کے حوالے کیا لیکن اس نے اسے قبول نہیں کیا۔

"کیا چاہتے ہو خبیث بڑھے؟" وہ غصے سے بولا۔

"میرا چھوٹا لڑکا!"

"میرا خیال ہے تمہیں گاڑی میں ٹھونسنے کا شوق ہے۔"

کار پھر چل پڑی۔ والٹر نے ٹھکر کے دیے ہوئے

پتے پر گاڑی روکی۔ لیکن وہاں کسی کو اس شخص کے بارے

میں علم نہ تھا جس کے پاس بلبوں کا ڈبا دیکھا گیا۔ آخر کار

ٹھکر پہنچے ایک شخص اس کی منزل سے آیا اور والٹر سے کہا

کہ اسے جس شخص کی تلاش ہے، وہ اس کا بیٹا ہے۔ والٹر

نے چچا کو یقین دلایا کہ کوئی یقین معاملہ نہیں۔ اتفاقاً اس کا

بھتیجا بلبوں کے ایسے ڈبے کے متعلق معلومات رکھتا ہے جو

لفظی سے سڑک پر رہ گیا تھا۔ چچا نے بتایا کہ اس کا بھتیجا

ایک کلب میں موجود ہوگا۔ لیکن وہ کلب کا پتہ اسی صورت

میں دے سکتا ہے جب معاملہ یقین نوعیت کا ہو۔ والٹر کو جو

پتہ ملا وہ شہر کے شمالی حصے کا تھا، یعنی وہاں سے کئی میل دور!

"اودھائی! یہ تو میں ہے وقفوں والی حرکتیں کر رہا

ہوں۔" والٹر بڑبڑایا۔ گاڑی کی طرف آتے ہوئے والٹر

نے سوچا کہ اگر وہ کام سستی سے کرے تو شاید بوڑھا

عاجز اگر خود ہی دفع ہو جائے۔ لہذا اس نے ایک

ریستوران کے سامنے گاڑی روکی اور کافی پینے لگا۔ اسی

دوران ٹی۔ وی پر دس راؤنڈ کی مکمل گشتی بھی دیکھی۔ وہ

پیسے میں شراپور باہر آیا۔ لیکن بوڑھا اسی طرح گاڑی میں

موجود تھا۔ والٹر اپنی بغل سمجھانے لگا۔

"کھجکی کے لیے کون سی چیز مفید ہے؟" والٹر نے

گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بوڑھے سے دریافت کیا۔

بوڑھے نے کوئی جواب نہ دیا، بس سامنے گھورتا رہا۔

اب وہ بڑے المیہ منان سے گاڑی چلا رہا تھا۔ آخر

کلب جا پہنچا جہاں اب بھی قفس جاری تھا۔ اس نے

نکت ٹھکر سے بیچنے کے متعلق معلوم کیا۔ نکت ٹھکر نے

جواب دیا کہ اس نام کا کوئی شخص کلب میں موجود نہیں۔

"کوئی یقین بات نہیں، سوائے اس کے اسے بلبوں

کے ایسے ڈبے کے بارے میں علم ہے جس کا مالک میری

گاڑی میں بیٹھا ہے۔" والٹر نے کہا۔

"مجھے کچھ معلوم نہیں۔" ٹھکر بولا۔

"چلو کوئی بات نہیں۔"

والٹر پھر چند منٹ دروازے میں کھڑا رکھا صوں کو

دیکھتا رہا لیکن وہ وہاں کسی کو پہچان نہ سکا۔ وہ واپس چلا آیا۔

"تم ابھی تک موجود ہو؟" والٹر نے پوچھا۔

بوڑھا خام سم اسے گھورتا رہا۔

اب والٹر نے اپنی گاڑی چھٹی ایونیو پر واقع ایک

ریستوران کے سامنے روکی اور نیا مشروب خریدا۔ گاڑی میں

واپس آکر مشروب کا ایک لمبا گھونٹ بھرا اور بولا "بیو گے؟"

بوڑھا بلوا انسان گاڑی کی پچھلی نشست پر تحیف الو کی

طرح بیٹا سا بیٹھا تھا۔ اس نے گھور کر والٹر کو دیکھا لیکن

بات نہ نہیں بڑھایا۔ گاڑی کافی دیر تک اشارت نہیں ہوئی۔

والٹر دیر تک امیٹرنگ ویل پڑے محویت کے عالم میں بیٹھا

رہا۔ ٹھیک اس لمحے جب اسے کوفت محسوس ہوئی تو اسے

ایک خیال آیا۔ اسے وہ اتنا بھایا کہ فوراً گاڑی چلائی اور شہر

کی طرف مڑ گیا۔ وہ شہر کے اس علاقے میں پہنچا جہاں

رات کے وقت بھی دکانیں کھلی رہتی تھیں۔ اس نے گاڑی

ایک دکان سے قریب پارک کر لی۔ ۱۰ روٹ بعد وہ ایک

ملفوظ ڈبے کے ساتھ واپس آیا جس میں ۶۰ روٹ گئے

۵ روڈر جن بلب تھے۔

"مفت کی تفریح ختم ہوئی دوست۔" وہ بولا

بوڑھا چھبیری والا گاڑی سے باہر آ گیا۔ والٹر نے

بڑا ڈبا نکال کر سڑک کنارے رکھے چھوٹے ڈبے کے

ساتھ رکھا اور تیزی سے گاڑی دوڑا لے گیا۔ پل پر گاڑی

چلائے ہوئے والٹر نے خود کو ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ وہ سونے

کے لیے بے چین تھا کیونکہ دوسرے دن صبح ۶ بجے کام پر

پران کمبل دکھا اور کھڑکی کے پاس آکر بوڑھے کی طرف اچھال دیا۔

والٹر پھر واپس خواب گاہ میں صبح ارادہ کر کے آیا کہ اب کئی گھنٹے لگا کر سونے گا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے محسوس کیا کہ بارش ختم ہوئی۔ وہ بوڑھے کو دیکھنے اٹھا۔ کمبل ٹھیک اسی جگہ سڑک کے کنارے پڑا تھا جہاں اس نے بچپن کا تھا۔ بوڑھا بلو اسٹائن بھی درخت کے نیچے اسی طرح موجود تھا۔ والٹر سلیپ پر پہنچے آیا۔ اب گرمی کا دورم ہو گیا تھا۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ درخت کے پتے ہوا سے کانپ رہے تھے۔

”بلو اسٹائن!“ والٹر نے پکارا۔ اسے اپنی آواز کا بچتی محسوس ہوئی۔ پھر اسے اپنے اندر خالی پن کا احساس ہوا۔ سڑک کنارے چلتے ہوئے والٹر نے تمام دن کی باتوں پر غور کیا۔ پھر اپنا سر اٹھایا اور نرمی سے بولا:

”بلو اسٹائن! اٹھو! معافی مجھ پر قرض ہے۔ مجھے دلی افسوس ہے کہ یہ سارا واقعہ رونما ہوا۔ میں اب تک سو نہیں سکا۔ میں تم سے دلی معافی چاہتا ہوں۔“

بلو اسٹائن نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے جن میں چاند چمک رہا تھا، اسے گھور کر دیکھا لیکن کوئی جواب نہیں دیا۔ والٹر کو ایسا محسوس ہوا کہ بوڑھے کا جسم اور اس کا سایہ بھی ڈھیلا پڑ گیا۔ والٹر نے بوڑھے کو الوداع کہا اور پھر اپنی خواب گاہ میں چلا آیا۔

”کیا بات ہے؟“ اس کی بیوی نے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“

قیہی نے دوسری طرف کروٹ لی اور بولی ”سنی کو منت چکانا۔“

والٹر کچھ دیر لیٹ کر پھر اٹھا اور کھڑکی کی طرف گیا، نیچے سڑک کی طرف دیکھا اور سکون کا سانس لیا۔

وہ بڑبڑایا ”ہاں چلا گیا۔“ بوڑھا پھیری والا بجلی کے لمبوں والے لڑکے کے ساتھ مع کمبل اب وہاں موجود نہ تھا۔

والٹر نے دوبارہ سڑک کو دیکھا لیکن چاندنی سے روشن لمبی سڑک اسے اس سے پہلے کبھی اتنی سناں نہیں لگی تھی۔



جانا تھا۔ والٹر نے گاڑی گیراج میں کھڑی کی اور نہ نہ چھلانگ مکان میں داخل ہوا۔ وہ گھر میں بہت احتیاط سے چل رہا تھا۔ وہ اپنے بیٹے اور بیوی کو دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔

کچھ عرصے بعد چلنے کے بعد جب وہ بستر میں لیٹا تو گرمی کے باوجود اسے اپنا جسم برف کی طرح سرد محسوس ہوا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اٹھا اور کھڑکی کے نزدیک کھڑا ہو گیا۔ خاموش سڑک چاندنی میں جھلکی ہوئی تھی۔ درختوں کے سائے سائے چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے۔ ایک مکان کے سامنے والے درخت کے سائے میں اسے ایک غیر سامیڑھا بچہ پایا نظر آیا۔ والٹر نے اپنا چٹا اور چٹیل پہنے اور دوڑتا ہوا نیچے آیا۔

”اب کیا بات ہوئی؟“ اس نے دریافت کیا۔

بوڑھا بلو اسٹائن سڑک کے کنارے کھڑا اسے گھورتا رہا۔

”اب کیا چاہیے؟“

بوڑھا دوبارہ خاموش رہا۔

”بہتر ہوگا بلو اسٹائن کہ تم اب یہاں سے چلے جاؤ۔“

مزید گڑبڑ کے لیے رات کا یہ چھپلا پھر موزوں نہیں۔ صبحیں تمہارے بلب مل گئے بہتر ہوگا کہ تم اپنے گھر جاؤ اور میرا پیچھا چھوڑو۔ مجھے پولیس بانے سے نفرت ہے۔ جاؤ اپنے گھر۔“

والٹر لڑکھڑاتے ہوئے نہ چڑھ کر اوپر آیا۔ اس نے اپنے کمرے میں بیٹے کے کمرے کی آواز سنی۔ اب والٹر لیٹا تو جلد ہی سو گیا۔ لیکن پھر بارش کی آواز سن کر جاگ اٹھا۔ کھڑکی پر آکر اس نے نیچے دیکھا، بوڑھا بارش میں کھڑا بدستور موجود تھا۔ اس نے اپنا چہرہ اوپر کھڑکی کی طرف اٹھا رکھا تھا۔ والٹر کو وہ چہرہ اتنا نزدیک لگا جیسے کھڑکی کی بیل پر رکھا ہو۔

والٹر اندر دوڑا۔ اس نے الماری سے چھتری تلاش کی جو اسے نہ مل سکی۔ اسی دوران بیوی جاگ گئی۔ وہ بلند سرکشی میں بولی ”کون ہے؟“

وہ بے حرکت کھڑا رہا۔ بیوی نے ایک منٹ انتظار کیا اور پھر اس کی آنکھ لگ گئی۔ چھتری نہ ملنے پر اس نے ایک

Exclusive Free Home Service

- ✓ Discounted Rates
- ✓ Countrywide Service
- ✓ Easiest Payment Methods
- ✓ Cash On Delivery

آپ کی ہر مطلوبہ کتاب --- آپ کے گھر پر

Em
EASY MART



Order Through



www.easymart.com.pk



order@easymart.com.pk



0301-777 87 07

EASY MART ONLINE BOOK STORE

Haq Street Urdu Bazar, Lahore. Ph: 042-36185436

پورپی
آرٹ

ایک منصوبہ کے ذہن رسا کا ماجرا

گم گم گم

اس نے بہت دُور کی سوچی تھی
پلن پلن بدلتی، وہ سو سوں بھری ایک آبرش کی کہانی
وہ مایوسی بھرے حالات میں بھی فیصلے کرنے پر قادر تھا

مصنف: محمد رفیع
مترجم: محمد رفیع



سینٹ

کلین ایک بڑا بحری جہاز تھا جو کیتھم کی بندرگاہ کی باروے سے آئر لینڈ پہنچا۔ اس کی کئی منازل تھیں۔

مسافروں کے علاوہ ان کی کاریں اور بڑے ٹریلر والے ٹرک بھی اس میں موجود تھے۔ لیام کلارک ایک ایسے ہی ٹرک کا ڈرائیور اور یورپ سے آئر لینڈ سامان پہنچانے والی کمپنی مانیبرا میں ملازم تھا۔ لیام کی گھڑی میں دوپہر کے ۲ بجے تھے۔ وہ اس خیال سے خوش تھا کہ جلد ہی ڈبلن میں اپنے خاندان سے ملنے والا ہے۔ وہاں بیجے جہاز بندرگاہ پہنچ گیا۔

دو دو منزل نیچے اتر کر اپنے ٹرک میں آبیٹا تاکہ جیسے ہی جہاز کا دروازہ کھلے، وہ بندرگاہ میں داخل ہو جائے۔ کاؤنٹی ویکسٹورڈ ایک اہم بندرگاہ تھی جہاں یورپ اور برطانیہ کے بحری جہاز آتے تھے۔ جیسے ہی لیام سے آگے والے دو ٹرکوں نے انجن چلائے، اس نے بھی اپنا ٹرک چالو کر دیا۔ جلد ٹرک باہر آیا اور کسٹم دفتر کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس نے اتر کر سامان کے کاغذات کسٹم افسر کے حوالے کیے۔ افسر معاینہ کر لے گا۔

ایک سے دوسرے ملک سامان لانے لے جانے کے لیے اس کے پاس تمام ضروری کاغذات موجود تھے۔ مثلاً لائسنس، بیمہ، ڈیوٹی کی رسید اور پرمٹ وغیرہ۔ کسٹم افسر نے کاغذات دیکھ کر لیام کے حوالے کیے تو اس کی نظر گاڑی کے نیچے پڑی۔ اس نے پوچھا "یہ کیا ہوا ہے؟"

لیام نے بھی ہنک کر گاڑی کے نیچے دیکھا۔ وہاں تیل گرنے سے ایک بڑا نشان نظر آیا جو پھیلتا جا رہا تھا۔ تیل تیزی سے پھیل رہا تھا۔ لیام نے ٹرک کے نیچے ٹھس کر معاینہ کیا۔ انجن کے اندر نسل لوہے کا پیچ ٹوٹ گیا تھا۔ وہیں سے انجن کا تیل گر رہا تھا۔ لیام باہر آیا اور کسٹم افسر سے کہا "یہ تو بڑا مسئلہ ہو گیا۔ مجھے ڈبلن اپنے صدر دفتر فون کر کے اطلاع دینی ہوگی۔ وہاں سے کارگیر پرزہ لے کر آئے گا۔ پھر مرمت ہوگی۔"

دفتر میں فون پر بات نہ ہو سکی۔ عملہ کھانا کھانے میں

مصروف تھا۔ لیام نے انتظار کیا۔ تقریباً ۳ بجے فون ملا۔ اس نے کمپنی کے مینیجر کو سارا مسئلہ بتایا۔ مینیجر نے کہا "میں پرزہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

وقت گزرتا گیا۔ شام ۶ بجے اسے بتایا گیا کہ پرزہ مل گیا ہے لیکن کار گیر صبح روانہ ہو کر ۱۲ بجے تک اس کے پاس پہنچے گا۔ لیام کو اب رات اسی شہر میں گزارنی تھی۔ اس نے ایک چھوٹے ہوٹل میں کمر لیا اور اپنے گھر فون کر دیا کہ وہ اب مل ڈبلن پہنچے گا۔ رات کا کھانا کھا کر وہ آرام سے سو گیا۔ اگلی صبح ۱۰ بجے بندرگاہ جا پہنچا۔

تھوڑی ہی دیر میں کار گیر بھی پہنچ گیا۔ اس نے فوراً کام شروع کر دیا۔ پرزہ تبدیل کرنے میں تقریباً دو گھنٹے لگے۔ اس دوران لیام نے بھوک محسوس کی اور وہ کھانا کھانے چلا گیا۔

اسی دوران سینٹ پیٹرک نامی بحری جہاز بندرگاہ کے نزدیک پہنچا۔ بندرگاہ سے کچھ دور ریت کے ٹیلے پر لینا ہوا ایک شخص، مرنی دورین کی مدد سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنے ساتھی بریڈن سے کہا "سینٹ پیٹرک بالکل صحیح وقت پر پہنچ گیا۔"

بریڈن نے کہا "مرنی! کیا ہم لوگ یہ واردات کر سکیں گے؟"

مرنی ایک جراثیم پیشہ شخص تھا۔ اس نے کہا "میں نے احتیاط سے منصوبہ بندی کی ہے۔ ہم لوگ ضرور کامیاب ہوں گے۔ آنے والا جہاز اب بندرگاہ سے تھوڑے فاصلے پر ہی ہے۔ ادھر کار گیر نے لیام کے ٹرک کا کام ختم کیا اور کہا "اب اس میں تیل دو بارہ بھر دو۔ پھر تم روانہ ہو سکتے ہو۔" تھوڑی دیر بعد سینٹ پیٹرک بندرگاہ پہنچ گیا۔ مرنی نے دورین کی مدد سے دیکھا کہ باہر نکلنے والا سپلا ٹرک ٹریلر بھروسے رنگ، جبکہ دوسرا سفید رنگ کا ہے۔ مرنی نے کہا "یہ سفید ٹرک ہمارا نشان ہے۔ جب یہ باہر نکلے گا تو ہم اس کا پیچھا کریں گے۔"

جہاں لیام کا ٹرک کھڑا تھا، وہیں مانیبرا کمپنی کا وہ دوسرا ٹرک بھی آکھڑا ہوا جو ابھی سینٹ پیٹرک سے باہر آیا

نے کہا: ”ہم ایک گھنٹے بعد فارم پر ملیں گے۔“

مرنی اور برینڈن نے پھر بندھے ڈرائیور کو پھیللی نشست میں ڈالا، کار سے پولیس کے نشانات ہٹائے، اپنے کپڑے تبدیل کیے اور روانہ ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد کار نے ٹرک کو پار کیا۔ مرنی نے ایک مرتبہ ہارن بجا یا۔ ٹرک ڈرائیور نے ہاتھ ہلکا کر ”ٹھیک“ کہا اور سفر جاری رکھا۔

فارم پر جانے کے لیے کار ایک جی سڑک پر مڑی۔ ایک گھنٹہ گشتوں میں پہنچنے کے بعد دو گھنٹے درختوں میں گھرے ویران فارم پر پہنچ گئی جس میں بڑا سمارا بنا ہوا تھا۔ شام ہو چکی تھی اور سورج غروب ہونے کے قریب تھا۔ مرنی اپنی کامیابی پر خوش تھا کہ اس نے شراب کی ۹ ہزار بوتلیں بڑی آسانی سے اڑائیں۔ اب انھیں چور بازار میں بیچنا اس کا کام نہیں تھا۔ اس نے تو یہ مال دوسرے خریدار کے حوالے کر کے اپنے پونڈ کھرے کر لینے تھے۔

مرنی اور اس کے ساتھیوں نے لیام کو اٹھایا اور کمرے میں پڑی بوتلیوں کے پیچھے چھپک دیا۔ اندھیرا ہونے کے بعد سڑک پر ٹرک بھی پہنچ گیا۔ اسے بڑے کمرے میں چھپایا گیا۔ مرنی ہاتھ میں مارچ لیے تہی سڑک کے موڑ پر آ گیا تاکہ شمالی آئر لینڈ سے آنے والے خریدار کو فارم کا راستہ دکھا سکے۔ تھوڑی ہی دیر میں وہاں ۳۰ دیکھیں آئیں۔ مرنی اپنی راہنمائی میں انھیں فارم باؤس تک لے آیا۔ لمبا کوٹ پہنے ایک طویل القامت، خونمد آدمی گاڑی سے اتر آیا۔ اس نے مرنی سے پوچھا کہ مال آگیا؟

مرنی نے کہا: ”ہاں ٹرک میں ہے۔ وہ بازار سے اندر چھپا کھڑا ہے۔ اس کے دروازے پر کسٹمر کی مہریں بھی لگی ہیں۔ ہم میں سے کسی نے بھی ٹرک کو نہیں چھیڑا۔“ خونمد آدمی نے ٹرک کے پچھلے دروازے پر گئے تالے دیکھے، کسٹمر مہروں کا معائنہ کیا، پھر اپنے آدمیوں سے کہا کہ ٹرک سے مال اتار کر وین میں رکھیں۔ یہ احکامات دے کر وہ کمرے میں پڑی کرسی پر آ بیٹھا اور بریف کیس کھولا۔ اس میں پورے ۳۵۰۰۰ پونڈ موجود تھے۔ مرنی بڑا خوش ہوا۔ اسے یقین تھا کہ تین تین ہزار ساتھیوں کو دینے

تھا۔ کسٹم آفیسر نے لیام کو اشارہ کیا کہ تم روانہ ہو جاؤ ورنہ یہاں جھوم ہو جائے گا۔ لیام نے اپنی ہتھی کے ڈرائیور کو ہاتھ ہلایا اور ٹرک چالو کر کے بندرگاہ سے باہر نکل آیا۔

مرنی نے جیسے ہی اس کا ٹرک دیکھا تو بولا ”ارے یہ تو بہت جلد باہر آگیا۔ خیر ہمیں کیا؟ برینڈن! اس ٹرک میں فراہمی برائڈی کے ۵۰/۴۰ کریٹ موجود ہیں۔ اس کا مطلب ہے بہترین برائڈی کی ۹۰۰۰ بوتلیں۔ اگر ہمیں ۳۰ پونڈ فی بوتل بھی ملیں، تو سوچو، مئی ساری رقم ہاتھ آئے گی۔“

دونوں آدمی اٹھے اور نیچے اتر کر اپنی کار کے پاس پہنچے جو دو روز قبل چرائی گئی تھی۔ اس کی نمبر پلیٹ بھی تبدیل کر دی گئی تھی۔ دونوں لیام کے ٹرک کا تعاقب کرنے لگے۔ جب ٹرک ڈبل روڈ پر مڑا تو مرنی نے کہا ”اب مجھے فون کر دینا چاہیے۔“

اس نے سڑک کنارے لگے ایک فون بوتھ سے اپنے ۲ ساتھیوں کو فون کیا اور کہا ”ہم ٹرک کے پیچھے آرہے ہیں۔ تم دونوں مقررہ مقام پر پہنچ جاؤ اور ٹرک کا انتظار کرو۔“

مرنی اور برینڈن آئرش پولیس کی وردی میں بیوس تھے۔ راستے میں ایک جگہ رک کر مرنی نے پسرمت سیاہ رنگ کی کاری جھٹ پر پولیس کا نشان مقناطیس کی مدد سے لگا لیا۔ دور سے دیکھنے والے کو یہی لگتا کہ ہائی وے پولیس کی کار میں دو افسر بیٹھے ہیں۔ ٹرک کا تعاقب جاری رہا۔ ایک نسبتاً کم آمدورفت والے مقام پر ”پولیس کار“ ٹرک کے برابر آگئی۔ مرنی نے ڈرائیور کو روکنے کا اشارہ کیا اور کہا ”تمہارے ٹرک کا پچھلا پیر پلٹنے والا ہے۔ ٹرک ایک طرف روکو۔“

لیام نے ٹرک روکا اور نیچے اتر کر پیچھے کی جانب چلا۔ مرنی اس کے ساتھ تھا۔ اچانک جھانڑیوں سے دو نقاب پوش لٹے اور لیام کو ہاتھوں اور پیروں سے پکڑ بھانڑیوں میں لے گئے۔ مرنی نے اس کا منہ دبا لیا تھا۔ چند منٹ میں اس کی وردی اتار دی گئی۔ منہ، آنکھوں، ہاتھ اور پیروں میں پلاسٹک ٹیپ لگا دیا گیا۔ مرنی کے ایک ساتھی نے اس کی وردی پائی، ٹوٹی لگائی، پھر لیام کے کاندات اپنی جیب میں رکھے اور ٹرک پر چبھ گیا۔ مرنی

سنت نبوی ﷺ میں شفاء ہے



سرکہ بہترین سالن ہے۔ اے اللہ تو سرکہ میں برکت ڈال کہ یہ مجھ سے پہلے نیویں کا سالن تھا اور وہ گھر غریب نہ ہوگا جس میں سرکہ موجود ہے۔ (ابن ماجہ)

T.M.
Doctor's

Unpasteurized, Unfiltered & Living

Natural
APPLE CIDER
VINEGAR

With Mother

100% Pure

اجنباتی خالص اور پاک و صاف
WONDERFUL DRUG OF YESTERDAY & TODAY

ترکیب

- ایک کپ اپیل سیڈروینگر (Apple Cider Vinegar)
- ایک کپ خالص شہد (Raw)
- آٹھ عدد لہسن کے جوئے

ملک بھر سے
ڈسٹری بیوٹرز
درکار ہیں

قدرتی سرکہ سیب، شہد اور لہسن کو 60 سیکنڈز کے لیے ہلنڈر میں کس کریں۔ اس کچر کو خشکی کی بوتل میں ڈال کر فریج میں 5 دن کے لیے رکھ دیں اور پانچ دن بعد استعمال کرنا شروع کریں۔ ہر روز دو چمچ پانی کے گلاس، یا تازہ پھلوں کے جوس میں حل کر کے ناشتے سے ایک دو گھنٹے پہلے استعمال کریں۔ یہ ترکیب پنوں، جوڑوں کے درد، الزیمیر، آرتھرائٹس، دمہ، ہلنڈ پریشر، Infertility، سردی، انفلشنز، موٹاپا، السر، کولیسٹرول، کینسر، بریسٹ کینسر، ایسوفیجس، جلد، معدے اور مدافعتی نظام کے لیے بہت اچھی ہے۔

- ◆ DR. ANGUS PETERS OF UNIVERSITY OF EDINBURGH'S ARTHRITIS RESEARCH INSTITUTE
- ◆ DR. RAYMOND FISH OF LONDON'S FAMOUS OBESITY RESEARCH CENTER
- ◆ DR. ETIK BLOCK OF THE STATE UNIVERSITY OF NEW YORK AT ALBANY.....

اسٹاکس حضرات اس نمبر پر رابطہ کریں۔

طاہر جاوید 0321-4435980, 0423-5761796

0321-9785644

0321-8823321

ڈاکٹر اصغر علی (ایم۔ بی۔ بی۔ ایس) 62-P مرغزار کالونی، ملتان روڈ، لاہور۔

”اس لیے کہ تمہارے کارندوں نے فوراً میرے منہ اور آنکھوں پر ٹیپ لگا دیا۔“

مرنی نے لیام سے دوبارہ پوچھا ”کیا واقعی بور یوں کے نیچے شراب کی بوتلیں نہیں؟“

لیام نے کہا ”شراب کی بوتلیں انٹیکسٹم میں تو براڈی بنا کر نہیں جاتی۔“

یہ سن کر مرنی بولا ”کیا تم فرانس سے نہیں آ رہے؟“

لیام نے کہا ”ہرگز نہیں، میں تو انٹیکسٹم سے کھار کی بوریاں آئر لینڈ لے کر آیا ہوں۔“

تومند آدمی نے اچانک مرنی کو گردن سے پکڑ کر اٹھایا، زمین پر دے مارا اور بولا ”تم نے میرا وقت ضائع کر دیا۔ آئندہ اگر ایسی حرکت ہوئی تو تمہیں زندہ زمین میں گاڑ دوں گا۔“

تومند آدمی پھر ساتھیوں کے ساتھ واپس شاہی آئر لینڈ روانہ ہو گیا۔ مرنی کی جان میں جان آئی۔ وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ کمرے میں آیا۔ انھوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اب کیا کیا جائے؟ مرنی کے ساتھی بولے ”ہمارے پاؤں تو مارے گئے۔“

مرنی نے کہا ”زیادہ بڑا نقصان تو میرا ہوا ہے جس نے سارے منصوبے پر رقم خرچ کی تھی۔ میں تمہیں ایک ایک ہزار پاؤنڈ دے دوں گا لیکن ابھی نہیں دیکھو انتظار کرنا پڑے گا۔“

مرنی نے پھر بریڈن سے کہا ”تم دونوں آدمیوں کے ساتھ مل کر اس کمرے اور ٹرک سے تمام اشیاء کے نشانات صاف کر دو۔ یہاں کسی قسم کا ثبوت نہیں چھوڑنا۔ باہر مٹی میں ناٹروں کے تمام نشان بھی براہِ بردار کر دو تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔ ڈرائیور کو کار میں بٹھا کر یہاں سے چند میل دور ٹرک کنارے چھوڑ دینا۔ ہاتھ، بجر اور منہ ٹیپ سے بندھے رہیں۔ صبح تک کوئی نہ کوئی اس کی مدد کر دے گا۔ اس کے بعد سیدھے اپنے گھر جانا اور کچھ عرصے کے لیے غائب ہو جاؤ۔ میں ٹرک کے بار بار ہوں۔ کسی ویران مقام پر چھوڑ دوں گا۔ پھر وہاں سے کسی طرح اپنے گھر واپس آئیں گے۔“

کے بعد بھی اس کے حصے میں کافی رقم آئے گی۔ اچانک تومند آدمی کے ایک آدمی نے آواز دی ”پاس! ابھر ہوگا آپ یہاں آکر خود دیکھیں کہ یہ کیا معاملہ ہے۔“

تومند آدمی نے جلدی سے بریف کیس بند کر کے ہاتھ میں اٹھایا اور ٹرک کے پاس پہنچا۔ اس کے ساتھی ٹرک کے پیچھے کھلے دروازوں کے قریب کھڑے تھے۔ ۶ مارنرچوں کی روشنی میں ٹرک کے اندر کا مظہر بالکل واضح تھا۔ بھائے بوتلوں کے کریٹوں کے ٹرک میں پتھر اور بری مال بھرا تھا۔ چارنگ کی بھری بوریاں ایک دوسرے پر ترتیب سے رکھی تھیں۔ ہر بوری پر کپنی کا نام بھی کندہ تھا۔ یہ پانچے کا سامان بنانے کی کپنی تھی۔ ہر پر ”روز فریڈلینڈ“ یعنی گلاب کے پودوں کی کھاد کے واضح الفاظ ثبت تھے۔ آدمی نے غصے کے عالم میں مرنی سے پوچھا ”یہ کیا مذاق ہے؟ شراب کی بوتلیں کہاں ہیں؟“

مرنی نے قسم کھا کر کہا ”مجھے نہیں معلوم یہ کیا گھپا ہے۔ میری اطلاع تو بالکل درست تھی۔ مجھے متعلقہ کپنی اور بھری جہاز کا نام اور آمد کی تاریخ سب کچھ درست بتایا گیا تھا۔ آج اس بھری جہاز سے صرف یہی سفید ٹرک باہر نکلا۔“

تومند آدمی نے مرنی سے پوچھا کہ ٹرک کا ڈرائیور کہاں ہے؟ مرنی نے بتایا کہ ادھر پیچھے پڑا ہے۔ دونوں اس کے پاس پہنچے۔ ٹرک کا ڈرائیور لیام کھارک بندھا پڑا تھا۔ آدمی نے پوچھا ”تمہارے ٹرک میں یہ کیا سامان ہے؟“

لیام نے جواب دینے کی کوشش کی لیکن واضح آواز نہ نکلی۔ تومند آدمی نے اپنے ایک کارندے کو اشارہ کیا۔ اس نے بڑھ کر لیام کے منہ سے ٹیپ ہٹا لیا۔ آدمی نے پھر پوچھا ”ٹرک میں کیا سامان لے جا رہے تھے؟“

لیام نے کہا ”گلاب کے پودوں کی کھاد! کسٹم کے کاغذات میں بھی یہی لکھا ہوا ہے، آپ دیکھ سکتے ہیں۔“

تومند آدمی مرنی کی طرف مڑا اور غصے سے بولا ”ابے دوقوف! کیا تم نے یہ کاغذات نہیں دیکھے؟“

مرنی کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ وہ اپنا غصہ ڈرائیور پر نکالتے ہوئے بولا ”تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟“

مرنی نے اثبات میں سر بلایا۔ تبھی سپاہی نے کہا کہ ٹریکٹر کی دونوں چٹیاں خراب ہیں۔ سارجنٹ نے مرنی کو کاغذات واپس کیے، کسان کی طرف متوجہ ہوا اور پوچھا: ”تمہارا لائسنس اور انشورنس کے کاغذات کہاں ہیں؟“

اس نے بتایا کہ گھر پر ہیں۔ سارجنٹ نے کہا ”ٹرائی سڑک سے بناؤ اور بھوسے کی گائلیں ایک طرف رکھو تاکہ سڑک کا راستہ کھل جائے۔ ہم ابھی ساتھ چل کر تمہارے گھر کاغذات کی پڑتال کرتے ہیں۔“

مرنی نے سوچا کہ پولیس والے چلے جائیں، تو وہ فوراً یہاں سے نکل جائے۔ اسی وقت سپاہی ٹھٹھا ہوا ٹرک کے پچھلی جانب گیا تاکہ اس کی تیبوں کا بھی معائنہ کر لے۔ سارجنٹ نے مرنی سے پوچھا ”تمہارے ٹرک میں کیا سامان ہے؟“

اس نے بتایا کہ گلاب کی کھاد لدی ہے۔ سپاہی ٹرک کے پچھلی جانب سے واپس آیا اور کہا کہ ٹرک کے دروازے کی کنڈی ٹوٹ چکی۔ دروازہ کھلنے کی وجہ سے کچھ بوریاں سڑک پر گری ہوئی ہیں۔ پھر سارجنٹ سے کہا ”جناب! بہتر ہوگا آپ ادھر چل کر خود دیکھ لیں۔“

مرنی اور پولیس والے ٹرک کے پچھلی جانب پہنچے۔ سڑک پر تقریباً ایک درجن بوریاں گری پڑی تھیں۔ کچھ پھٹ بھی گئی تھیں۔ ان سے بھورے رنگ کی کھاد باہر گری پڑی تھی۔ سپاہی نے نارنج لکائی..... بوریوں پر روشنی ڈالی۔ پچھی بوریوں کے درمیان مشین شکن اور راکٹ لانچروں کی ٹائلیں چمک رہی تھیں۔ سارجنٹ نے فوراً اپنی پستول نکال کر مرنی کی طرف کر دیا۔

مرنی کے پیٹ میں تلخ اٹھنے لگے۔ وہ بے حال ہو کر سوچنے لگا کہ نہ صرف وہ شراب کی ۹۹ بزار بوتلیں حاصل کرنے میں ناکام رہا، بلکہ اب کسی اور کی باا بھی اس کے سر پر آ پڑی تھی۔ دراصل لیام کارک شمالی آئر لینڈ میں مصروف کار ایک انتہا پسند تنظیم کے لیے غیر قانونی ہتھیار لا رہا تھا۔

مرنی نے دونوں ہاتھ سارجنٹ کے آگے بڑھا دیے۔ وہ ایک گڑھے میں جا گرا تھا جہاں سے اسے نیل کی سلاخیں صاف نظر آنے لگی تھیں۔

ٹرک کے تالے توڑے جا چکے تھے۔ ان لوگوں نے دروازہ بند کر کے کنڈی میں لکڑی کے ٹکڑے لگا دیے تاکہ وہ بند رہے۔ مرنی ٹرک میں بیٹھا اور نکل گیا۔ بقید افراد بھی اپنا کام کر کے کار میں اپنی منزل پر روانہ ہو گئے۔

اس وقت رات کے دس بجے تھے۔ گھپ اندھیرے میں مرنی پتلی سڑک پر جا رہا تھا جس کے ارد گرد درخت استادہ تھے۔ مرنی کی بد قسمتی کہ ٹریکٹر ٹرائی سوار ایک کسان اچانک اس کے سامنے آ گیا۔ ٹریکٹر کی دونوں چٹیاں خراب تھیں۔ پیچھے فرالے پر ۱۰ ارٹن وزنی بھوسے کی گائلیں لدی ہوئی تھیں۔ مرنی کا ٹرک سڑک کے مین درمیان چل رہا تھا۔

جب اچانک اس نے سامنے ٹریکٹر دیکھا تو فوراً روک دیا۔ بڑے ٹرکوں کا ایک مسئلہ یہ ہے کہ اگر اچانک انہیں روکا جائے تو پیچھے والا حصہ گھوم کر پہلو میں آ جاتا ہے۔

سڑک پتلی تھی لہذا ٹرک دونوں طرف کی دیواروں سے ٹکراتا آگے بڑھتا گیا۔ یہ دیواریں کیمت محفوظ کرنے کے لیے بنائی گئی تھیں۔ ٹریکٹر کے ڈرائیور نے موقع پاتے ہی گاڑی ایک کیمت کی طرف موڑ دی لیکن اس کی ٹرائی سڑک پر ہی رک گئی۔ چنانچہ ٹرک زوردار انداز میں ٹرائی سے جا ٹکرایا۔ جھٹکے سے ٹریکٹر ڈرائیور مٹی میں جا گرا۔ بھوسے کی گائلیں ہوا میں اڑ کر سڑک کے چاروں طرف پھیل گئیں۔

ٹرک کا پچھلا دروازہ بھی جھٹکے سے کھل گیا اور کھاد کی کئی بوریاں سڑک پر جا پڑیں۔

مرنی حواس باختہ ہو گیا۔ اس کے ذہن میں بس یہی خیال تھا کہ جتنی جلد ہو سکے، یہاں سے دور چلا جائے۔ یہ سوچ کر وہ ٹرک سے اتر ا۔ ادھر کسان بھی اٹھا اور ٹرک کی جانب لپکا۔

مرنی کی بد قسمتی کہ عین اس وقت سامنے سے ایک پولیس کار آتی نظر آئی۔ وہ ٹرائی کے پاس رک گئی۔ اس میں ایک سارجنٹ مع سپاہی سوار تھا۔ وہ دن بھر کا کام مکمل کر کے واپس پولیس اسٹیشن جا رہے تھے۔ حادثہ دیکھ کر دونوں نیچے اتر آئے۔ سارجنٹ نے پھر مرنی سے کاغذات لیے،

ان کا مطالعہ کیا اور پھر پوچھا ”تمہارا نام لیام کارک ہے؟“

۱۹۰

آؤ ڈائجسٹ مارچ ۲۰۱۲ء





خاٹ کام

لیجے! آپ کے سر پر ہیلمٹ رکھ کر ہم نے آپ کی یہ مشکل حل کر دی۔ آپ ناحق کبھی گرم کبھی سرد پانی کے ٹپ میں بیٹھ کر سوچ بچار کرتے رہے اور بلخ کو آپ نے الگ پریشان کر دیا۔ جی ہاں! کوئلے کی وہ پستنی پروڈکٹ سپلائر ہے جہاں سے آپ کو ہیلمٹ سے لیکر کور آل تک، اسٹیکٹیکل سے لیکر ماسک تک اور فیلڈ گلووز سے لیکر پستنی شوئز تک تقریباً تمام پروڈکٹس مل سکتی ہیں وہ بھی خدمت ریش پر۔



Supplier Of Industrial Safety Products

First Floor, Aslam Arcade, 16-Mcleod Road, Lahore. Ph: 37314287-88

عربی
ادب

عہد بنو امیہ کا ایک
محیر العقول واقعہ

سزا

ایک متول تا جر پر اپنے ہی گھوڑے
کو بے دردی سے پیسنے کا جرم
ثابت ہونے کو تھا

فاطمہ انیسام

نظم

www.Pahsociety.com

ایک

بار علیہ وقت ہارون رشید کے
دربار میں بغداد شہر کے ایک
مقبول تاجر سعدی نعمان کو پیش کیا
گیا۔ سعدی پر اپنے گھوڑے کو
انتہائی بے دردی سے پیٹنے کا الزام تھا۔ اس دور میں
معمولی سے معمولی جرائم پر بھی شاہ و گدا میں امتیاز روا نہیں
رکھا جاتا تھا۔

ہارون: سعدی جیسا کہ میرے علم میں آیا، تم نے کل
شام اپنے گھوڑے کو نہایت بے دردی سے مارا۔
بے شک میں نے اپنی زندگی میں بے شمار گھوڑوں کو پیٹتے
دیکھا۔ اور خود بھی چند گھوڑوں کو ان کی سرکشی پر سزا دی
مگر ایک بے زبان کو اس قدر بے دردی سے پیٹنا..... اگر
مجھے علم نہ ہوتا کہ تم فطری طور پر ایک رحم دل شخص ہو تو میں
تجسس تمہارے ظلم کا بدلہ چکھا دیتا۔

سعدی سلطان کے قدموں میں گرتے ہوئے
”خليفة عالي! مجھے معاف فرما دیں۔ میں مجبور تھا۔ اگر آپ
مجھ سے حقیقت سنیں تو مجھے یقین ہے کہ آپ مجھے ضعیف
سے درگزر فرمائیں گے۔“

خلیفہ: اگرچہ دربار کا وقت ختم ہو چکا مگر ہم تمہاری
کہانی سننا چاہتے ہیں۔ تم ہمارے ساتھ آؤ۔

خلیفہ محل کے اندر چلا جاتا ہے۔ سیاسی سعدی کو
پکڑے خلیفہ کی تھلید میں چلتے ہیں۔ سعدی کی حالت اس
قابل نہیں کہ وہ کچھ بول سکے۔ محل میں ایک پُر سکون جگہ
سجی بیٹھ گئے۔

خلیفہ: ہاں! اب مجھے بتاؤ تم پر کیا ہوتی؟
خوف کے مارے سعدی کے منہ سے بے ربط جملے ادا
ہونے لگے۔

خلیفہ: میرے دوست پریشان مت ہو، مجھے تم ہر لحاظ
سے رحم دل پاء گے۔ میں تمہاری خطا معاف کرتا ہوں۔
اب اطمینان سے مجھے اپنی سرگزشت سناؤ۔

سعدی: خلیفہ عالی، میں کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا
کروں۔ میں پوری کوشش کروں گا کہ اپنی آپ بیتی سچ

سناسکوں۔ میں پیدائش اور بچپن کے متعلق بتا کر آپ کا
جیتی وقت ضائع نہیں کروں گا۔ بس اتنا ضرور ہے کہ جب
میرے والدین مرے تو میرے لیے اتنا مال چھوڑ گئے کہ
میں ایک خوش حال زندگی کا آغاز کر لیتا۔

میں نے تجارت شروع کر دی۔ میری زندگی خوشحال
گزر رہی تھی، صرف یہ تھی تو ایک اطاعت گزار بیوی کی!
کسی دور کے رشتہ دار کے توسط سے میری شادی ایک تاجر
کی بیٹی آمنہ سے ہو گئی۔

جیسا کہ آپ کے علم میں ہے، ہمارے معاشرے
میں شادی وہ انجان لوگوں کو ملا کر انہیں زندگی گزارنے کا
نام ہے۔ یہ زندگی پُر سکون ہو سکتی ہے اگر عورت اور مرد
متوازن شخصیت کے حامل ہوں۔

شادی کے بعد میں نے جب میری پہلی نظر بیوی
پر پڑی تو قدرت کی صنائی کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ مگر
انہوں نے آنے والے ہردن نے میرے صبر کا امتحان لیا اور
مجھے تحفے دنا تو ان کو ڈالا۔

شادی کے دوسرے دن میں نے پُر تکلف دعوت کا
انتظام کیا۔ اس میں شہر کے رؤسا اور ان کی بیویوں کو مدعو
کیا۔ مگر کھانا شروع ہونے پر میری بیوی چلی گئی۔ میں نے
نو کروں کو فوراً اسے بلوانے بھیجا۔ بڑی پس و پیش کے بعد وہ
لوٹی تو میں نے اسے کھانے میں شرکت کرنے کا حکم دیا۔

مگر یہ دیکھ کر میری حیرانی کی انتہا نہ رہی کہ آمنہ
ایک ملائی کی مدد سے چاولوں کا دانہ دانہ چن کر کھانے
لگی۔ تمام لوگ حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔ میں نے
غصے سے کہا ”آمنہ! یہ کیا حرکت ہے، لوگ کیا سوچیں
گئے؟ کیا تم گھر میں بھی پونہی کھانا کھاتی تھی۔“ میرے
ڈانٹنے پر وہ کھانا چھوڑ کر چلی گئی۔

آنے والے دنوں میں بھی اس کی یہی عادت رہی۔
جتنی خوراک وہ کھاتی تھی، اس سے زیادہ تو ایک چڑیا
کی خوراک ہوتی ہے۔ میں نے اس کے لیے طرح
طرح کے مزیدار کھانے پکوائے مگر اسے زیادہ کھانے پر
رضا مند نہ کر سکا۔

مسکراہٹ

بڑا مسکراہٹ کے لیے کوئی قیمت ادا نہیں کی جاتی لیکن اس کے بہت سے فائدے ہیں۔

بڑا اس کو پانے والا مالا مال ہو جاتا ہے مگر دینے والا مفلس نہیں ہوتا۔

بڑا مسکراہٹ خریدی نہیں جاسکتی اور نہ ہی اس کی بیک مانگی جاسکتی ہے۔

بڑا مسکراہٹ نہ تو پوری کی جاسکتی ہے اور نہ ہی اوجہار میں ملتی ہے۔

بڑا اگر آپ ہر دل عزیز بنا چاہتے ہیں اور خواہش ہے کہ ہر کوئی آپ سے خوش رہے تو ہمیشہ مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر بکھیر کر رکھیے۔

(شمیت فیروز، ملتان)

میں حیران تھا کہ وہ اتنا کم کھانے کے باوجود زندہ کیسے ہے؟ چنانچہ شب و روز اسی کوشل میں رہتا کہ کسی طرح اس راز سے پردہ اٹھے۔

ایک رات جب میں اور آمنہ سو رہے تھے، اچانک میری آنکھ مل گئی۔ تب میں نے آمنہ کو قطعی دروازے سے باہر نکلنے دیکھا جو اس نے نہایت ہوشیاری سے رات کو کھانا چھوڑ دیا تھا۔ میں بھی بغیر آواز پیدا کیے، اس کے تعاقب میں چل دیا۔

آمنہ قریبی قبرستان کی دیوار چھانہ کر اندر داخل ہو گئی۔ میں خوف کے مارے کاٹتا ہوا ایک بھاڑی کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ میں نے آمنہ کو ایک چڑیل کے ہمراہ آتا دیکھا۔

خلیفہ عالی! جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ یہ چڑیلیں بیابانوں میں رہتی ہیں اور انسانوں کا گوشت کھانے سے گریز نہیں کرتیں۔ اسے عفریت کے ساتھ دیکھ کر خوف کے مارے میرے روتے کھڑے ہوئے مگر میں بے سوج بزار رہا۔

ان دونوں نے میرے سامنے ایک جلی قبر کھودی۔ پھر ایک تازہ لاش نکال کر کھانے لگیں جو غالباً اسی دن دفن کی گئی تھی۔ اس کے بعد وہ قبر پر سٹی ڈالنے لگیں۔

موقع پاکر میں سرپٹ دوڑا اور گھر پہنچ کر بی دم لیا۔ مگر اب میری نیند اڑ چکی تھی اور پوری رات میں اس معاملے کا حل سوچتا رہا۔ آخر میں نے خود آمنہ سے بات کرنے کی ٹھانی۔

اگلے روز کھانے کے دوران میں نے آمنہ سے استفسار کیا "آمنہ! جب سے تم آئی ہو، میں نے دیکھا ہے تم بہت کم کھانا کھاتی ہو۔ میں نے دنیا جہان کے لذیذ کھانے تمہارے سامنے لا کر رکھے مگر تم نے ان کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ مجھے انہوں نے کہ میں تمہارے لیے تازہ انسانی گوشت فراہم نہیں کر سکتا۔"

یہ سنتے ہی جیسا کہ میرا خیال تھا، آمنہ طیش میں آگئی۔ غصے کی شدت سے اس کا چہرہ سیاہ پڑ گیا اور آنکھیں یوں باہر کوہل آئیں کہ ابھی گر جا سکتی تھیں۔

"تمہاری بے جرأت کہ تم نے میری یہ حرکت دیکھی۔ احمق انسان، میں تمہیں اس کا مزہ چکھا دوں گی۔" یہ کہہ کر اس نے قریب پڑا پانی کا برتن اٹھایا اور اس میں ہاتھ ڈال کر کچھ پڑھنے کی جیمیری سمجھ سے ہلاتا رہا۔

"میں تمہیں انسان نہیں رہنے دوں گی۔" یہ کہہ کر وہ پانی میرے چہرے پر چھڑک دیا۔

میں نے محسوس کیا کہ میرا بدن تھل تھل ہو رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد میں ایک کتے میں تبدیل ہو چکا تھا۔ آمنہ نے ایک مشہور انگریزی اخبار مجھے اس شدت سے پڑنا شروع کر دیا کہ مارے درد کے میرے منہ سے چیخیں نکلنے لگیں۔

آخر اس نے مجھے ایک خوفناک سزا دینے کا فیصلہ کیا۔ اس نے مرکزی دروازہ کھول دیا۔ مگر میں اس کی تدبیر سمجھ گیا اور اس قدر تیزی سے باہر بھاگا کہ آمنہ نے جب نہایت زور سے دروازہ بند کیا تو صرف میری دم ہی بیچ میں آئی۔ اگر میں ذرا سی بھی سستی دکھاتا تو میرا پچھتاہا محال تھا۔

عورت کا مارے حیرت کے منہ کھلا کا کھرا رہ گیا۔ دکاندار نے تو محض مذاق میں یہ کہا تھا مگر یہ دیکھ کر وہ نہایت حیران ہوا۔ اس دن سے یہ بات سارے شہر میں پھیل گئی کہ اس دکاندار کے پاس ایک ایسا کتا ہے جو برے سکون کی تیز کر سکتا ہے۔ اس دن سے آہی کی دکانداری کو چار چاند لگ گئے اور میری خاطر عداوت میں بھی اضافہ ہو گیا۔ مگر کچھ لوگ اس سے جلنے لگے چنانچہ میرا مالک ہمیشہ مجھ پر نظر رکھتا۔

ایک دن ایک عورت اس کی دکان پر آئی۔ تب میں ایک کونے میں بیٹھا ہڈی سے کھیل رہا تھا۔ وہ بولی ”میں نے سنا ہے کہ آپ کے پاس ایسا کتا ہے جو اچھے اور خستہ حال سکون کی تیز کر سکتا ہے۔“ مالک نے ہاں میں سر ہلا دیا۔ عورت نے چند نئے نکال کر رکھے۔ مالک نے مجھے اشارہ کیا اور معمول کے مطابق میں نے ہراسہ نکال کر طعہ کر دیا۔

عورت یہ دیکھ کر نہایت حیران ہوئی اور مالک سے اصرار کرنے لگی کہ یہ کتا اسے دے دو اور بدلے میں منہ مانگی رقم لے لو مگر مالک نے انکار کر دیا۔ قصہ مختصر اس نے کچھ خریداری کی اور چلنے لگی۔

کچھ دور جا کر وہ مری اور مجھے اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ میں کفٹش میں تھا کہ اس کے ساتھ جاؤں۔ کچھ دور جا کر وہ پھر مری اور میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے چپکے سے اپنی جگہ چھوڑی۔ مالک رقم گننے میں مصروف تھا لہذا اس کے علم میں میری یہ حرکت نہ آ سکی۔

میں اس عورت کے پیچھے چلتا رہا۔ چلتے چلتے آخر کار وہ ایک مکان کے مرکزی دروازے پر رکی۔ میری کمر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور دروازہ کھٹکھٹانے لگی۔ دروازہ اس کی بیٹی کی کھولا۔ وہ مجھے اندر لے آئی۔ اس عورت کی ۲ بیٹیاں تھیں۔ وہ اپنی چھوٹی بیٹی سمیعہ سے کہنے لگی:

”بیٹا! میں نے جب سے اس کتے کے بارے میں سنا تھا، مجھے یقین ہو چلا کہ ہو سکتا ہے یہ کوئی انسان ہو۔ آج جب اس نے میرا اشارہ سمجھ کر میرے ساتھ چلنے کا ارادہ

کو اب میں آزاد تھا مگر میری دم سے وردی ناقابل برداشت تھیں رسی تھیں۔ وردی شدت سے میں نے بھونکنا شروع کر دیا جس پر بغداد کے مٹکی کوچوں سے کتے بھونکتے ہوئے میرے گرد جمع ہو گئے اور مجھ پر بھینٹنا شروع کر دیا۔ میں وہاں سے بھاگا۔ قریب ہی ایک رحم و شفقت کی دکان تھی جو گوشت کا کاروبار کرتا تھا۔

اس نے نہ صرف مجھے ان کتوں سے نجات دلوائی بلکہ مجھے اپنی دکان کے اندر لے آیا۔ میں نے بھاگ کر ایک کونے میں پناہ لے لی اور اس کے پکارنے پر بھی باہر نہ آیا۔ دو رات میں نے محفوظ گزار۔ اگلی صبح جب وہ شخص کتوں کو سمجھنے والے ڈال رہا تھا تو میں باہر نکلا۔ اس رحم دل نے یہ جانتے ہوئے کہ میں کل سے بھوکا ہوں، میری طرف گوشت کا ایک بڑا ٹکڑا پھینکا۔ اسے کھانے کے بعد میں مزید کی طلب میں بڑھا تو اس نے ڈنڈے سے مجھے بھگا دیا۔

چلتا چلتا میں ایک حلوائی کی دکان پر پہنچا جو فطرتاً ایک اچھا انسان تھا۔ اس نے مجھے کھانے کے لیے روٹی کا ٹکڑا پھینکا۔ اگرچہ مجھے بھوک تھی پھر بھی میں نے اسے خلاف آداب سمجھتے ہوئے روٹی کا ٹکڑا کھالیا اور پیار سے اپنا جسم اس کی ناگوں سے رگڑنے لگا۔

وہ شخص مجھے اپنے گھر لے آیا۔ اب میری زندگی کے دن پر سکون تھے۔ وہ شخص میرے کھانے اور آرام کا پورا خیال رکھتا اور بدلے میں میں بھی اس کی فرمانبرداری میں کوئی کسر نہ اٹھا کرتا۔

ایک دن ایک عورت اس کی دکان پر آئی اور روٹی کے بدلے اسے چند نئے پیش کیے جن میں سے ایک مسکہ نہایت خستہ حالت میں تھا۔ دکان دار نے وہ مسکہ لینے سے انکار کر دیا۔ مگر عورت اپنی بات پر اڑی رہی کہ یہ مسکہ درست ہے۔ آخر فیصہ میں آکر وہ بولا ”مختصر مدت اٹا تو میرا کتا بھی بتا دے گا یہ مسکہ خراب ہے“ اور مجھے اشارہ کیا۔

میں چھلانگ لگا کر چار بارے پر چڑھ آیا۔ کچھ دیر سکون کو سمجھا اور خراب مسکہ اٹھا کر جتنے میں دالیا۔ دکاندار اور

تو نے بھی.....

ایک کواروٹی کا ایک کھڑا لیے درخت کی ٹہنی پر بیٹھا تھا۔ ایک لومڑی کا لڑا اوسر سے ہوا۔ اس کے منہ میں پانی بھرا آیا۔ سوچا کوئی ایسی ترکیب کی جائے کہ یہ چوٹی کھول دے اور روٹی کا ٹکڑا میں بچھٹ لوں۔ پس اس نے مسکین صورت بنا کر کہا ”اے کوئے یہاں سلام۔ تیرے حسن کی کیا تعریف کروں۔ کچھ کہتے ہوئے جی ڈرتا ہے۔ واہ واہ چوٹی بھی کافی، پر بھی کاٹے۔ آج کل تو دنیا کا مستقبل کالوں ہی کے ہاتھوں میں ہے۔ افریقہ میں بھی بیداری کی لہر دوڑ گئی ہے لیکن تیرے سیاست کی باتیں ہیں۔ آدم ہر مطلب! میں نے تیرے گانے کی تعریف سنی ہے۔ تو اتنا خوبصورت ہے۔ گانا بھی اچھا گاتا ہوگا۔ مجھے گانے سننے کا شوق یہاں تکھیٹ لایا ہے۔ ہاں تو ایک آدھ گھنٹہ ہو جائے۔ کوا پھولا نہ سنا لیکن سیانے پن سے کام لیا۔ روٹی کا ٹکڑا منہ سے نکال کر بیٹھے میں تھا اور لگا کائیں کائیں کرنے۔ بی لومڑی کا کام نہ بنا تو یہ کہتی ہوئی چل دی ”بہت تیری کی بے سراسر اماند معلوم ہوتا ہے تو نے بھی حکایت اتمان پڑھ رہی ہے۔“

(حکایت اتمان سے اقتباس)

کیا تو میرا شک یقین میں بدل گیا۔ اب تمہارا یہ فرض ہے کہ تم اس مصیبت زدہ کو اس کی مصیبت سے نجات دلوا دو۔“

سمیعہ پانی سے بھرا گلاس لے آئی اور اس میں ہاتھ ڈال کر کچھ پڑھنے لگی، بالکل اسی طرح جیسا کہ میں پہلے دیکھ چکا تھا۔ پڑھنے کے بعد وہ بولی:

”اس منتر کی بدولت، اگر یہ کتاب واقعی انسان ہے تو اس کو انسان بن جانا چاہیے۔“

یہ کہہ کر اس نے مجھ پر پوسٹ ماری۔ میں واقعی دوبارہ اپنی اصلی حالت پر واپس آیا اور اس بوڑھی عورت کے قدموں میں گر گیا۔ مجھے الفاظ نہیں مل رہے تھے کہ میں ان کا شکریہ کیسے ادا کروں۔

سمیعہ بولی ”تمہاری بیوی آمنہ اور میں ایک ہی عتبہ میں جادو کا علم حاصل کرتی رہی ہیں۔ مگر ہم بھی اچھی دوست نہ بن سکیں کیونکہ آمنہ شروع سے ہی بد مزاج واقع ہوئی تھی۔“

سمیعہ نے ایک اور گلاس میں کچھ پڑھ کر چھوٹا اور مجھے دیتے ہوئے بولی ”یہ پانی تم اپنی بیوی کے منہ پر چھڑک دینا تاکہ اس کو اپنے لیے کی سزا ملے۔“

میں دو پانی لے کر گھر آ گیا۔ آمنہ مجھے دیکھ کر بکا بکا رو گئی اور دروازے کی طرف بھاگی مگر میں نے اسے موقع دیے بغیر پانی اس کے منہ پر چھڑک دیا۔ آنا فانا وہ گھوڑے میں تہل تہل ہو گئی۔

اب مجھے بتائیے خلیفہ عالی کہ میں اس ظالم، سرکش اور نافرمان بیوی کے ساتھ کیسا سلوک کروں؟ ایسی بات ہے جس نے مجھے اس تشدد پر مجبور کیا ہے۔

بارون رشید: میرے دوست، میں مانتا ہوں کہ واقعی تمہارے ساتھ بہت برا ہوا۔ میں تمہیں ہرگز یہ حکم نہیں دوں گا کہ تم بوڑھی عورت کی بیٹی ڈھونڈ کر اپنی بیوی کو دوبارہ اپنی اصلی حالت میں لے آؤ کیونکہ وہ دوبارہ جادو کے زور سے خلق خدا کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گی۔ مگر میں تم سے انتظار رکھوں گا کہ اس کے ساتھ ظلم کا رویہ ہرگز اختیار نہ کرو۔ یاد رکھو! جو شخص اختیار کے باوجود ظلم کا

رویہ اختیار نہیں کرتے تو خدا اس شخص سے محبت کرتا ہے۔

حدی: یا خلیفہ المسائین! میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کے حکم پر دل و جان سے عمل کروں گا۔

اس دن کے بعد دیکھنے والوں نے دیکھا کہ سعدی اتمان دن رات اپنے گھوڑے کی خاطر تواضع میں مصروف رہتا اور اس کے آرام میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت روا نہ رکھتا۔ اُس نے اپنی آدم خور بیوی کی سراسیمگی کی کردی تھی۔

(عرب سرائیکی داستان الف لیلا سے ماخوذ)



ادبی روئی

ڈکھ پنچپانے والوں کو معاف کرنا
کبھی بھی آسان نہیں ہوتا

رہائی

ایک حوصلہ مند قیدی کی رہائی کا عجب واقعہ
وہ جیل سے رہا ہونے میں دلچسپی نہیں رکھتا تھا



یہ داستان
پیشکش ہے

www.Paksociety.com

دوس

گئے والد بیکر نامی گاؤں میں
ایکسیف نامی تاجر رہتا تھا۔
وہ مختصر الے بالوں، کھلتی سفید
رنگت والا خوبصورت نوجوان

تھا۔ دو دکانیں اور ایک گھر اس کی ملکیت تھا۔ بس کچھ اور
گانے کا بہت شائق تھا، مگر میں جھگڑے سے ہی اسے
شراب کی لت پڑ گئی۔ جب کبھی زیادہ پی لیتا تو تھوڑا بیک
سا جاتا۔ مجب التفاق کہ شادی کے بعد اس نے شراب پینا
ایک دم ترک کر دیا۔ البتہ کبھی بیکھار کی تقریب پر پی لینے کو
برا خیال نہ کرتا۔

موسم گرما کی ایک صبح میلہ منڈی جانے کے ارادے
سے جب وہ اپنے اہل خانہ کو خدا حافظ کہنے لگا تو اس کی
بیوی بولی "ایکسیف آج سفر پر روانہ نہ ہوں۔ میں نے
تمہارے متعلق ایک برا خواب دیکھا ہے۔"
ایکسیف مسکرا کر بولا "بھینس شاید یہ ڈر ہے کہ میں

کبیں میلے میں پینے پلانے میں محو ہو جاؤں گا۔"
بیوی نے کہا "یہ تو میں نہیں جانتی کہ مجھے کس بات کا
ڈر ہے، البتہ میں نے ایک برا خواب دیکھا ہے کہ آپ
نے شہر سے واپس آکر نوپنی اتاری تو آپ کے بال سفید
ہو چکے تھے۔"

ایکسیف ہنس کر بولا "یہ تو خوش بختی کی نشانی ہے۔
دیکھو اگر میں اپنی تجارتی اشیاء فروخت نہیں کروں گا تو میلے
سے تحفے کیسے لاؤں گا؟" پھر اس نے اہل خانہ کے لیے
ٹیک تمناؤں کا اظہار کیا اور سفر پر روانہ ہو گیا۔

ابھی تقریباً نصف سترے لیا ہو گا کہ اس کی ملاقات
ایک پرانے واقف کار تاجر سے ہو گئی۔ دونوں ایک ہی
سرائے میں رکے۔ مل بیٹھ کر چائے پی اور اپنے اپنے
کمروں میں آرام کی غرض سے چلے گئے۔ ایکسیف کو دیر
تک سونے کی عادت نہ تھی۔ ویسے بھی وہ خشک سویرے
ہی سفر شروع کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ گہروم اپنے ملازم کو
بیدار کیا اور کھوڑے تیار کرنے کا کہہ کر سرائے کے مالک
کی طرف چلا گیا۔ وہ سرائے کے عقب ہی میں رہتا تھا۔

وہاں بن ادا کیا اور سفر پر روانہ ہو گیا۔

۲۵ سترے کا سترے کرنے کے بعد وہ کھوڑوں کو چارو
کھلانے ایک سرائے پر رکا۔ کچھ دیر سرائے کی راہداری ہی
میں سستانے کے بعد وہ پوربج میں بیٹھا، چائے کے لیے
سماوار گرم کرنے کا کہا اور اپنی شمار کمال کر بھانے لگا۔

اچانک کھنٹیاں بجائی ۳۳ کھوڑوں والی ایک بھٹی آکر
رکی جس میں سے ایک افسر اور ۲ چہائی اترے۔ افسر نے
ایکسیف کے پاس آتے ہی دریافت کیا کہ وہ کون ہے؟
اور کہاں سے آیا ہے؟ ایکسیف نے اس کے سوالات
کے جوابات دیے اور کہا کہ "آپ میرے ساتھ چائے
پیں گے؟"

مگر افسر نے جرج کے انداز میں اس سے پوچھا
"گزشتہ شب آپ نے کہاں بسر کی تھی؟ کیا آپ جہا تھے یا
آپ کا قیام سامھی تاجر کے ساتھ تھا؟ کیا آپ اس صبح
سامھی تاجر سے ملے؟ آپ سرائے سے سورج نکلنے سے
پہلے ہی کیوں روانہ ہوئے؟"

ایکسیف جرج ان ہوا کہ اس سے یہ سوالات کیوں
پوچھتے جا رہے ہیں۔ اس نے تمام سوالات کے مبسوط
جوابات دیے۔ مگر یہ ضرور پوچھا "آپ مجھ پر یہ جرج
کیوں کر رہے ہیں؟ جیسے کہ میں کوئی چور یا لیرا ہوں؟"

افسر نے اپنے دونوں سپاہیوں کو بلایا اور کہنے لگا
"میں اس شلع کا پولیس افسر ہوں۔ میں نے یہ سوالات
اس لیے کیے کہ وہ تاجر جس کے ساتھ آپ نے سرائے
میں رات گزار لی تھی، اپنے بستر میں مردہ پایا گیا ہے۔ اس کا
گلا گنا ہوا تھا۔ اب مجھے آپ کے سامان کی تلاش کرنی ہے۔"
وہ پھر تینوں کمرے میں داخل ہوئے۔ انھوں نے
ایکسیف کا بندھا سامان کھولا اور تلاشی لی۔ اچانک افسر
نے بیک سے ایک چاقو نکال کر بلند کیا اور چیخ کر کہا "یہ
کس کا ہے؟"

ایکسیف یہ دیکھ کر خوفزدہ ہو گیا کہ ایک خون آلود
چاقو اس کے بیک سے برآمد ہوا ہے۔
"اس چاقو پر تو خون ہے؟" افسر نے گرج کر کہا۔

ایکسیف نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر بڑی مشکل سے صرف یہ کہہ پایا ”مجھے نہیں معلوم..... یہ میرا نہیں.....“ پولیس افسر بولا ”صبح تاجر اپنے کتے ہوئے گلے کے ساتھ بستر میں پایا گیا۔ اب صرف تم ہی ہو سکتے ہو جس نے یہ کام کیا۔ سرائے کو اندر سے تالا لگا ہوا تھا اور کوئی دوسرا بھی وہاں موجود نہیں تھا۔ خون آلود چاقو آپ کے بیگ سے برآمد ہوا ہے۔ آپ کا چہرہ اور محتاط آپ کا ساتھ نہیں دے رہے۔ مجھے صرف یہ بتائیے کہ آپ نے اس تاجر کو کس طرح قتل کیا اور کتنی رقم چرائی۔“

ایکسیف نے قسم اٹھاتے ہوئے کہا کہ اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے تاجر کے ساتھ مل کر صرف چائے پی تھی۔ پھر اسے دیکھا تک نہیں۔ اس نے مزید کہا کہ اس کے پاس صرف آٹھ سو روپے ہیں جو اسی کے ہیں اور چاقو ہرگز اس کا نہیں۔ لیکن اس کی آواز شکستہ اور چہرہ زرد تھا۔ وہ خوف سے اس طرح کانپ رہا تھا جیسے وہ دہائی جرم ہو۔ پولیس افسر نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ ایکسیف کو باندھ کر کتھی میں ڈال دو۔ جب انھوں نے پاؤں باندھ کر اسے کتھی میں پھینکا تو ایکسیف نے بے بسی کے عالم میں کہا ”یا اللہ رحم“ اور رو پڑا۔ اس کے پاس جو رقم اور سامان تھا، وہ لے کر اسے نزدیکی ٹیل بیچ دیا گیا۔ گاؤں والہذیمیر سے اس کے کردار کے متعلق تحقیق و تفتیش کی گئی تو لوگوں نے کہا کہ کسی زمانے میں وہ شراب کا رسیا تھا اور یوں کچھ توضیع اوقات کر لیتا تھا مگر تھا بھلا مانس!

بعد ازاں مقدمہ کا آغاز ہوا اور فرد جرم مرتب ہوئی۔ اس کے مطابق ایکسیف پر الزام عائد ہوا کہ اس نے ریزان نامی تاجر کے ۲۰ ہزار روپے لوٹے اور اسے قتل کر دیا۔

اس کی بیوی پر سراسیمگی طاری تھی، اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا نتیجہ اخذ کرے۔ اُن کے بچے ابھی بہت چھوٹے تھے۔ سب سے چھوٹا تو ابھی شیرخوار تھا۔ اس نے بچوں کو ساتھ لیا اور ایکسیف کے پاس ٹیل بیچ لی۔ پہلے تو اسے ملنے کی اجازت نہیں ملی۔ لیکن بہت مدت سماجت کے بعد اس کی بیوی پر سراسیمگی طاری تھی، اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا نتیجہ اخذ کرے۔ اُن کے بچے ابھی بہت چھوٹے تھے۔ سب سے چھوٹا تو ابھی شیرخوار تھا۔ اس نے بچوں کو ساتھ لیا اور ایکسیف کے پاس ٹیل بیچ لی۔ پہلے تو اسے ملنے کی اجازت نہیں ملی۔ لیکن بہت مدت سماجت کے بعد

ایکسیف کو پہلے کوڑے لگے۔ جب کوڑوں کے دھم مندل ہو گئے تو اسے دوسرے قیدیوں کے ساتھ سانبھریا

۲۰۰ اردو ڈائجسٹ مارچ ۲۰۱۲ء

ننہ گھر کی فرمائش

ایک لڑکی کی شادی ہوئی تو اس کے شوہر نے پوچھا "تم نے گھر کی فرمائش تو نہیں کرو گی؟"
 "نہیں بی! میں ایسی دسکی لڑکی نہیں ہوں،
 آپ اپنی امی کو نیا گھر لے دیجیے۔" لڑکی نے جواب دیا۔
 (ماٹھو سیما، لاہور)

بجوا دیا گیا۔

"آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟" کسی نے دریافت کیا۔

"والد بیکر کا۔ میرا خاندان وہیں کاربائی ہے۔ میرا نام مارکسیم ہے اور مجھے سیمو بھی کہتے ہیں۔"

ایکسیف اپنے گاؤں کا نام نہ کر چکے تھے۔ اس نے سر اٹھاتے ہوئے پوچھا "سیمو؟" یہ بتایا کہ کیا آپ ایکسیف تاجر کے بارے میں کچھ جانتے ہیں؟ اور کیا اس کے بیٹے زندہ ہیں؟

"یقیناً جانتا ہوں۔" سیمو نے جواب دیا اور کہا "وہ دولت مند ہیں مگر ان کا والد ساکبیر یا میں سے، شاید میری طرح کسی جرم میں۔ دادو! آپ بھی تو بتائیے کہ آپ یہاں کیسے آئے؟"

ایکسیف نے اپنی چٹا ستانا پسند نہ کی اور سر دھو کر بھرتے ہوئے صرف اتنا کہا "اسنے کہاں کی پاداش میں؟"

۲۶ سال سے اس جیل میں ہوں۔

"کون سے گناہ؟" سیمو نے دریافت کیا۔

ایکسیف نے کہا "شاہی میں اسی لائق تھا۔"

وہ مزید کچھ نہیں کہنا چاہتا تھا۔ اس کے ساتھیوں نے نووارد قیدیوں کو بتایا کہ کس طرح کسی نے ایک تاجر کو قتل کر کے چاقو اس کے سامان میں چھپا دیا تھا۔ یوں ایکسیف کو ناقص سزا سنائی گئی۔

جب مارکسیم نے یہ تفصیل سنی تو ایکسیف کی

بجوا دیا گیا۔ اگلے ۲۶ سال تک ایکسیف بطور قیدی ساکبیر یا میں مقیم رہا۔ اس دوران اس کے بال برف کی طرح سفید ہو گئے۔ ڈاڑھی لمبی، پتلی اور بھوری ہو گئی۔ اس کی تمام آنچ اور شادمانی کا جذبہ نابود ہو گئے۔ وہ آہستہ چپکا، کم بولتا اور ہنسنا تو بالکل بھول ہی گیا۔ وہ ہمہ وقت اللہ کے حضور دعا کرتا رہتا۔

جیل میں ایکسیف نے جوئے بنانے کا کام سیکھ لیا۔ چنانچہ اس نے کچھ رقم پس انداز کر کے "حیات صوفیہ" نامی کتاب خریدی جسے وہ جیل میں جب بھی کچھ روشنی بکھر آتی، پڑھ لیتا۔ اتوار کو وہ چرچ میں سبق پڑھتا اور کورس کے کانے میں شمولیت کرتا کہ اس کی آواز اب تک نہایت سرلی تھی۔

جیل انتظامیہ اس کی نرم روی کے باعث اسے بہت پسند کرتی تھی۔ ساتھی قیدی بھی احترام اور عزت کی نظر سے دیکھتے۔ وہ ہمیشہ اسے دادو یا صوفی کہہ کر پکارتے۔ جب کبھی انھیں جیل انتظامیہ سے کوئی مطالبہ کرنا ہوتا، وہ ایکسیف کو اپنا نمائندہ منتخب کرتے۔ کسی جھگڑے یا تنازع کی صورت میں بھی اسے ثالث بنایا جاتا۔ اسے گھر سے کبھی خیر و معافیت کی خبر موصول نہ ہوئی۔ اب تو اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کے بیوی بیٹے زندہ بھی ہیں یا نہیں۔

ایک روز جیل میں قیدیوں کا نیا گردہ آیا۔ شام کو پرانے قیدی نئے قیدیوں کے گرد جمع ہو گئے اور ان سے دریافت کرنے لگے کہ وہ کس گاؤں کے رہائشی ہیں اور کس جرم میں آئے۔ ایکسیف بھی وہاں بیٹھا خاموشی سے ان کی گفت و شنید سنتا رہا۔ نووارد قیدیوں میں سے ایک لمبی بھوری ڈاڑھی اور گھٹے ہوئے جسم والا دراز قد ساٹھ سالہ قیدی بھی شامل تھا۔ وہ اپنی داستان سناتے ہوئے بولا "دوست! میں نے صرف گاڑی میں بیٹا گھوڑا کھولا، تو چوری کے جرم میں دھر لیا گیا۔ میں نے بتایا بھی کہ میں نے محض جلدی گھر چھپنے کے لیے ایسا کیا تھا اور چمکو چوان میرا ذاتی دوست تھا لہذا کوئی ارتکاب جرم نہیں ہوا۔ مگر انھوں نے کہا کہ تم نے گھوڑا چھپایا ہے اور مجھے جیل

آیا کہ وہ سرائے کے پارچے میں بیٹھا بڑے مزے سے گنار
بھارا ہاتھ جب اُسے گرفتار کیا گیا۔ پھر اُس کے ذہن میں
وہ منظر گھوم گیا جب اُسے کوڑے لگائے جا رہے تھے۔
بہت سے قیدی جمع ہو کر یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ پھر اُسے
قید میں ۳۶ سال گزارنے کے دوران بہت سی صعوبتوں
اور قسطنطنیہ کی بدولت ہوجانے کا بھی خیال آیا۔ وہ یہ
یادیں سوچ کر اس قدر متحیر ہوا کہ پہلے تو خوشی کرنے
کی شان لی۔ پھر سوچا کہ یہ سب اسی بد معاش شخص کی وجہ
سے ہوا ہے۔ اُسے اس قدر شدید رنج ہوا کہ اُس کے
ذہن میں ہر قیمت پر بدلہ لینے کی خواہش پیدا ہوئی خواہ
جان ہی چلی جائے۔

وہ تمام رات اللہ کے حضور دعائیں کرتا رہا مگر اُسے
طمینان نصیب نہ ہوئی۔ اگلے دن وہ سمیع بیگ کے قریب نہ
پہنچا، اسی طرح ۲۲ ہفتے گزر گئے۔ راتوں کو ایکسٹروف کو نیند
نہ آتی۔ وہ اسی اوجیز بن میں رہتا کہ اُسے کیا کرنا چاہیے۔

ایک دن ایکسٹروف بیل کی راہداری میں چھل قدمی
کرتا رہتا تھا تو اس نے دیکھا، قیدیوں کی جینسنے والی چوٹی
نشت کے نیچے سے مٹی ابھر کر برآمد ہوئی۔ وہ دیکھنے کے
لیے رکا ہی تھا کہ اچانک سمیع بیگ ریٹکتا ہوا چوٹی نشت
کے نیچے سے باہر نکل آیا اور اپنا خونخاک چہرہ لیے
ایکسٹروف کی طرف دیکھنے لگا۔ ایکسٹروف نے توجہ دے
بغیر آگے نکلنے کی کوشش کی تو سمیع بیگ نے اُس کا ہاتھ پکڑ
لیا۔ وہ کہنے لگا کہ اُس نے دیوار کے نیچے سے سوراخ
نکال لیا ہے۔ مٹی کو نکالنے لگے تھے وہ اسے اپنے
لبے پلوں میں بھر لیتا ہے۔ جب قیدی کام کے لیے
جاتے تو وہ مٹی سڑک پر ڈال دیتا۔

”یوڑھے میاں! آپ کو خاموش رہنا ہے۔ اس طرح
آپ بھی یہاں سے نکل جائیں گے۔ اگر آپ نے کسی کو
اس کی بھٹک بھی ڈال دی تو یہ لوگ مجھے کوڑے مار مار کر
ہلاک کر دیں گے۔ مگر اس سے قبل میں آپ کو ہلاک کر
دوں گا۔“

ایکسٹروف اپنے دشمن کو دیکھ کر غصہ سے لرزنے لگا۔

حرف و کلمہ کر دے کہ اُنہا ہاتھ ران پر مارتے ہوئے کہا
”یہ تو عجیب ہے، بہت ہی عجیب بات ہے۔ مگر دادو آپ
کہتے پوڑھے ہو گئے۔“ ساتھیوں نے اس سے دریافت کیا
کہ وہ اس قدر حیران و ششدر کیوں ہوا؟ اور کیا وہ
ایکسٹروف سے پہلے بھی یہیں مل چکا ہے؟ سمیع بیگ نے اُن
کے سوال کا جواب دیے بغیر کہا ”جوانو! میرے لیے
حیران کن ہے کہ تم یہاں ملے ہیں۔“

یہ سن کر ایکسٹروف تجسس ہوا کہ شاید اس شخص کو معلوم
ہو، تاجر کو کس نے قتل کیا تھا۔ اس نے کہا ”سمیع بیگ! شاید
آپ نے سرائے میں تاجر کے قتل ہارے سن رکھا ہے؟“

سمیع بیگ نے جواب دیا ”بھلا میں کیسے سن سکتا تھا؟
دنیا افواہوں سے بھری پڑی ہے۔ کافی عرصہ پہلے مجھے
اڑنی سی خبر ملی تھی مگر یہ بہت عرصہ پہلے کی بات ہے۔ لہذا
میں نے جو سنا تھا، بھول چکا۔“

”شاید آپ نے سنا ہو کہ تاجر کو کس نے قتل کیا تھا؟“
ایکسٹروف نے دریافت کیا۔

ماکر سمیع بیگ نے ہنس کر جواب دیا ”مجھی چاقو
تمھارے بیگ سے برآمد ہوا تھا لہذا تم ہی قاتل ہو گے۔
اگر کسی اور نے چاقو وہاں چھپایا تھا تو بھی اُسے مجرم نہیں کہا
جاسکتا تا وقتیکہ وہ پکڑا جاتا، اور پھر تمھارے بیگ میں کوئی
چاقو کیسے رکھ سکتا تھا، جبکہ وہ تمھارے سر کے نیچے تھا۔ اگر
ایسا ہوتا تو تم یقیناً جاگ جاتے۔“

جب ایکسٹروف نے یہ بات سنی تو اُسے یقین ہو گیا
کہ وہی تاجر کا اصل قاتل ہے۔ چنانچہ وہ گھر پر چلا گیا۔
وہ تمام شب سو نہ سکا۔ وہ بہت افسردہ اور پریشان تھا۔
گزرے وقت کا ایک کے بعد دوسرا منظر اُس کی آنکھوں
کے سامنے آتا گیا۔ اُسے وہ وقت یاد آیا جب وہ گھر سے
سفر کے لیے روانہ ہو رہا تھا اور وہ سب بھی جو بیوی نے کہا
تھا۔ پھر اُسے سچے یاد آئے۔ جب وہ روانہ ہوا تو بہت
چھوٹے تھے۔ ایک نے جب سا پہنا ہوا تھا۔ سب سے چھوٹا
مال کی چھاتی سے چمٹا ہوا تھا۔

پھر اُسے اپنی جوانی کا الہامی پن یاد آیا۔ پھر اُسے یاد

تنہائی

یہی تنہائی جب رینگتی رینگتی مرنے کے آخری حصے میں پہنچتی ہے تو آدمی انسانوں کی بوٹی بچھنے سے قاصر ہونے لگتا ہے، پھر وہ پہلوؤں، جانوروں، دیواروں اور مومنوں سے ڈائلاگ شروع کر دیتا ہے۔ ایک بھرے گھر میں جہاں اس کی سبے پناہ عزت ہوتی ہے جہاں اسے یہ پناہ مان دیا جاتا ہے، وہ اپنے آپ کو ایک پرانی کرسی، ایک اودھ کھلے درختے اور بند کتاب سے قریب تر پاتا ہے۔ اس کی آوازی میں اس وقت مزید اضافہ ہو جاتا ہے جب اس کے بچے اس کے لیے فاورڈزے یا ہارڈزے کا انتہام کرتے ہیں۔

اس کی تنہائی اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب ان کے گھر کے لوگ کسی اہم کام کے سلسلے میں ان سے مشورہ لیتے یا ان کے فیصلوں پر سر جھکا دیتے ہیں۔ اس عمر میں کوئی طویل بیماری ان کی تنہائی کم کرنے میں بڑی مددگار ثابت ہوتی ہے۔ اصل میں عجیب اور ذہم کا ایک ہی ملاں ہے اور وہ ہے تنہائی، مفارقت! اگر کوئی بھی معمولی آدمی تخلیقی قوتوں سے تخلیق کے کرشموں سے آشنائی کا خواہش مند ہو تو اسے ایک طویل مریض کے لیے اپنے آپ کو تنہائی کے حوالے کرنا پڑے گا۔ جب تنہائی اس کا خون بہنے لگی، اس کی صحت تباہ کر دے گی، اس کے غم و افسوس و غم کی طرح چائے اور اس کے ایمان اور خوشی کو گھن بن کر کھا جائے گی تو پھر آہستہ آہستہ اسے تخلیق کا عرفان ہونے لگے گا۔ تخلیق قی عمل کا شعور پیدا ہونے لگے گا۔

(اشفاق احمدی "سفر سوز" سے اقتباس)

اس نے اپنا ہاتھ کھینچے ہوئے کہا "میں فرار ہونے کی کوئی خواہش نہیں رکھتا لہذا آپ کو مجھے ہلاک کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ویسے بھی آپ تو مجھے بہت پہلے ہلاک کر چکے۔ جہاں تک جوانی سلوک کا تعلق ہے، میں ایسا کروں گا یا نہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت پر منحصر ہے۔"

دوسرے روز جب قیدی کام پر جا رہے تھے تو حفاظتی دستے کے سپاہیوں نے دیکھا کہ کسی نے اپنے مٹی بھرے بوٹ سرنگ پر خالی کر رکھے ہیں۔ فوراً چیل کی تلاشی لی گئی تو سرنگ کی نشاندہی ہو گئی۔ گورنر نے موقع پر آ کر قیدیوں سے سوالات کیے تاکہ اس بات کا سراغ لگایا جائے، کس نے سرنگ کھودی ہے۔ سب قیدیوں نے انکار کیا اور جو جانتے تھے، انھوں نے بھی سیمینج کا راز افشاں کیا۔ وہ جانتے تھے کہ حقیقت کھلنے پر سیمینج کو کوڑے مار مار کر ہلاک کر دیا جاتا۔

بالآخر گورنر ایکسیفوف کی طرف متوجہ ہوا جسے وہ منصف مزاج سمجھتا تھا اور کہا "آپ ایک سچے انسان ہیں۔ الذکوہ حاضر ناظر جان کر بتا لے کہ سرنگ کس نے کھودی؟"

سیمینج اعلق سا گورنر کی جانب دیکھتا رہا۔ ایکسیفوف کی طرف سے بھی اس نے بے توجہی ہی برتی۔ ایکسیفوف کے ہونٹ اور ہاتھ کپکپائے اور کافی دیر تک وہ ایک لفظ بھی نہ بول پایا۔ ایکسیفوف نے پھر سوچا "وہ اپنے غصے کی پردہ پوشی کیوں کرے جس نے اس کی زندگی برباد کر دی تھی؟"

مجھے سیمینج سے جو کرب و اذیت پہنچی، اس کی سزا اسے ملنی چاہیے۔ لیکن میں نے بتا دیا تو وہ یقیناً کوڑے مار مار کر ہلاک کر دیں گے۔ پھر ہو سکتا ہے میرا اسے مجرم سمجھنے کا فیصلہ درست نہ ہو۔ یہ بھی غور طلب بات ہے کہ اسے سزا ملنے سے میرا کیا فائدہ ہوگا؟"

"اچھا تو بزرگ آدمی! گورنر نے اسے پکارتے ہوئے کہا "مجھے بتائیے کہ دیوار کے نیچے سے سرنگ کس نے نکالی ہے؟"

ایکسیفوف نے مار سیمینج کی جانب سرسری لگاؤ ڈالتے ہوئے کہا "جناب! میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اللہ تعالیٰ

ایکسیف بولا "جب انھوں نے مجھے گولے مارے تو ان کا درد اتنا شدید نہیں تھا جتنا مجھے تم سے مل کر ہوا۔" سمیوئیل اُس کی بات کاٹتے ہوئے بولا "اور پھر بھی آپ نے مجھ پر ترس کھایا اور گولز کو میرے جرم کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔ اللہ کے واسطے مجھے معاف کر دو۔ میں بدترین انسان ہوں۔ بہت بُرا۔ بہت بُرا۔" وہ سسکیاں بھر بھر کر رونے لگا۔

جب ایکسیف نے اُسے روتے دیکھا تو وہ بھی رونے لگا۔ "اللہ تعالیٰ آپ کو معاف کرے گا۔" اُس نے کہا۔ "ہو سکتا ہے اعمال کے اعتبار سے میں آپ سے ۱۰۰ گنا زیادہ گویا ہوں۔" یہ کہہ کر ایکسیف کے جی کو کچھ ڈھارس ہو گئی۔ اُس کے من سے گھر کی خواہش جاتی رہی۔ اب اس میں جیل چھوڑنے کی کوئی خواہش نہ رہی تھی۔ بس یہی تمنا پیدا ہو گئی کہ اب اُس کا آخری وقت آجائے تو بہتر ہے۔

ایکسیف نے اقرار جرم کے ارادے سے اتفاق نہیں کیا تھا لیکن سمیوئیل نے حکام کے سامنے اپنا یہ جرم تسلیم کر لیا کہ تاجر کا قتل اسی نے کیا تھا۔ جب داروہ ایکسیف کی رہائی کا حکم لے کر آیا تو وہ اپنے قید خانے میں ساکت بیٹھا تھا۔ جب داروہ نے اسے بلایا تو وہ لڑھک کر پیچھے جا گرا۔ وہ بڑی خاموشی سے تمام مصائب سے چھٹکارا پا گیا تھا۔

اس کہانی کے مترجم سید عفتلات احمد ساہد نے چنانچ یونیورسٹی ۱۹۶۹ء سے ایم اے کیا۔ ۱۹۷۱ء میں قانون کی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۷۳ء میں سول جج کے مقابلے کا امتحان پاس کیا۔ بھلوال میں پہلی تین تہائی ہوئی۔ ۲۰۰۷ء میں ایڈمنسٹریٹو ایڈمنسٹریٹو امتحان سے بطور پریسکڈنٹ ہوئے۔

کی یہ مرضی نہیں کہ میں کچھ بتاؤں۔ آپ میرے ساتھ جو سلوک بھی چاہیں کر سکتے ہیں، حاضر ہوں۔"

گورنر نے پوچھنے کی کوشش کی اور اسے بہت سمجھایا، بھجایا مگر ایکسیف نے مزید کچھ نہ کہا۔ چنانچہ تفتیش کا معاملہ رکت گیا۔ اُس رات ایکسیف کو بستر پر لیٹے ابھی اوتک ہی آئی تھی کہ کوئی خاموشی سے اُس کے بستر پر بیٹھ گیا۔ اس نے اندھیرے میں غور سے دیکھا تو پہچان گیا۔ وہ سمیوئیل تھا۔

"تم مجھ سے مزید کیا چاہتے ہو؟" ایکسیف نے پوچھا۔ سمیوئیل خاموش رہا۔ ایکسیف اٹھ کر بیٹھ گیا اور کہا "کیا چاہتے ہو؟ یہاں سے چلے جاؤ ورنہ میں پہرہ دار کو بلالوں گا۔"

سمیوئیل اس کے اوپر جھکا اور آہستہ سے بولا "ایکسیف! مجھے معاف کر دو۔"

"کس بات پر؟" ایکسیف نے کہا۔ "میں نے ہی تاجر کو قتل کیا تھا اور اللہ قتل تمھارے سامان میں چھپا دیا۔ میں تمھیں بھی قتل کرنا چاہتا تھا مگر مجھے باہر کچھ شور سنا دیا، چنانچہ چاقو سامان میں چھپایا اور کھڑکی کے راستے باہر نکل گیا۔" سمیوئیل نے انکشاف کیا۔ ایکسیف کو سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہے۔ سمیوئیل زمین پر جھکا اور کہنے لگا "ایکسیف! مجھے معاف کر دو۔ اللہ کے لیے مجھے معاف کر دو۔ میں اقرار کر لوں گا کہ تاجر کو میں نے قتل کیا تھا۔ چنانچہ آپ رہا ہو کر اپنے گھر چلے جائیں گے۔"

"تمھارے لیے یہ کہنا بہت آسان ہے۔ مگر میں نے تمھاری وجہ سے ۲۶ سال بڑی اذیت سے گزارے ہیں۔ اب میں کہاں جاؤں؟ میری بیوی فوت ہو چکی اور میرے بچے..... وہ مجھے بھول چکے۔ اب کوئی بھی ایسی جگہ نہیں جہاں میں چلا جاؤں۔"

سمیوئیل اپنی جگہ سے نہ ہلا اور ایکسیف کی بات سن کر زور زور سے اپنا سر زمین پر پیچنے لگا۔ "ایکسیف مجھے معاف کر دو۔" اس نے بلند آواز سے روتے ہوئے کہا۔



کہ تازہ فی

اللہ کی مرضی

حباب



ایک سعید روح کا قصہ جاں فشا
وہ نہیں جانتے تھے کہ آزمائش
کی شکلیں کتنی ہوتی ہیں اور کبھی کبھی
اسے لال پڑ بھی لگے ہوتے ہیں

www.Paksociety.com

چچا

باقترچست پر پہنچنے تو ان کی نظر کوئے پر پڑی۔ وہ منڈیر پر بیٹھا کچھ کھا رہا تھا۔ انھوں نے اپنے سامان پر نظر دوڑائی تو گزربز نظر

آئی۔ سوچنے کے لیے رکھی گئی بڑیاں (وال کی بنی نکلیاں) کئی جگہ سے بے ترتیب ہو گئی تھیں۔ "اس کوئے نے تو پریشان کر کے رکھ دیا ہے۔" وہ بڑبڑائے اور ان نکلیوں کو بٹا دیا جن پر پنچوں کے نشان نظر آ رہے تھے۔ کوئے نے اپنا کھانا ختم کر لیا تھا۔ اب وہ باروداک میں لگ گیا۔ وہ نمبے سے اٹھے اور اسے ہش ہش کر کے اڑایا۔ وہ اڑ کر کوٹھری کی چھت پر جا بیٹھا۔ چچا آگے بڑھے تو وہ کبوتروں کی چھتری پر چلا گیا۔ وہ واپس اپنے سامان کے پاس آ بیٹھے۔ سوچ رہے تھے کہ پھر اس کی گھرائی میں یہاں بیٹھنا پڑے گا۔

باقترچچا بڑیاں بنا کر بیٹھتے تھے۔ عرصے سے ان کا یہی کام تھا۔ شہر کے پرانے علاقے میں وہ منزلہ عمارت میں رہتے تھے۔ چھت بھی ان کے پاس تھی۔ نیچے بازار میں ہی ان کی دکان بھی تھی۔ بڑیاں بنانے کے لیے وہ مختلف والوں کو پیستے، ان میں نمک مرچ اور دوسرے مصالح ملائے، پھر چھوٹی چھوٹی نکلیاں بنا کر دھوپ میں سکھا لیتے۔ ان کی بنائی چٹ پٹی بڑیوں کی دودرنک مانگ بھی، سستے زمانے میں تو وہ بخونی گزربسر کر لیا کرتے۔ لیکن جب سے مہنگائی کو پر لگے تھے، انھیں بھی مشکل ہونے لگی تھی۔

وہ اچھ کر دیوار تک آئے اور نیچے جھانکا، بازار میں جھوم تھا۔ کام کا وقت تھا۔ عین کوئے کی وجہ سے بیٹھنا پڑ رہا تھا۔ ان کا دھیان دکان میں لگ تھا۔ اگرچہ وہ برابر والے دکاندار کو کہہ آئے تھے، لیکن کوئی کب تک دوسرے کا خیال رکھے؟ کوئی اسی طرح چھتری پر بیٹھا تھا جسے انتظار کر رہا ہو۔ اس کی نظریں نیچے بڑیوں پر لگی تھیں۔ وہ انھیں کئی دن سے تنگ کر رہا تھا۔ جب بھی موقع ملتا، وہ بھی نظر پچا کر اور بھی نظروں کے سامنے دھڑلے سے بڑی لے اڑتا۔ بقیہ پنچوں سے خراب الگ کرتا۔ وہ سخت پریشان تھے۔ کوئے کے پروں پر کہیں سے لال رنگ لگ گیا تھا۔ اسی لیے وہ اسے

پچپانے لگے تھے۔ ورنہ کوئے تو اور بھی اڑتے بھرتے تھے، لیکن وہ کچھ زیادہ ہی پنچور واقع ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد انھوں نے بڑیوں کی سینیاں اٹھا کر کوٹھری میں رکھیں اور دروازہ اچھی طرح بند کر کے دکان پر چلے گئے۔ کوئی ابھی تک اپنی جگہ ٹھہر رہا تھا۔

دوسرے دن جب وہ چھت پر پہنچے تو کوئے سامنے عمارت کی منڈیر پر بیٹھا تھا۔ انھیں دیکھ کر فوراً چھتری پر چلا آیا۔ چچا نے سوچا، یہ کل کی طرح پھر پریشان کرے گا لہذا اس کی خوراک کا بندوبست پہلے ہی کر دوں۔ وہ نیچے گئے اور روٹی کے ٹکڑے پر سامن اٹکا کر لے آئے۔ کوئے نے لچپائی نظروں سے ٹکڑا دیکھا اور اڑ کر چھت پر آ گیا۔ ٹکڑا چوچے میں دیا اور منڈیر پر اڑ گیا۔ لیکن ٹکڑا سا کھا کر ہی اس نے ٹکڑا کرا دیا۔ اس کی نظریں بڑیوں کی حاش میں ادھر ادھر دوڑ رہی تھیں۔ "کوئے... ٹکڑے کو روٹی ہی پسند نہیں۔" باقر چچا نے خودکامی کی۔ خیر انھوں نے اپنا کام شروع کیا۔

بیانی کے بعد جب وہ نکلیاں بنا رہے تھے تو کوئے بے چینی سے منڈیر پر ٹپکنے لگا۔ کچھ دیر بعد چچا نیچے سے کچھ اٹھانے کھوئے تو وہ چھتری سے ایک ٹکڑے لے اڑا۔ باقر چچا زور سے چیخے تو وہ سامنے والی عمارت کی چھت پر جا بیٹھا اور مزے سے بڑی کھانے لگا۔ اس دن بھی انھیں ایک گھنٹے تک وہاں چوکیداری کرنی پڑی۔ وہ سوچ رہے تھے، اس کا کوئی بندوبست کرنا پڑے گا۔

فادرنگ ہو کر وہ دکان پر آئے تو بجلی کا بل آیا پڑا تھا۔ اٹھا کر دیکھا تو بندے آسمان کو چھو رہے تھے "یا اللہ اتنا بل! یہاں اتنی بجلی تو استعمال نہیں ہوتی۔" انھوں نے سوچتے ہوئے گردن اوپر اٹھائی جہاں ۲ بلب اور ایک پگھکا تھا۔

پڑوسی دکان دار لڑکا ان کی پریشانی بھانپ کر یوں "کیا ہوا چچا، کیوں پریشان ہو؟" انھوں نے مل دیکھا تو یوں "چچا بجلی کے نرخ ہر مہینے بڑھائے جا رہے ہیں، بل تو زیادہ آئے گا۔"

مقصد حیات

انسان کی پیدائش سے لے کر اس کی موت تک کا سفر اس برق رفتاری سے گزرتا چلا جاتا ہے کہ انسان کو سمجھنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ کبھی دنیا کی رنگینوں میں کھو کر اور کبھی رشتوں کو نبھاتے نبھاتے انسان کی زندگی بدقسمتی میں دیت کے مانند اس کے ہاتھوں سے پھسلتی چلی جاتی ہے اور وہ بھی اپنا مقصد حیات سمجھ ہی نہیں پاتا۔

مقصد حیات سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنے اندر چھپی صلاحیتوں کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ ہاشم اللہ تعالیٰ نے ہر کسی کو کسی نہ کسی خاص صلاحیت سے نوازا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ کس طرح اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتا ہے۔

(ابن مسعود رضی اللہ عنہ، ملتان)

ان کی آنکھ کھلی تو کھلی سے لوگوں کی باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ لکڑی میں آئے تو پتہ چلا، تار گر گیا ہے۔ کچھ گھروں کی بجلی چلی گئی تھی۔ کوئی کہہ رہا تھا، اوپر سے کوئی چیز آ کر لگی ہے۔ وہ دوبارہ سو گئے۔ رات کو کسی وقت بجلی آگئی۔

صبح وہ سویرے جاگ گئے۔ چٹا صبح کی سیر کے عادی تھے۔ نماز پڑھ کر نکلے تو چند قدم چل کر ہی ان کی نظر ایک مرے ہوئے پر پڑی۔ وہ کوئے سے اتنا تنگ آئے ہوئے تھے کہ بے خیالی میں آسے دیکھنے لگ گئے۔ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اس کا ایک پر لال ہے۔ انھوں نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا تو لکڑی کا میچا نظر آیا۔ ساتھ ہی وہ تار بھی جو رات کو ٹوٹ گیا تھا۔ چٹا سوچنے لگے، بے چارے کی قضا آتی جو تار سے ٹکرا گیا۔ انھیں افسوس ہو رہا تھا۔ ”خیر اللہ کی یہی مرضی ہوگی۔“ وہ یہ سوچتے اور صبح پڑھتے آگے بڑھ گئے۔ کچھ دیر بعد گلی میں غار کدوب آیا اور مرا ہوا کوا اپنی ہتھ کاڑی میں ڈال کر لے گیا۔



سے ہوئے۔

”چچا! بے وقوف نہ ہو، یہ اتنی دور سے صرف تمہارا ہی کام کرنے آیا ہے۔“

”میں نے نہیں گمانا کام و ام۔“ وہ مگر ہے۔ ان کا من سرخ ہو رہا تھا۔ ان کے کچے میں کوئی ایسی بات تھی کہ لڑکا دوبارہ ہنسنے لگا اور اپنے دوست کو چائے پلانے ہوئے لے گیا۔

وہ پہر تک وہ اپنی جگہ ساکت بیٹھے رہے۔ آج بھی بازار سست تھا۔ ظہر کے وقت وہ نماز پڑھنے اٹھے۔ نماز پڑھ کر آئے تو دکان پر ایک شخص کھڑا ان کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ ایک بڑا بیوی پاری تھا۔ مختلف شہروں میں اس کی کئی دکانیں تھیں۔ وہ دو تین منٹے بعد ان کی دکان کا ٹیکر لگاتا اور خریداری کرتا۔ وہ گرم جوشی سے ملا اور بولا ”چچا کہاں ہو۔ جب بھی آؤ تم نہیں ملے۔ تمہاری دعا سے ایک اور دکان کھول لی ہے۔ دکھاؤ کیا مال بنا یا ہے۔“

باقر چچا حیرتی سے بڑبڑول کے پیکٹ دکھانے لگے۔ وہ انھیں لیتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ دکان تقریباً خالی ہوگئی بلکہ انھیں گھر سے پیکٹ لا کر دینے پڑے۔ اس نے فوراً بل بلائی، وہ پے دیے، پھر بولا ”چچا! اب پر پندرہ سواڑے میرے لیے اتنا ہی مال تیار کر کے رکھا کرو۔ ان شاء اللہ میں آن کر لے جایا کروں گا۔“

چچا نے خوشی سے اثبات میں گردن ہلائی اور خدا کا شکر ادا کیا۔

رات کو وہ بیٹھے حساب کتاب کر رہے تھے۔ سب سے پہلے انھوں نے بل کے روپے الگ کیے۔ وہ پھر اگلے دن کا پروگرام بنانے لگے۔ صبح پینے بل جمع کرانے تھے۔ پھر دائیں اور مسالے خریدنے تھے۔ انھوں نے سوچا، کل دکان دیر سے کھولوں گا۔ کوئے کا بھی کچھ بندوبست کرنا پڑے گا۔ اگر لکڑی کے چونکے فریم بنا کر ان پر جالی لگالی جائے تو بڑیاں ڈھکی جاسکتی ہیں۔ وہ سوچتے رہے پھر سو گئے۔ وہ جلد سو جاتے تھے۔

ابھی زیادہ رات نہیں ہوئی تھی کہ اچانک بجلی چلی گئی۔

مزارِ وفا

ان تلخ تجربات اور اذیتوں پر میرے لمحوں کی چشم بست کبانی جن سے گزرتی رہی
بڑے فیصلہ ساز ہوئے ہیں۔ ابھی کبھی ان کم بختوں کو ملتی ہیں

خستہ چین شین

جب

کیا اور اسے تربت کے کپے تعویذ پر رکھ دیا۔ چراغ دیکھ کر
میرے پوتے نے سوال کیا ”دادا! اب اس چراغ کی روشنی قبر
کے اندر تو جا نہیں سکتی پھر آپ کیوں جلا رہے ہیں؟“
”بیٹا! واقعی روشنی اندر نہیں جا سکتی مگر یہ چراغ میں
نے اس لیے روشن کیا کہ اس قبر کے اندر جو نورانی شع
روشن ہے لوگ اس سے باخبر ہو کر اس سے فائدہ
اٹھائیں۔“
”دادا! اب اس قبر میں کون دفن ہے؟“ شایان نے

میں اپنے گروہی کی قبر پر فاختہ
خوئی کرنے گیا تو میرا دل خون
کے آنسو رو رہا تھا کیونکہ وہ ہستی
جسے میں اپنا گرو تسلیم کر چکا تھا، وطن عزیز سے وفا کا سرمایہ
اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ اب نہ وہ ہستی رہی نہ وہ پیش
قیمت سرمایہ ہر طرف ٹپٹا کا گروہ تھا جو لٹس پرتی میں
مصروف و مشغول تھا۔
میرا پوتا شایان بھی میرے ساتھ تھا جو اچانک چوٹا
دینے والا سوال کر کے ہم سب کو حیران کر دیا کرتا تھا۔ ہم
سب اسے مستقبل کا لڑکا کہتے تھے۔ جب ہم جبری قبر کے
قریب پہنچے تو میں نے اس خالی جھونپڑی کو غور سے دیکھا
جو میری درس گاہ ہوا کرتی تھی۔ قبر کی حالت خراب ہو چکی
تھی لہذا میں اس کی صفائی سہرائی میں مصروف ہو گیا۔
صفائی سہرائی سے فارغ ہونے کے بعد میں نے تربت
کے سر بانیے اپنا ہانپا ہوا کپڑا گاڑ دیا جس پر صرف دو الفاظ
لکھے تھے ”مزارِ وفا“۔ بعد ازاں میں نے ایک چراغ روشن

دوسرا سوال کیا۔
”بیٹا! یہ میرا گرو تھا۔ استاد وہ ہے جو اپنے شاگرد کو
تعلیم عطا کرتا ہے۔ گرو تعلیم کے ساتھ ساتھ گری کی باتیں بتا
کر اپنے شاگرد کی ذہنی تربت بھی فرماتا ہے۔ اس لیے گرو
کا مقام استاد سے بہت اونچا ہے۔
جھونپڑی کے اندر ایک خالی چارپائی جوں کی توں
بچھی تھی۔ اس تربت کے اندر مدفون ہستی کا نام تو
قرآنِ امین تھا مگر میں اور مجھے جیسے دوسرے لوگ اسے

کیا تصور؟

میرا جواب یقیناً اس خاتون کے لیے غیر متوقع تھا۔ ”تو گویا تم نے اپنے کفن کے لیے وردی کو چن رکھا ہے؟“ اس نے بڑی تنبیہ کی سے کہا۔

”ہاں جی! لگتا تو ایسا ہی ہے۔ اس سے اچھا کفن اور کون سا ہو سکتا ہے؟“ یہ سن کر اس نے مجھے جمو پٹری کے اندر آنے کو کہا لہذا میں سبیل کر چار پائی پر بیٹھ گیا کیوں کہ وردی میں زمین پر بیٹھنا مناسب نہیں تھا۔ یہ بات وردی کے آداب میں شمار ہوتی ہے۔ پھر تعارف کا سلسلہ چل نکلا تو میں نے پہلے اپنا تعارف کر دیا جسے سن کر وہ خاتون خوش ہو گئی۔ اس نے کہا ”تو گویا تم وطن کی فضاؤں کے محافظ ہو؟“ بہت خوب۔ میں اس جگہ ایک عرصے سے رہائش پذیر ہوں۔ یہاں منافقت اور جعل ساز یوں کا حال ڈرا دوسرا ہے۔“

یہ ہماری پہلی ملاقات تھی اور ہم دونوں نے ایک دوسرے کو صدق دل سے پسند کر لیا۔ اسے میرا انداز بود و باش اچھا لگا اور مجھے اس کی گفتگو پسند آئی۔ یوں ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ میری موجودگی ہی میں دو تین حضرات آئے اور خیر خبر لے کر چلے گئے۔ ہر آنے والا اسے باجی بیٹی کہہ رہا تھا۔ ہر فرد کا انداز احترام دیدنی تھا۔

ایک روز میں نے باجی بیٹی کی زندگی کے متعلق سوالات کیے تو اس نے کمال فراخ دلی سے مجھے بہت کچھ بتاتے ہوئے کہا ”برخوردار! تم مجھے اچھے لگے ہو۔ لہذا میں تمہیں اپنی طویل داستان ضرور سنائوں گی۔“ باجی بیٹی نے پھر داستان کو کے انداز میں اپنی کہانی کا آغاز کیا تو میں بس مسحور ہو کر رہ گیا۔ یہ باجی بیٹی نہیں بلکہ پاکستان کی داستان خواش تھی۔ اہم بات یہ کہ باجی کا انداز فکر ہو بہو میری سوچ کے عین مطابق تھا۔

”میں کانپور کے متحول گھرانے میں پیدا ہوئی۔ ہماری وسیع و عریض حویلی کان پوری اس جامع مسجد کے قریب تھی جس کی شہادت سے برصغیر کے طول و عرض میں آتش فساد کے شعلے بھڑک اٹھے۔“ میرے سوال کرنے سے پہلے ہی باجی نے اس شہادت کی وضاحت کرتے

باجی یعنی کہا کرتے تھے۔ اس جمو پٹری میں جو بھی آتا جانکاری کے موتی لے کر جاتا۔ اس دور میں یہ موتی قدر کی لاکھ سے دیکھے جاتے تھے کیونکہ منہ زور ہوں ابھی اتنی بے لگام نہیں ہوئی تھی۔ میں طویل غیر حاضری کے بعد وہاں آیا تھا کہ اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی کے لیے مجھے پاکستان سے باہر جانا پڑ گیا۔ پوتے کے سوالات سے فارغ ہونے کے بعد میں چار پائی پر بیٹھ کر کتاب ماضی کے اوراق پلٹنے لگا۔ پہلی ملاقات کی قلم میرے سامنے چلنے لگی۔

۱۹۵۶ء

یہ ۱۹۵۶ء کے موسم سرما کی بات ہے جب میں محاشرے کو فساد سے پاک رکھنے کا کر جان چکا تھا۔ میرے خیال میں ہر فرد کا فرض ہے کہ وہ موقع ملتے ہی شہر خوشاں کی حاضری ضرور دے۔ اس سے افراد کا ذہنی قطب نما رام راست پر رہتا ہے اور معمولی سمجھ بوجھ والا انسان بھی دوسروں کی حق تلفی سے گریز کرتا ہے۔ اپنے حق سے زیادہ کی طلب ہی سارے فساد کی جڑ ہے۔ حقیقت یہی ہے، باقی سب زہب داستان کے زمرے میں آتا ہے۔

۱۹۵۶ء کے موسم سرما میں میری رہائش پیر اخبار لاہور میں تھی۔ ایک روز میں وردی ہی میں اپنے شوق کی تکمیل کرنے شہر خوشاں کی طرف چل نکلا۔ میرا وردی میں ہونا محض اتفاق ہی تھا۔ عموماً لوگ قبرستانوں میں بلا ضرورت وردی میں نہیں جاتے۔ البتہ اگر کسی اپنے آدمی کی تدفین مطلوب ہو تو باردوری ہونا ضروری ہے۔ خیر میں پرانی قبور پر فاتحہ خوانی کرتا پھر رہا تھا کہ مجھے ایک جگہ ایک جمو پٹری دکھائی دی جس کے سامنے او میڑ عمر خاتون ٹھہری تھی۔ وہ بھی ایک وردی پوش کو دیکھ کر حیرت کا اظہار کرنے لگی۔ بلکہ اس نے آواز دے کر مجھے اپنے قریب بلایا اور کہا ”برخوردار! اس لباس میں کہاں مڑ سکتی کرتے پھر رہے ہو؟“

”کیوں جی! میرے لباس میں کیا خرابی ہے؟“ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”اور یہ لباس تو میرا کفن ہے جی۔ اب اگر احق لوگ بے نقاب یہاں آتے ہیں تو اس میں میرا

القابات سے نوازتے رہتے تھے۔ ان انتخابات نے کانگریس کا اصل چہرہ بدلے قلاب کروا اور قائد اعظم بھی بدلے ہوئے حالات کے مطابق عمل پیرا ہونے پر مجبور ہو گئے۔ یہ کہہ کر پابی مینی تھوڑی دیر کے لیے رک گئی، پھر دم لے کر پھر اسی انداز میں لب کشا ہوئی۔

ان انتخابات میں مسلم لیگ ۲۸۲ نشستوں میں سے صرف ۱۰۲ پر کامیاب ہوئی جبکہ کانگریس ۱۷۱ میں سے ۷۰۲ نشستیں لے گئی۔ پنجاب میں سر فضل حسین کی یونیسٹ پارٹی بھی کافی نشستوں پر کامیاب ہوئی۔ حد یہ کہ کانگریس نے ۵۸۸ مسلم نشستوں میں سے بھی ۲۶ پر کامیابی حاصل کر لی۔ اس طرح کانگریسی میٹاؤں نے ہندوستانی مسلمانوں کی فمائیدگی کا اعلان کر دیا۔ یہ صورت حال بڑی تشویش ناک تھی۔

اس وقت مسلمانوں کی تعداد ۸ کروڑ کے قریب تھی مگر وہ گروہوں میں تقسیم تھے۔ اب قائد اعظم نے ان گروہوں کو ایک قوم بنانا تھا۔ یہ بات بظاہر کوئی مشکل نہ تھی کہ اس بے سمت جھوم کو صرف ایک سمت سے روشناس کرانے کی ضرورت تھی۔ مگر عملاً یہ کام جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ ذمینی حقیقت تو یہ بھی تھی کہ دیوبندی علما کرام کا ایک حصہ قائد اعظم کو بے ریش اور مذہب سے بیگانہ سمجھتا تھا۔ انہوں نے کہا کہ پھر اتنا جتنا تھا۔ بہر حال اس فتح کے نتیجے میں کانگریس نے گیارہ صوبوں میں سے ۸ میں اپنی حکومت قائم کر لی۔

ہندو طویل عرصے سے حکومت چلے آ رہے تھے۔ اب بھی وہ حکومت ہی تھے مگر اب ان کے حاکم بدل گئے۔ جبکہ مسلمانوں نے طویل مدت تک ہند پر حکمرانی کی تھی اور انگریزوں نے کاروبار حکومت انہی سے سنبھالیا تھا۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ تھا کہ فرنگی سرکار مسلمانوں سے خائف تھی اور غیر مسلموں کو بڑا جواز سبوتیں فراہم کرتے لگی۔ سائنے کہتے ہیں کہ جب تک گڈزی لوہے کے کھارے کا ساتھ نہ دے، کھارڈا تیرتی سے گڈزیاں کاٹ ہی نہیں سکتا۔ اسی کے مصداق کانگریس کے ایک معروف مسلمان راہنما

ہوئے کہا "عالمی جنگ سے پہلے کانپور کا ہوائی اڈہ "بھروٹی" ایشیا کا سب سے بڑا ہوائی اڈہ قرار دیا جاتا تھا۔ اسی کی تعمیر نے میرے والد کو متول بنا دیا تھا۔ جی ہاں! یہ ہوائی اڈہ میرے والد صاحب نے تعمیر کرایا تھا۔ حکمرانوں کو اس ہوائی اڈے تک پہنچنے کے لیے سیدھی سڑک درکار تھی مگر ایک جگہ راستے میں جامع مسجد پڑتی تھی۔ ہذا بلدیہ کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ مسجد شہید کر کے سڑک کی بنی ودر کی جائے۔ اس فیصلے نے ہر صغیر کے مسلمانوں کو مشتعل کر دیا اور وہ جلیوں نکالنے لگے تب حکمرانوں نے اس جھوم کو گولیوں سے بھون کے رکھ دیا۔ یوں فساد کی آگ نے سارے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ تاریخ میں اسے کانپور کا ہولناک فساد لکھا گیا ہے۔

ہمارا خاندان مال و دولت کے علاوہ امت مسلمہ سے وفاداری اور غیر مسلموں سے ہمدردی کی وجہ سے سارے شہر میں مشہور تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے بیگانے ہمارے خاندان کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ میں کہہ سکتی ہوں کہ میری تربیت سچائی پر استوار سیاسی ماحول میں ہوئی۔ جب میں نے شعور کی آنکھ کھولی تو پورے پورے کا بہت چہ چا تھا۔ اسی رپورٹ کو پڑھ کر قائد اعظم نے لاکار کر کہا تھا کہ اب یا کبھی نہیں (Now or Never)۔

۱۹۳۳ء میں قائد اعظم لندن میں قیام پزیر تھے۔ انھوں نے خود ساختہ جلاوطنی اپنا رکھی تھی مگر لیاقت علی خان کی کاوشیں رنگ لائیں اور انھوں نے قائد کو ہند میں آکر مسلمانوں کی راہنمائی پر رضی کر لیا۔ میرے بچپن میں پاکستان اسی روز معرض وجود میں آ گیا تھا جس دن قائد اعظم نے سرزمین ہند پر قدم رکھا۔ نامساعد حالات نے مسلمانوں کو متحد ہونے پر گویا مجبور کر دیا۔ اکثر اوقات نامساعد حالات کامیابی کی ضمانت بن جاتے ہیں؟

انڈین ایکٹ مجریہ ۱۹۳۵ء کی رو سے ہند میں بلدیاتی انتخابات ۱۹۳۸ء میں ہونا قرار پائے۔ زمانہ گواہ ہے کہ قائد اعظم ہندو مسلم اتحاد کے سب سے بڑے داعی تھے۔ کانگریسی تینا بھی انہیں سفیر امن اور دیگر بہت سے

حل تھا۔ بعد میں کانگریسی قیادتوں نے ان اقدامات کو درست قرار دینے کے حق میں طرح طرح کے دلائل پیش کیے، تاہم ان کے انبار لگا دیے مگر تاہمیں، ویلیس سچائی میں سر موہدی نہ لاسکیں۔

”پھر یوں ہوا کہ برطانوی وزیر اعظم چیمبرلین نے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ ہندوستان نے جنگی اندھن فراہم کرنا تھا ورنہ برطانیہ خود تو چند جزیروں پر مشتمل چھوٹا سا ملک تھا۔ جنگ میں جرمن قوم کا مقابلہ ان کے بس کی بات ہی نہ تھی۔ مہاتما گاندھی نے اس موقع سے استفادہ کرتے ہوئے انگریزوں کو ہندوستان سے فوراً نکل جانے کو کہا جسے انہوں نے درخور اعتنا ہی نہ سمجھا۔ ادھر ہندی نیتا سرکار کو دھمکیاں دینے لگے اور آخر ان کے وزراء صاحبان صوبائی وزارتوں سے مستعفی ہو گئے۔ اس طرح کانگریس کا ۲۷ مارچ کا دور استبداد اختتام پذیر ہوا اور قائد اعظم نے مسلمانوں کو یومِ نجات منانے کی ہدایت فرمائی۔“

یہ کہہ کر باقی ایک پار پھر خاموش ہو گئی۔ میں جانتا تھا کہ اس ذہنی ورزش سے وہ نڈھال ہی ہیں۔ ذہن سے پرانی باتیں نکالنا اور وہ بھی سنسنی و تواریخ کے ساتھ، معمولی بات نہ تھی۔ میں نے ان کو سستانے کے لیے وقت دیتے ہوئے کہا ”اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کے اور اپنے لیے چائے کا انتظام کر لوں؟“

”اس کی کوئی ضرورت نہیں، بس ایک گلاس پانی پلا دو۔“ باقی نے کہا۔ میں نے باہر رکھے منگے سے پانی کا گلاس لا کر پیش کر دیا۔ پانی پانی پی کر تازہ دم ہوئیں، تو پھر داستان سنانے لگیں:

”واروہا سکیم کا مقصد مسلمان بچوں کے ذہنوں کو خاص سانچے میں ڈھالنا تھا۔ مگر درس گاہوں میں مہاتما گاندھی کی تصویر کے آگے ڈنڈا کرنا تو حماقت اور معاندانہ رویے کی انتہا تھی۔ میں سائق و دھرم ہائی سکول میں دسویں جماعت کی طالبہ تھی۔ ہمارے ہیڈ ماسٹر ہمیش داس جی کا خیال تھا کہ میں بورڈ میں پوزیشن لا کر سکول کا نام روشن کروں گی۔ لہذا وہ میرے لیے نرم گوشہ

مولانا عبد الکلام نے نیا تعلیمی نظام متعارف کرایا جسے واروہا سکیم کہتے ہیں۔ اس کا واحد مقصد مسلمانوں کو ہندو تہذیب میں دھم کر کے ہندوستان میں ایک قوم تیار کرنا تھا۔ ادھر ہندوؤں نے ۶ رسویوں میں رام راج قائم کرنے کا آغاز کر دیا۔

تعلیمی اداروں میں رسوائے زمانہ ترانہ ہندے ماترم لازمی قرار دیا گیا۔ اس سے مسلمانوں کی توہین ہونے لگی۔ ہندی زبان کو ذریعہ تعلیم قرار دیا گیا۔ مساجد میں اذان پر پابندی لگا دی گئی کہ اس سے غیر مسلموں کی سب سے خراش ہوئی تھی۔ ہندو مسلم انداز فکر میں اتنا بھد تھا کہ ہندو، بھگت، علیہ کے الفاظ کو انہوں نے شہدے قرار دیتے اور کوئی انہیں اپنی زبان سے ادا نہ کرتا۔

اس کے علاوہ گائے ذبح کرنے پر سخت پابندی لگا دی گئی۔ خلاف ورزی کرنے والوں کو سزائیں دی جانے لگیں۔ دھک دینے والی اور بھی بہت سی باتیں تھیں۔ مثلاً مساجد میں باجماعت نماز کے اوقات میں خنزیر کی تھوکتی نمازیوں کے سامنے پھینکی جانے لگی۔ یہ تھوکتیں عام لوگوں میں بھی پھینک دی جاتی۔ اشتغال انگیزی کا ایک اور حربہ ہندوؤں کے ہاتھ آ گیا۔ ایک کرسی پر پارٹیشن مسلمان کی تصویر رکھ کر اس کرسی کو ذبح گازی وغیرہ پر جا کر جلیں نکالا جاتا۔ ایک پرہیزگار تصویر کی ڈالچھی پر چھڑی وغیرہ سے ضربیں لگا کر کہتے ”اوے لیچھو پاکستان مانگتا ہے۔“ یہ بڑی اشتغال انگیز حرکت تھی مگر وہاں تو قانون کے رکھوالے خود یہ حرکات کر رہے ہوتے۔ ان وہابیات حرکات کی گونج قائد اعظم تک پہنچی تو انھوں نے راجہ مہدی علی خاں آف جی پور کو اس واقعے کی تحقیق کا حکم دیا۔ جو رپورٹ راجہ صاحب نے پیش کی اسے جی پور رپورٹ کہتے ہیں۔ تحقیق سے ثابت ہو گیا کہ تمام شکایات حقیقت پر مبنی ہیں۔ نتیجے میں قائد اعظم نے وہ تاریخی الفاظ افرمائے تھے۔“

باقی یعنی تاریخ کے اوراق و ہر اری تھی اور میرے ذہن میں دو قومی نظریہ پختہ ہوتا جا رہا تھا۔ ان حالات میں مسلمانوں اور ہندوؤں کا الگ الگ ہونا نا ہی مسائل کا

رکھتے تھے۔ جس روز مہاراجا جی کی تصویر لا کر ایک چبوترے پر سجائی تھی، اس روز ہمیں بھاشن بھی دیا گیا کہ گاندھی جی سارے ہندوستان کے باپ ہیں۔ لہذا ان کی تصویر کا احترام کرنا طالب علموں کا فرض ہے۔ ادھر میں بچپن ہی سے مزارعیت شوق تھی۔ بھلا میں کسی کی تصویر کو ڈنڈوت کیسے پیش کر سکتی تھی؟

وقار الزماں میرا ہم جماعت اور ہم خیال تھا۔ ہم دونوں نے اس وابہیات رسم میں شرکت سے انکار کر دیا۔ جس روز اس رسم کا آغاز ہونا تھا میں سکول سے غیر حاضر رہی۔ سالانہ امتحان سر پر تھا۔ لہذا ہیڈ ماسٹر صاحب نے غیر حاضری کا سبب پوچھا۔ میں نے صاف بتا دیا کہ میں کسی بات یا اس کی تصویر کے آگے جھکنا پسند نہیں کرتی۔ ہیڈ ماسٹر یہ سن کر پریشان ہو گئے۔ میں نے اپنے گھر والوں کو بھی اعتماد میں لے رکھا تھا۔ میرے والد بھی مجھے اس بات پر مجبور نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے وقار سے مل کر ایک منصوبہ بنایا جو یقیناً نامناسب بلکہ جوانی حیلے کے مترادف تھا۔

چھٹی کے بعد ہم دونوں چھپ کر واپس سکول پہنچے اور اس تصویر کا حلیہ بگاڑ آئے۔ ہم نے اپنی دوا میں گاندھی جی کے چہرے پر انڈیل دیں۔ دوسرے روز سکول میں کھرام مچ گیا۔ معمولی پوچھ گچھ کے بعد ہماری کارروائی طشت ازہام ہو گئی اور سکول انتظامیہ نے ہم دونوں کو سکول بدر کرنے کا فیصلہ سنا دیا۔ مگر ہیڈ ماسٹر صاحب نے اس فیصلے کی شدید مخالفت کی۔ کئی روز تک لے دے ہوئی رہی۔ آخر ہیڈ ماسٹر صاحب جیت گئے۔ اس طرح ہم دونوں نے میٹرک کا امتحان اسی درس گاہ سے پاس کیا۔ ضلع بھر میں دوسری پوزیشن آئی۔ میٹس جی بہت خوش تھے۔ کان پور کے اخبارات نے تمک مرچ لگا کر یہ کہانی شائع کی تو میں اور وقار سارے ضلع میں مشہور ہو گئے۔ حد یہ کہ مسلم لیگی راہنماؤں نے ہمیں رول ماڈل کے طور پر پیش کیا۔ لیکن نتیجہ یہ بھی نکلا کہ غیر مسلم عوام ہماری جان کے دشمن ہو گئے۔ آغاز دھمکیوں سے ہوا، آخر میرے والد

نے فیصلہ کیا کہ مجھے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لے لینا چاہیے۔ میری اور وقار کی شہرت پہلے ہی لاہور پہنچ چکی تھی۔ وقار کے نمبر بھی بہت اچھے تھے۔ اس طرح ہم دونوں لاہور آ گئے۔ اس آمد کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میرے تخیال کا تعلق لاہور سے تھا اور وہاں میں ہر طرح سے محفوظ و مطمئن تھی۔ اس دوران وقار میرے بہت قریب آ گیا اور سچ تو یہ ہے کہ اس نے کان پور میں میری خوب حفاظت کی تھی۔ دو چار بار تو حریفوں کے دانت کھٹے کر دیے تھے۔

اس قربت نے جب محبت وغیرہ کا روپ دھارا تو میں نے صاف الفاظ میں وقار کو ایک بات سمجھائی کہ عشق و عاشقی کے لیے ساری عمر پڑی ہے اور یہ کہ میں اپنا رشتہ تحریک پاکستان سے جوڑ چکی۔ لہذا اگر میری قربت چاہتے ہو تو اس شے سے محبت کرو جس سے میں پریم کرتی ہوں۔ اگر تم نے سحائی ثابت کردی تو میں تمہیں اپنانے میں فخر محسوس کروں گی۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے یہ بات وقار کی سمجھ میں آئی اور اس نے بھی تحریک پاکستان کو اپنا اور سنا بچھونا بنالیا۔ اس طرح ہماری منزل ایک ہو گئی۔

۱۹۳۳ء میں جب قائد اعظمؒ نے ہندوستان واپس آ کر مسلمانوں کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی تو ہم دونوں ان کے شیدائی بن چکے تھے۔ اسی دوران ایک بے خبر خاکسار نے ان پر قاتلات حملہ کیا مگر خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اس حملے کے بعد وقار تو گویا جھٹے سے اکھڑ گیا۔ بارہا اس نے خاکساروں سے ہجر جانے کا فیصلہ کیا مگر میں نے اسے قائل نہیں رکھا کہ وہ وقت آپہنیں میں تمہارا کہ ہرگز نہیں بلکہ متحد ہو جانے کا تھا۔

تاریخی اجلاس سے صرف ۳ روز پیشتر اہل لاہور کو کڑی آزمائش سے گزرنا پڑا۔ ۱۹ مارچ ۱۹۴۰ء والے دن خاکسار تحریک کے ایک جیس اور فرنگی پولیس کے مابین ٹکراؤ ہو گیا۔ پولیس کی کمان لاہور کے ایس ایس پی جینی (BETI) کر رہے تھے۔ اس دور میں پولیس کا معمولی سپاہی بھی دہشت کی علامت تھا۔ یہ کمانڈر تو ایس ایس پی

دیا۔ مگر انہوں نے بعد ازاں ان کی کرسی پر پرلے درجے کے نااہل برادران ہو گئے۔ خدا ان سب کو ہدایت سے نوازے یا اگر ہدایت ان کے نصیب میں نہیں تو ان کا پائیدار بندوبست فرمائے۔“

باقی خاموش ہوئیں تو بے اختیار میرے منہ سے نکلا: ”آمین۔“ اور بیان جاری رکھتے کی خاطر کہا ”پھر کیا ہوا۔“ یہ تلخ حقیقت ہے کہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ سرسکندر حیات نے اس جیسے کو حیلے سے التوا کا فکار کرنے کی سرزد کو پیش فرمائی کیونکہ ان کی یونٹ پارٹی تقسیم ہند کے خلاف تھی۔“

”لاحول ولا قوت۔“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا تو باقی مسکرائے گئی۔

”سرسکندر حیات نے پہلا قدم یہ کیا کہ لاہور میں دفعہ ۱۳۳ نافذ کر دی لیکن منہ زور طوفان کو ریت کی دیوار سے کیسے روکا جاسکتا ہے۔“

”اس حرکت کی وجہ بھی تو رہی ہوگی؟“ میں نے پوچھا۔

”جی تو حیرت انگیز بات ہے کہ وزیر اعلیٰ کو اس کا جواز بھی مل گیا۔“ باقی نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”ہوایوں کہ ۱۹ مارچ ۱۹۴۷ء والے دن خاکساروں اور پنجاب پولیس کے اہل کاروں کا ٹکراؤ ہو گیا۔ ایک سمت لاہور پولیس کا ایس ایس پی مسٹر جینی اپنے سپاہیوں کو لفٹ رایت کراتے ہوئے آ رہا تھا اور سامنے سے خاکساروں کا جمش چپ راست، چپ راست کرتا دکھائی دیا۔ جینی نے جمش کو راستے سے ہٹ جانے کا حکم دیا۔ اس کا خیال تھا کہ چپ راست کرتے یہ پیچھے بردار پولیس دیکھ کر بھاگ جائیں گے۔

مگر ہوا یہ کہ خاکساروں نے یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا بلکہ پولیس اہلکاروں کو راستے سے ہٹ جانے کا اشارہ دیا۔ بھلا یہ کیسے ممکن تھا؟ اس طرح دونوں فریقین کا ٹکراؤ ہو گیا۔ جینی صاحب گھوڑے پر سوار تھے۔ انہوں نے گھوڑے سے اتر کر رعب جمانے کا ارادہ کیا۔ ادھر جمش

تھے یعنی ”فیل بے زنجیر۔“ ٹکراؤ کی وجہ صاف ظاہر تھی، وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں۔ ایس۔ ایس۔ پی صاحب نے جمش کو راستے سے ہٹ جانے کا حکم دیا مگر جواباً اسے چپ راست (Left, Right) کی ناپسندیدہ گونج سنائی دی۔

اس زمانے میں نواب شاہنواز خاں ممدوٹ پنجاب مسلم لیگ کے صدر تھے۔ قائد اعظم بھی جان چکے تھے کہ پنجاب اور اس کے باشندے تحریک پاکستان میں قیصل کن کردار ادا کریں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ قائد اعظم نے صرف ۴ برس کے قیصل عرصے میں مسلمانوں کی تشکیل نو فرما کر انہیں ایک طاقتور قوم میں ڈھال دیا تھا۔ ۱۹۳۸ء میں انتخابات سے انہوں نے بہت کچھ سیکھا اور حالات کو اپنے حق میں کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ آخر ۱۹۴۷ء کا سورج طلوع ہوا، مسلم لیگ کا ۲۷ رواں اجلاس منعقد کرنے کی خاطر مشاورت ہوئے گئی۔ نواب ممدوٹ نے قائد اعظم کو یہ جلسہ لاہور میں منعقد کرنے پر راضی کر لیا۔ اس تاریخی اجلاس کی جزیات تک لے لے ہوئیں۔ ہمارا جوش و خروش دیدنی تھا۔“

”باقی ایک بات تو بتائیں، کیا آپ نے قائد اعظم کو قریب سے دیکھا تھا؟“ میں نے پہلا سوال کیا اور غور سے ان کا چہرہ دیکھنے لگا۔

”جائے! قریب سے کیا؟ میں دو لمحات کیسے بھول سکتی ہوں جب انہوں نے میرے سر پر دست شفقت رکھ کر مجھے ثابت قدم رہنے کی تلقین فرمائی تھی۔ دو واقعی تاریخ ساز شخصیت تھے۔ ان جیسا دوسرا پیدا ہونا ممکن ہی نہیں، البتہ ان کی نقالی کرنے والے مظہر عام پر آتے رہیں گے۔ مگر یہ تمام لوگ مسخرے ہوں گے۔ کون ہے جو قائد اعظم جیسا حوصلہ، ہمت اور خلوص بے کنار کا مالک ہو۔ جان محمد علی جناح امت مسلمہ پر اللہ تعالیٰ کی کرم نوازی اور خاص الخاص تفضل تھے۔ خدا ان کے درجات بلند فرمائے۔ انہوں نے کمزور و ناقص خام مال سے ایک طاقتور قوم تیار کر کے اقوام عالم کو ورطہ حیرت میں ڈال

سالار بھی منہ زور قسم کا تھا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور پوری قوت سے پیچھے کھینچا مارا۔ پولیس کمانڈر کا سر پڑ غرور کٹ کر زمین پر آ رہا۔ سپاہی یہ ان ہوئی دیکھ کر دم بخور ہو گئے۔ کمانڈر کے نائب نے جیجی کر گولی چلانے کا حکم دیا۔ نیچے آکھ کر آہ تھے لیکن آتشیں اسلحہ بھی کم تھا۔ اس طرح خاکسار سینوں پر گولیاں کھا کھا کر گرتے گئے۔ ایک دو نہیں پورے ۵۰ جوان فرش خاک پر تر پڑے۔ لاکھوں افراد زخمی ہوئے جنہیں میو ہسپتال پہنچا دیا گیا۔

اس طرح لاہور کا سالار ماحول خاک کا شکار ہو گیا۔ یہ جلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹے والی بات ہو گئی اور وزیر اعلیٰ پنجاب نے جاسم جانی وفد ۱۳۴۳ء رافذ کر دی۔ ۲۱ مارچ ۱۹۴۰ء والے دن قائد اعظم لاہور نوکھارے ریلوے اسٹیشن پر تشریف لائے تاکہ تاریخی اجلاس میں تشریف فرما سکیں۔ وقار اور میں استقبال کرنے والوں میں شامل تھے۔ میرا دل اتنے زور سے دھڑک رہا تھا گویا سینے سے باہر آ جانے کو بے چین ہو۔ میں نے قائد اعظم کے رخ روشن کی ایک جھلک دیکھی۔ ان کے ساتھ مولانا کے اے فصل بھی تھے۔ مگر میں تو اس آفتاب عالم تاب کی انگاری میں محو تھی۔

ایک پل کے لیے قائد کا چہرہ اوجھل ہو گیا۔ ہوا یہ تھا کہ کوئی اور طالب دیوانہ ہمارے درمیان آ گیا۔ یاد نہیں کہ پھر کیا ہوا بس اتنی خبر ہے کہ میں نے اس طالب دیدار کو پوری قوت سے دھک دیا اور وہ بے چارہ پلیٹ فارم پر گر گیا۔ اللہ میری اس اغرض کو معاف فرمائے۔ قائد اعظم نے مسکرا کر مجھے دیکھا۔ اب میں ان کو مخاطب کرنا چاہتی تھی مگر مناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ پھر میری آنکھیں ہلک گئیں اور قائد اعظم کا چہرہ دھندلا چکا۔ یہ مجھے منظور نہ تھا۔ میں نے فوراً آنکھیں صاف کیں اور دہمچی ہوئی آواز میں جومہ میں آیا کہہ دیا۔ وقار نے بعد میں بتایا کہ میں نے قائد اعظم کو ”پاپا جانی“ کہا تھا۔ اس کی وجہ مجھے خود بھی معلوم نہیں کہ میں نے ان کو پاپا کیوں کہا۔

”پاپا جانی؟“ میں اظہار حیرت کیے بغیر نہ رہ سکا۔

”جی ہاں پاپا جانی، اس وقت قائد اعظم ہم سب کے پاپا جانی ہی تھے۔ پھر مجھے طلب سے زیادہ مل گیا۔ قائد نے آگے بڑھ کر میرے سر ناتوں پر دست شفقت رکھا اور فرمایا: ”بیٹی ہمت سے کام لو، دوسروں کو دھکے نہ دو۔“ یہ کہہ کر باہمی اپنے سامنے دیکھنے لگی، میں نے صاف دیکھا کہ ان کی نگاہ کا ہدف کوئی شے نہ تھی یعنی وہ اس وقت ماضی بعید کے کسی منظر میں گم تھی۔

”ایچھا یہ بتائیے کہ قائد اعظم نے جب آپ کے سر پر دست شفقت رکھا تو کیا ان کے ہاتھ میں کسی قسم کی لرزش تھی؟“ میں نے بے ہنگام سوال کیا۔

”میرا خیال ہے کہ ہاتھ میں ہلکی سی لرزش ضرور تھی۔ مگر یہ ممکن نہیں کہ وہ بڑے مضبوط حوصلے کے مالک تھے۔ انہیں اپنے آپ پر ان کو مکمل قابو تھا۔“ پاپا جانی نے کہا۔

”نہیں پاپا جانی بات کم ہمتی کی نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ اس وقت انہوں نے آپ کو اپنی بیٹی کے طور پر قبول کر لیا تھا۔ کیا آپ نہیں جانتی کہ وہ اپنی اکلوتی بیٹی کے کمرے میں تنہا جایا کرتے تھے۔ ایک بار ان کے خادم نے ان آنکھوں میں آنسو بھی دیکھے تھے کہ وہ زمین پر نہ گر سکے۔ یہی قائد اعظم کی قوت برداشت کی دلیل ہے۔ انکوں کی واپسی ہر بندے کے بس کی بات نہیں ہوتی۔“

”۲۱ مارچ کی رات کو تاریخی اجلاس کی تیاری ہوئی۔“ پاپا جانی نے سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔ ”۱۳ مارچ والے دن ہی قائد اعظم نے اپنے مدبر ہونے کا جوت بھی پیش کر دیا۔ ایک خاکسار کی اہمیت حرکت سے مسلم لیگ اور خاکسار عظیم میں رجسٹر کا امکان بہر حال موجود تھا۔ جو شیئے مسلم لیگی اس قاتلانہ حملے کو فراموش نہیں کر پائے تھے مگر قائد اعظم نے اپنے تدبیر کے ایک ہی وار سے ہمارے اندیشوں کی دھند صاف فرمادی۔ وہ ریلوے اسٹیشن سے سیدھے میو ہسپتال گئے جہاں خاکساروں کے کئی افراد ڈھمی پڑے تھے۔

اس عیادت نے تمام نام نہاد دانش وروں کو حیران کر دیا اور دوسری جانب خاکساروں کے دل بھی جیت

چہ معنی دار وہ۔" باقی نے مجھے پیار سے سمجھایا۔

عجیب بات یہ تھی کہ ہم دونوں کی آنکھیں بھیجک چلی گئیں۔ جن واقعات کا تصور انسان کو ایک بار کر دے، ان کی جلوس کی انسان کا کیا حشر کرتی ہوگی۔ مگر یہ بات صرف اہل عشاق ہی جانتے ہیں، یہ اہل ہوس کے بس کی بات ہی نہیں۔ مشکوی سفر العشق میں میاں محمد بخش فرماتے ہیں کہ "العشق ناز طریقی ماسوا اللہ۔" بی ہاں عشق ہی وہ آگ ہے جو ماسوا اللہ سب کو جلا دیتی ہے اور یہ عشق کسی مقصد سے بھی ہو سکتا ہے۔ جب ہم اس جذبے سے کسی مقصد کو حاصل کرتے چاہیں تو ضرور کامیاب ہو جاتے ہیں۔ باقی یحییٰ نے داستان جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"میں اور وقار آج کے قریب ہی بیٹھے تھے۔ ہمارا مرشد ہمارے سامنے تھا۔ جذباتی بھر کے ہم دیکھ کر کہتے تھے۔"

جمعہ ۲۳ مارچ ازحانی بیچے کے قریب چلے گی کارروائی کا آغاز تلاوت قرآن پاک سے ہوا۔ پڑاؤں میں تل بھرنے کی جگہ تھی مگر تلاوت کے شروع ہوتے ہی ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ مجھے تو اپنے سانسوں کی آواز تک سنائی دے رہی تھی۔ تلاوت کے بعد ایک بار عجب شخصیت مائیک پر آئی اور اس نے میاں بشیر کی معروف نظم ترنم سے پڑھی۔

"ملت کا پاساں ہے محمد علی جناح"

میرے تو روٹنے لگے۔ ہونے، وقار نے میرا ہاتھ تھام رکھا تھا اور اس کے بازو کی لڑکھٹ میرے اندر سرایت کر رہی تھی۔ میں نے اس کے بازو پر چھلی دے کر اسے قابو میں کیا ورنہ وہ تو نعرے بازی کو بالکل تیار تھا۔ یہی وہ وقت تھا جب میں نے وقار کو پسند کر لیا۔ جب منزل ایک تھی تو ہم مسافر ابھی کیسے رو سکتے تھے۔ وقار نے مجھ سے سرگوشی کی "یہ اور قریشی صاحب ہیں۔" یہ بیٹے کا مبارک دن تھا۔

"یعنی ۲۳ مارچ بروز جمعہ دن کے ازحانی بیچے۔"

لیے۔ سرسکندر حیات وزیر اعلیٰ دیکھتے ہی رو گئے۔ پہلے تو میں نے بھی قائد اعظم کے اس قدم کو پسند نہیں کیا۔ مگر جب نور کیا تو معلوم ہوا کہ اس وقت وہی مناسب ترین قدم تھا۔ مسلم لیگی اور خاکسار دونوں جماعتوں کے افراد کے دل صاف ہو گئے۔

۱۴ مارچ کی رات نواب ممدو کی جائے رہائش پر ابتدائی جلسہ ہوا جس میں قرارداد کا مسودہ تیار کیا گیا۔ اس کا متن انگریزی زبان میں تھا۔ دن کے وقت یعنی اس اجلاس سے پہلے لاہور کی دو شخصیات کو بنیادی کمیٹی میں شمول کیا گیا یعنی ڈاکٹر محمد عالم اور میاں فیروز الدین۔ اس اجلاس میں بڑے بڑے دانشوروں کی مشاورت سے قرارداد کا مسودہ تیار ہوا۔ وہ دانش ور تاریخ رقم کر گئے۔ ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

(۱) ملک برکت علی، (۲) سرسکندر حیات خان، (۳) لیاقت علی خان، (۴) چوہدری خلیق الزماں، (۵) مولانا ظفر علی خاں۔ مولانا ظفر علی خاں نے اس مسودے کو اردو زبان میں ڈھالا۔ آخر ۲۴ مارچ کا سورج طلوع ہوا۔ اس روز ہم نے صبح کی نماز شامی مسجد لاہور میں ادا کی اور منو باریک پہنچ گئے۔ رفتہ رفتہ پڑاؤں بھرنے لگے۔ لوگ تھے کہ کھٹی کوچوں سے ابلے پڑ رہے تھے۔ ایک حطاق اعزاز سے کے مطابق کم از کم ایک لاکھ افراد نے مسلم لیگ کے ۲۷ ویں اجلاس میں شرکت کی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ شرکاء کی کثیر تعداد انگریزی زبان سے ناچل نہ تھی۔ سب جانتے تھے کہ قائد اعظم اپنی تقریر انگریزی میں کیا کرتے تھے مگر لوگ سمجھ ہو کر سنتے۔ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو جمعرات کا دن تھا۔ کرسی صدارت پر آٹھ کروڑ مسلمانوں کے دلوں کے ترجمان محمد علی جناح تشریف فرما تھے۔

"مگر باقی وہ جلسہ تو دوپہر ازحانی بیچے شروع ہوا تھا آپ صبح وہاں کیوں پہنچ گئے؟"

"ارے بچے لوگ تو وہابیات سی قلم دیکھنے کی خاطر کلف گھر کے سامنے بستر بچھا لیتے ہیں اور یہاں تو ہماری قسمت کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ پھر چند گھنٹوں کی دیر سویر

میں نے زہرباب دھرایا تاکہ باہی کا ایک ایک لفظ میرے ذہن پر نقش ہو جائے۔ پھر میں نے پوچھا "اس وقت اس پر کون کون بیٹھا تھا؟" باہی نے جواب دیا۔ "سیدھے ہاتھ قائمہ عظم کے بائیں قریب شیر بنگال مولانا اے کے فضل الحق بیٹھے تھے جو اس وقت صوبہ بنگال کے وزیر اعلیٰ بھی تھے۔ یاد رہے کہ قرارداد لاہور یا پاکستان کی تائید بھی انھوں نے فرمائی تھی۔"

"کیا ان تائید کرنے والوں میں کوئی اور بھی شامل تھا؟" میں نے پوچھا۔

"نصیر بنگال کے بعد چوہدری خلیق الزماں نے تائید فرمائی، وہ یونی سے تھے۔ ان دونوں حضرات کا اجتماع مولانا ظفر علی خاں نے کیا۔ مولانا انگریزی کی کوٹھڑی کوٹھڑی سمجھتے تھے مگر اس سے ایسا سلوک نہ کرتے۔ انگریزی ایسی بولتے کہ محمد علی جوہر کی یاد تازہ ہو جاتی۔ ان کے بعد سردار اورنگ زیب خاں، حاجی عبداللہ ہارون، قاضی عیسیٰ نے پرجوش طریقے سے قرارداد لاہور کی تائید فرمائی۔ میں ان تمام محسنین سے اچھی طرح واقف تھی۔ ان کے بعد اجلاس کی دوسری جانب سے بھی تائید ہونے لگی۔ ڈاکٹر محمد عاصم (ماہر تعلیم و تربیت) اور نواب امجد علی خاں بھی تائید کرنے والوں میں شریک ہوئے۔ پھر حاضرین نے عجیب و غریب منظر دیکھا۔ ایک برقع پوش خاتون اٹھ کر اپنے خیالات کا اظہار کرنے لگی۔"

"برقع پوش؟" میں نے اظہار حیرت کیا تو باہی نے مسکرا کر کہا۔

"جی ہاں! برقع پوش ہستی مولانا محمد علی جوہر کی بیوی تھیں۔ میں نے جلسے کے بعد ان سے بالمشافہ گفتگو کی تھی۔ اس لیے میں پورے وثوق سے اس بات کی تصدیق کر سکتی ہوں۔ آج بھی اگر تم وہ تصویر دیکھو تو وہ تمہیں نظر آجائیں۔ ان کے بعد ایک تندرست و توانا جوان مرد آدمی نے محترمہ کی تعریف فرمائی۔ یہ تھے آئی آئی چندر بیکر جو مردانہ و جاہل کا شہوت تھے۔ قرارداد لاہور کے کل ۳۰۰ الفاظ تھے اور چار عدد پیرے۔ انگریزی زبان سے نااہل حضرات کی

مشکل مولانا ظفر علی نے آسان فرمادی۔ انھوں نے اس قرارداد کا اتنا خوبصورت ترجمہ فرمایا کہ بس لطف آگیا۔ قرارداد کا خلاصہ بھی سن لو۔" باہی نے کہا۔

"اس جلسے کی مختلف رائے ہے کہ برصغیر کے مسلمان ہر لحاظ سے ایک ایک قوم ہیں جس کے معاشرتی، تہذیبی اور دیگر ہر لحاظ سے الگ اصول ہیں۔ آئندہ کوئی دستور ہند کے مسلمانوں کو قابل قبول نہیں ہوگا جس کی تیاری مسلمانوں کی مشاورت کے بغیر کی گئی ہوگی۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے الگ الگ ہندو ہیں اور ملحدہ تاریخی کارہائے نمایاں۔ یہ دونوں نہ آپس میں شادی بیاہر چاہتی ہیں اور نہ ان کی رسومات ایک جیسی ہیں۔ یہ تو کھانا پینا تک بھی اکٹھے نہیں کرتے۔ ایسی صورت میں ان دو اقوام کو ایک جوئے میں کیسے جوتا جاسکتا ہے؟ قائمہ عظم کے اصل الفاظ تھے "You can not yoke them together"۔"

قائمہ عظم نے دونوں الفاظ میں مسلمانوں کے لیے الگ خطے کا مطالبہ کیا جہاں کے مسلمان اسلامی تعلیمات کے عین مطابق زندگی گزار سکیں اور یہ بھی فرمایا کہ ہندو مسلم اتحاد ایک خواب ہے جو شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ اسی جلسے کے بعد آپ نے اپنے ذاتی معاون سے کہا "آج اگر اقبال زندہ ہوتے تو وہ یہ دیکھ کر کتنے خوش ہوتے کہ ان کی خواہش کے عین مطابق قرارداد مختلف طور پر منظور ہو گئی ہے۔" یہ کہہ کر میری باہی خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگی اور میں نے بھی محسوس کیا کہ باتیں بہت ہو گئی ہیں لہذا فی الحال یہ کارروائی ختم ہونی چاہیے۔

میں نے کہا "ہاں ہاں اب آپ اجازت دیں، میں ان شاء اللہ پھر آؤں گا اور باہی باتیں پھر ہوں گی۔ خیال یہی تھا کہ دو ایک روز بعد ملاقات ہو جائے گی مگر تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا اور میں ایک ماہ پھر ان سے نمل سکا۔ یہ ۱۹۵۹ء کا ذکر خیر ہے۔"

ہوا یوں کہ پاک فضا یہی کی جانب سے مجھے امریکہ جانے کے لیے نام زد کر لیا گیا تاکہ میں اپنی پیشہ ورانہ مہارت کی تحفیل کر سکوں۔ بلائیں (مس نی ریاست کی

ایک فوجی درس گاہ) میری منزلت تھی اور مجھے انکسٹراکٹ میں بلند مرتبہ تعلیم حاصل کرنی تھی لہذا میں اس کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔ میری پیشہ ورانہ مصروفیات کو باقی کمزوریاں زمانہ نہ کہتی بلکہ انہماک دست فرماتی تھیں۔ بہر حال ۱۹۵۹ء دسمبر کے آخری ایام میں ایک بار پھر ہماری طویل ملاقات ہوئی۔ جب میں اپنی انوکھی درس گاہ پہنچا تو باقی مینی مجھے دیکھ کر حائل انھی اور جب میں نے ان کو بتایا کہ میں حصول تعلیم کے لیے امریکا جا رہا ہوں تو ان کی مسرت دیدنی تھی۔

"اچھا ہوا کہ تم آج آگے۔ ہم وہ داستان بھی پوری کر لیں گے۔ دیاغیر میں جانے سے پیشتر یہ بہت ضروری ہے اور میں امید کرتی ہوں کہ تم امریکا کی مصنوعی چمک دمک سے مرعوب نہیں ہو گے۔" اس روز چھوٹری میں ایک عدد نویس کرسی بھی موجود تھی۔ باقی نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ تمہاری وردی کے احرام کا اہتمام ہے۔ اب تم آرام سے اس پر بیٹھ سکتے ہو۔" میں نے ان کے ارشاد کی تعمیل کی تو انھوں نے داستانِ دل نواز کا سلسلہ جوڑتے ہوئے کہا:

"مارچ ۱۹۳۰ء کی چند تاریخیں ہر فرد کو یاد ہونی چاہیے۔

(۱) ۱۹ مارچ..... جب فرنگی پولیس اور خاکساروں کا نکراد ہوا۔

(۲) ۲۱ مارچ..... جب حضرت قائد اعظمؒ یعنی میرے محترم چچا بانی شیر بیکال کے ساتھ لاہور وکیلے اسٹیشن پر تشریف لائے۔

(۳) ۲۲ مارچ ۱۹۳۰ء..... جب قرار دیا ہوا مورچش ہوئی۔

(۴) ۲۳ مارچ ۱۹۳۰ء..... جب یہ قرار داد مختلف طور پر منظور ہوئی۔ مجھے امید ہے کہ ان تاریخوں سے تعلق رکھنے والے سارے واقعات تمہارے ذہن میں محفوظ ہوں گے۔"

"ہی باقی! وہ واقعات میرے ذہن پر نقش ہو

چکے۔" میں نے پورے ادب سے کہا۔
"تو پھر ستمبر ۲۳ مارچ ۱۹۳۰ء کا ذکر زیر بحث لاتے ہیں۔" باقی نے کہا "علامہ اقبال کی حسب مشا قرار داد منظور ہوئی اور بقول قائد اعظمؒ دنیا کی کوئی طاقت مسلمانان ہند کو حصول پاکستان سے محروم نہیں کر سکتی تھی۔ یہ تھا ایک سچے مدبر اور راہنما کا عزمِ مستحکم۔ خیر! ۲۳ مارچ ۱۹۳۰ء کا سورج طلوع ہوا تو کاکڑئیں نواز ہندو اخبارات نے شور مچا کر آسمان سر پر اٹھالیا۔ ان میں دیر بھارت، ملاب اور پرتاب سرگھرست ہیں۔ مگر انگریزی اخبار ٹریبون (Tribune) نے ان کی شکست کا حق ادا کر دیا جس سے یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ کاکڑئیں اور فرنگی ایک ہی پتیلی کے پٹے بنے تھے۔ مسلم دشمنی میں کوئی کسی سے غم نہیں تھا۔ پنجاب کے یونیٹسوں نے اس قرار داد کو مبہم (Obscured Resolution) کہا۔

کاکڑئیں مسلم راہنماؤں نے اپنے اپنے ظرف و شرف کے مطابق ہرزہ سرائی کی۔ مولانا محمد انکام آزاد نے تو اسے نظریہ اسلام کے سراسر خلاف قرار دیا۔ ان کے اصل الفاظ تھے "Against the Islamic Ideology" اب خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ مولانا موصوف کس اسلام کی بات کر رہے تھے۔ یہ سن کر وہ قار تو گویا جیسے جی سے اکھڑ گیا اور کہنے لگا "یعنی وزیر دیکھ لینا، میں اس گمراہ مطلق کا پیٹ چاک کر کے رہوں گا۔"

"تم ایسی کوئی حماقت نہیں کرو گے۔" میں نے پہلی بار اسے محبت بھری نگاہوں سے لوازتے ہوئے کہا تو وہ آپے میں آگیا۔ مہاتما کرم چند مہوبن واس کا ندھی نے کہا "میری آتما دو قومی نظریے کی مخالفت کے گرد گھومتی ہے۔ مسلمان ہوں یا ہندو، سب ایک ہی خدا کی مخلوق ہیں پھر یہ الگ قومیت کا کیا مطلب۔" ان ناقدین میں سکھوں کے راہنما ماسٹر تارا سنگھ تمام حدود و قیود عبور کر گئے۔ انھوں نے کہا "مسلمان اگر واقعی پاکستان بنانے پر تلے بیٹھے ہیں تو ان سکھوں کا کوئی سمندر عبور کرنا پڑے گا۔"

یہاں میں خاموش نہ رہ سکا اور لب کشا ہوا "باقی

دھڑکی کی دھڑکی رو گئی۔ "اب ہم دونوں خاموش ہو چکے تھے مگر میں بدستور باہمی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے جا رہا تھا۔ باہمی فراست سے میرا مفہوم سمجھ کر مسکراتے لگی۔

"جانم! میں تمہارے اندر جھانک سکتی ہوں۔ تم مکمل کتاب کی طرح میرے سامنے آ جاتے ہو۔ میں جانتی ہوں کہ اب تم وقار کے متعلق جاننے کے لیے بے چین ہو۔ تو چلو یہ داستان بھی تمہارے گوش گزار کیے دیتی ہوں۔ غلام صرف یہ ہے کہ ہم نے قیام پاکستان کے فوراً بعد شادی کا فیصلہ کر لیا۔ اس فیصلے کو میرے خاندان والوں نے بھی پسند کیا کہ وہ وقار الزماں کے متعلق کافی حد تک جان چکے تھے۔

قرارداد لاہور اب قرارداد پاکستان بن چکی تھی۔ قائد اعظم نے اس حسن اتفاق پر غیر مسلم سیاست دانوں کا شکریہ بھی ادا کیا جنہوں نے مسلمانوں کو ایک نہایت خوبصورت اور موزوں اصطلاح فراہم کی تھی۔ کیا اس میں دستِ قدرت کا فرما نہیں تھا؟ یقیناً تھا۔" باہمی نے اپنے سوال کا خود ہی جواب دے دیا۔

باہمی پھر خاموش رہیں، پھر کہنے لگیں: "جانم! تم امریکہ جا رہے ہو اور امید ہے کہ واپس بھی آجائو گے۔ تمہاری ٹھکانی بنیاد کافی مضبوط ہے لہذا تم وہاں کی چمک دمک سے محروم نہیں ہو گے اور نہ وہاں کی مصنوعی زیب و زینت تمہیں وہاں روک سکے گی۔ پھر بھی میں چند باتیں تمہارے گوش گزار کرنا چاہتی ہوں۔"

"ضرور ضرور!" میں ہمدردی کو برسرِ سننے لگا۔ باہمی نے کہا "عربی معاہدہ ہے کہ "افسوسِ انزاس فلسفین علی الجسد باس" (جب سرِ درست رہے تو انسانی جسم سلامت رہتا ہے) انسان وہی کچھ بن جاتا ہے جو کچھ وہ سوچتا ہے۔ سوچ الفاظ کا روپ دھار کر عادت بنتی ہے اور عادت عادت قبر تک جاتی ہیں۔ لہذا ضروری ہے کہ آدمی خیالات پر قابو رکھے۔ نامناسب خیالات انسان کو برباد کر دیتے ہیں۔ آغاز میں ان پر قابو رکھنا مشکل نہیں ہوتا مگر رفتہ رفتہ یہی خیالات شیطان کو دعوت دے کر خرابی پیدا

تاراسکتے واقعی سکھ تھا، اس نے اپنی قوم کو غیروں سے زیادہ نقصان پہنچایا، پنجاب کی تسلیم کا شوق بھی اس تاراسکھ نے چھوڑا۔ اب سکھ قوم آج تک بچھتا رہی ہے حالانکہ قائد اعظمؒ نے ان کو سن چاہی سونئیں فراہم کرنے کا وعدہ بھی کیا تھا مگر بات ان کی سمجھ میں نہ آسکی۔" یہ کہہ کر میں سوالیہ نگاہوں سے باہمی کو دیکھنے لگا۔

انگریزی اخبار نے ہندو اخبارات کی ہاں میں ہاں ملائے ہوئے اسے قرارداد پاکستان کہا اور یہ اضافہ بھی کر دیا کہ اس قرارداد پر عمل نہیں ہو سکا۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ صدر کا ٹھکانے راج گوپال اچاریہ نے اس قرارداد کی حمایت کی یعنی اسے خلاف قانون قرار نہ دیا۔ بہر حال لے دے ہوئی رہی۔ ہر فرد کو اظہارِ رائے کی آزادی تو تھی مگر بے پرکی اڑانے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔

واکسراے ہند لارڈ وکونٹ ویول نے دسمبر ۱۹۳۵ء میں عام انتخابات منعقد کرانے کا اعلان کر دیا۔ اس انتخابات سے یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ مسلمانان ہند کی نمائندگی کون کر رہا ہے۔ اس سے پیشتر کانگریس کا کوئی تھا کہ وہی اور صرف وہی ہندوستان کے مسلمانوں اور ہندوؤں کی نمائندہ جماعت ہے۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو یہ ایکشن بھی اپنی نوعیت کا نرالا تھا۔ اس سے پیشتر ۱۹۳۸ء کے عام انتخابات میں کانگریس نے کامیاب ہو کر اپنے دعوے کی سچائی ثابت کی تھی مگر اب قائد اعظمؒ کی کاوشوں سے طوفان کا رخ بدل چکا تھا۔ چنانچہ ۱۹۵۵ء کے تاریخی ایکشن میں مسلم لیگ نے سرگرمیوں کو ساری شستیں جیت لیں اور صوبوں میں بھی ۲۹۲ نشستوں میں سے ۲۲۸ پر کامیابی حاصل کر کے انگریزوں اور ہندوؤں کی مشترکہ سیاست پر تلخیر پھیر دی۔ یوں یہ بات ثابت ہو گئی کہ قائد اعظمؒ اور صرف قائد اعظمؒ ہی ہندی مسلمانوں کے حقیقی راہنما ہیں اور مسلم لیگ ہی مسلمانوں کی واحد نمائندہ سیاسی جماعت ہے۔

"گویا قیام پاکستان کی بنیاد استوار ہو گئی۔" میں نے مختصر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ "اور غیروں کی متحدہ سیاست

ملا وہ اس کے ماتا پتا بھی میرے گردیدہ ہوئے۔
 ”اچھا خیر! بتاؤ تو سہی کہ ہوا کیا ہے۔“ میں نے
 پوچھا۔

”لاہور شاد عالمی دروازے کے قریب والے مندر
 میں غیر مسلم فنڈوں نے خشہ اجلاس میں فیصلہ کیا ہے کہ
 لاہور کے ناپسندیدہ عناصر کو ملٹی وڈ لوگ جو قرا اردو پاکستان
 میں بڑھ چڑھ کر شریک تھے، تہ تیغ کر دیا جائے۔ پہلے وہ
 بڑا جلوس نکالیں گے پھر اس جلوس سے چار چار افراد کی سا
 ٹولیاں وہاں سے الگ ہو کر بقول ان کے ناپسندیدہ عناصر
 کے گھروں پر دھاوا بول دیں گی۔ اس جلوس کا ڈراما
 رچانے کا مقصد یہ ہے کہ بلوائیوں کی جائے واردات سے
 غیر حاضری ثابت کی جاسکے۔ جلوس میں شرکاء کی تعداد
 ہزاروں میں ہوگی۔ میں نے کافی سے درخواست کی اور
 اپنے احسان کا بدلہ چکانے کا مطالبہ کیا تو وہ مجھے ہندو
 جوان کے ہمیں میں اجلاس ساتھ لے جانے پر راضی ہوگئی
 تھی۔ چنانچہ یہ کام ویسے تو بے حد مشکل تھا مگر تم جانتی ہو کہ
 میں جس کام کے پیچھے پڑ جاؤں اسے انجام تک پہنچا کر
 رہتا ہوں۔“

”بلوائیوں کی ٹھکانوں کو لٹا دینا چاہیے۔“
 میں نے وقار سے پوچھا۔

”تمیں چالیس ٹولیاں لے تو میرے سامنے بھگوت
 گیتا پر ہاتھ رکھ کر سو گندھائی کہ وہ سب جان کی بازی لگا
 دیں گے۔“

یہ منصوبہ سن کر میں پریشان ہو گئی۔ اس طرح
 تحریک پاکستان کے سکڑاؤ اور ختم ہو جاتے اور اہم
 بات یہ کہ اس وقت ان افراد کی سخت ضرورت تھی۔
 ہمارے پاس ان افراد کو مطلع کرنے کا کوئی ذریعہ بھی نہ تھا
 کہ ہم غیر مسلموں کے نشانے پر آئے لوگوں سے واقف
 ہی نہیں تھے۔ اس طرح ہم کس کس کو خبردار کرے؟ میں
 نے عالم بے بسی میں کہا ”خدا یا! رحم کر۔ اب کیا کیا جائے۔
 اچانک مجھے خیال آیا کہ حضرت عمر فاروق جب بے بس ہو
 جاتے تو فوراً نماز کی نیت لیتے تب ان کے ذہن میں

کرتے ہیں۔ جب حضرت اٹھیں انسان کی گری دل پر
 چبھ جائے ہے تو فوراً ہی اپنی ربوبیت کا اعلان کر کے
 انسانی صلاحیتوں کو مجروح کر کے غیر صالح بنا دیتا ہے۔
 یہی مکمل تباہی کی بنیاد ہے۔ اب میں اپنی مثال دے کر
 تمہیں قافلے کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔

میں اور وقار منقوان شاہ میں داخل ہو چکے تھے۔
 بارہا میرے چاہنے والے نے پڑی سے اترنے کی کوشش
 کی مگر میں نے نہ صرف اپنے آپ کو بلکہ اسے بھی سنبھال لیا۔
 رات گئے تک ہم باہر کھڑے رہے لیکن ہماری گفتگو کا
 موضوع ہمیشہ قیام پاکستان اور مسلمانوں کی سر بلندی ہوتا۔

ایک روز وقار میرے کمرے میں داخل ہوا تو اس کی
 حالت دگرگوں تھی۔ چہرے پر ہوریاں اڑ رہی تھیں اور اس
 کے لیے بات کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ میں نے اسے گھاس
 بھر پانی پیش کیا اور صورت حال کی وضاحت مانگی۔ تب
 اس نے کہا: ”یعنی! طوفان بڑا آنے ہی والا ہے۔ چند روز
 سے کانگریس پسند اخبارات نے جو اوہم مچا رکھا تھا
 اسے لاہور کی غیر مسلم آبادی نے مٹا دیا۔ پرتانے کا
 فیصلہ کر لیا ہے۔ میں نے خود اپنے کانوں سے ان کی
 منصوبہ بندی سنی ہے۔“

”وہ کیسے؟ تم وہاں کیسے جا پہنچے۔“ میں نے پوچھا۔
 ”تم جانتی ہو کہ میں نے اپنی ہم جماعت کا مٹی پر کتنا
 برا احسان کیا تھا۔“

”تمہارا شمارہ اس کے بھائی رام داس کی پیاری کی
 طرف ہے۔“
 ”ہاں وہی رام داس والا قصہ۔ جب پہلے میں جٹلا ہوا
 تھا اور میں نے ایک پرانے ٹوٹکے سے اس کی جان بچائی
 تھی۔“

”ہاں ہاں میں خود حیران تھی کہ تمہیں بڑی بوڑھیوں
 والا ٹوٹکا کیسے یاد آ گیا تھا۔“

”جناب میری دوا دی ماں نے یہی ٹوٹکا مجھ پر آزمایا
 تھا جب بچپن میں اس موڈی مرض میں مبتلا ہوا تھا۔ اس نے
 بیاز کا پانی کھال کر مجھے پلایا تو میں بھلا چکا ہو گیا۔ کافی کے

مشکل کا حل آجاتا۔

ہو گیا۔ تب ہم اس کی منصوبہ بندی کو زیر بحث لائے۔ وہ منصوبہ بندی جس کے متعلق مجھے اس وقت تک خبر نہ تھی۔ باجی یحییٰ خاموش ہو گئی اور تجسس سے میرا ہر حال ہو رہا تھا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ ان ۲ افراد نے سیکڑوں بلوائیوں پر قابو پائے یا نہیں۔

”رات بھٹک چکی تھی جب وقار نے اپنی منصوبہ بندی میرے کوشش لڑاری۔ منصوبہ واقعی شاندار تھا۔ بلوائیوں کے جلوس کا آغاز ایک بڑے مندر سے ہونا تھا جو چوک شاہ عالم کے قریب واقع تھا۔ اب مندر بے آباد ہے۔“ باجی نے کہا ”منصوبے کے مطابق وقار نے خود اس جلوس میں شریک ہونا تھا۔ لاہور کے حالات کسی کڑی کمان کی تانت کی طرح تھے ہوئے تھے۔ مارچ کے وسط میں پولیس کا اعلیٰ افسر ہلاک ہو چکا تھا اور اہم بات یہ کہ فرنگیوں کی ان تھک کوششوں کے باوجود اس پولیس کمانڈر کا سر نہیں ملتا تھا۔ خاکساروں نے جانے اسے کہاں غائب کر دیا تھا۔ تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ تھک پولیس کی حالت کتنی رعب ہوئی؟“ یہ سوال باجی نے مجھ سے کیا۔

”جی ہاں ان کی جان ٹھٹھنے میں آگئی ہوگی۔“ میں نے مختصر جواب دیا تاکہ کہانی کا تسلسل مجروح نہ ہو۔

”میں نے وقار کو اس بات پر راضی کر لیا کہ میں بھی اس جلوس میں شرکت کروں گی۔ پہلے تو وقار نے صاف انکار کر دیا مگر میں نے اسے دہل چیش کی کہ فرض کرو تم اس جلوس میں شہید ہو جاتے ہو تو میں اس کے بغیر زندہ رہ کر کیا کروں گی؟ یہ دلیل بڑی اثر کن تھی لیکن اب اس نے ہتھیار ڈال دیے۔

ہم نے اپنے منصوبے کی جزئیات مکمل کر لیں۔ اس کی ایک ایک بات پر غور کیا۔ ہمارا مقصد جو شیعہ بلوائیوں کی نفرت کا لڑخ بدلنا تھا۔ اگر ہم اس میں کامیاب ہو جاتے تو باقی کام خود بخود ہو جاتا۔ بلوائیوں کو اپنی پڑ جاتی اور وہ تحریک پاکستان کے خدام کو بھول ہی جاتے۔ ہم دونوں نے ہندوستان لباس زیب تن کیا۔ میں نے باقاعدہ بندیا بھی لگائی۔ سازشی بڑے اہتمام سے باندھی اور

ایک بار جب ایمان کے خلاف حملاً کھولا تو جنگ قادریہ کا سارا منصوبہ نماز کے دوران مرفارق کے ذہن میں آیا۔ دوسرا واقعہ بھی کسری کے خلاف حملاً جنگ کا ہے۔ جب مرفاروق پریشان ہو گئے تو وہ جیل رات پر تشریف لے گئے اور وہاں ۲ رکعت نماز پڑھنے لگے۔

میں نے بے صبری سے کہا ”جی ہاں! بالکل ٹھیک۔“ نسل نماز کے فوراً بعد جیل رات بوجہ زلزلہ لرزے لگا تھا اور مرفاروق نے اپنا کوزہ اٹھ کر پیاز کی چتر چلی زمین پر مارا اور پیاز کو فوراً رک جانے کا حکم دیا۔ عقل پکرا دینے والی بات یہ ہوئی کہ وہ پیاز اپنی اوقات پر آکر ختم گیا۔

”ہاں ہاں! تم ٹھیک سمجھتے ہو۔“ باجی نے سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا ”خیر! ہم نے فوراً وضو کیا اور رب کے حضور سجدہ ریز ہو کر درخواست کی کہ اللہ تعالیٰ، ہنگامی طور پر اس مصیبت کا حل ہمارے دماغوں میں ڈال دے۔“

فصل نماز سے فارغ ہو کر ہم خاموشی سے بیٹھ گئے۔ یہ انداز ۲۰ رات تک جوں کا توں رہا۔ پھر اچانک وقار نے بلند آواز سے کہا، بس بس سارا مسئلہ حل ہو گیا۔ پھر وہ اٹھ کر بچوں کی طرح لب کشا ہوا۔ ”بیارے اللہ میاں ہم ایسا ہی کریں گے۔“

”کچھ مجھے بھی بتاؤ کہ اللہ میاں سے یہ کیا راز و نیاز ہو رہے ہیں۔“

وقار نے اچانک خاموش ہو کر میری طرف دیکھا اور پھر اچھل کر مجھے دبوچ لیا۔ اب وہ پاٹھوں کی طرح مجھے اٹھائے پکڑ کاٹنے لگا۔ میں نے منصوبہ ہی منسے سے کہا ”اوئے پاگل لڑکے! مجھے زمین پر رکھو ورنہ پٹائی کر بیٹھوں گی۔“

اس نے مجھے زمین پر رکھ کر کہا: ”بیٹی! آپ کا یہ پاگل آدمی اب سارے لاہور کے بلوائیوں کو ناکوں چنے چبوائے والا ہے۔ اللہ میاں تو واقعی عظیم ہے بلکہ عظیم ترین (Greatest) ہے۔ اب آئے گا مزہ جب سارے انتہا پسند میرا شکار ہوں گے۔ وقار کے جنون کو لگام دینے میں کافی دیر لگی مگر آخر کار وہ کام کی باتیں کرنے کے قابل

لاہانے پرتھے مگر حالات ہمارے حق میں جا رہے تھے۔

ڈراما اس وقت شروع ہوتا تھا جب سرقاں بازار سے تھوڑے فاصلہ پہلے ایک دکان کی مرمت ہو رہی تھی اور وہاں اینٹیں بڑی ہوتی تھیں۔ رفتہ رفتہ وہ جگہ قریب قریب تھی۔ ہجوم کی ایک نفسیاتی کیفیت ہوتی ہے۔ اسے بھیڑ چال کہتے ہیں۔ ایک بھیڑ اگر کنوئیں میں گر جائے تو ساری بھیڑیں اس کا تابع کرتی ہیں۔ جیسا کہ گلوے گلوے گلوے وقار بھی جلوس نے آگے نکل جاتا مگر پھر اپنا فاصلہ کم کر کے لوٹ آجے۔ اس روز اس نے ایسے ایسے جے کارے (نعرے) جس میں بے ہوشی ہوئی جائے) گلوئے کہ میں اش اش کر اٹھی۔ میں جانتی تھی کہ وقار ہجوم کے مزاج کے مطابق کھیل رہا تھا۔ جیسے تیز گیند باز کو اچھا بلے باز مہارت سے پھیلنے ہوئے آنے والی گیند کا صرف رخ بدل کر چوکا چوکا جز دیتا ہے۔ بعض نعرے تو مجھے سمجھے میں ڈال رہے تھے مگر ہم نے اس صورت حال پر بھی غور کیا ہوا تھا کہ جب وقار اپنے دونوں ہاتھ بلند کرے تو جواباً ہمیں زندہ یاد کہنا ہے ورنہ مردہ یاد مگر وقار اس صورت حال کو خود بھی قابو کر رہا تھا۔ اگر جلوس کی طرف سے جیسا کہ میں جان نہ ہوتی تو وہ خود مردہ یاد کہنا کر دیکھ کر غور و ہوا دیتا۔ بعض نعروں کی اسے راہنمائی کرنی پڑتی مثلاً "قائم ہوگا رام رام راج، رام راج۔ مہاتما گاندھی زندہ باد، جناح پونچھا مردہ باد، بنگالی ملاں مردہ باد۔ اس سے مراد مولانا اے کے فضل حق تھے۔

جب ہماری منزل قریب آگئی تو منصوبہ بندی کے
تین مطابق وقار نے چیمبرز کی کپڑی قوت سے جیچ کر
کہا ”فرنگی پٹو! ہائے ہائے، بھارت مانتا قائم رہے جی قائم
رہے۔“ تسلیم ہندو منظور، منظور۔ پھر اس نے اصل نعرہ
لگایا: ”ساراج! ہم سب نے جواب دیا مردہ باد۔ ہماری
دیکھا دیکھی چند ہندو جو شیلے نوجوان بھی ہم دونوں کے
قریب آچکے تھے۔ یہ مردہ باد ان کی زبانوں سے بھی نکلا
مگر وقار کے مطلب کو کوئی نہ سمجھ سکا کہ وہ جلیں کو کدھر
لے جا رہا تھا۔ جب اس نے دوسری بار کہا ”فرنگی راج تو

وقت مقرر سے پہلے اٹھ جائے اور ذات پر پہنچ گئے۔ ہماری جان کاری کے مطابق جیلوں کا آغاز ۱۱ اور ۱۲ بجے کے درمیان ہونا تھا۔

بلوایوں کی انتظامیہ نے سبکے بند کام کر رکھا تھا کیونکہ ۹ بجے کے قریب ہی لوگ آنا شروع ہو گئے۔ بانٹاں والے بازار کے قریب مسجد شب بھر تک انسان ہی انسان تھے۔ یہ الگ بات کہ ان کے ارادے شیطان تھے۔ اس جہم کی اطلاع پولیس کو بھی ہو گئی۔ وہ تو اس زمانے میں کو یا پہلے ہی تیار بیٹھی تھی۔ ہمیں یہ خبر مل چکی تھی کہ پولیس کے اہلکار جھک سے اڑ جانے والا مواد بن چکے تھے۔ ان کو حکم تھا کہ ہر بلوے کو وہی باتوں سے ملیا میٹ کر دیا جائے اور اطاعت نہ کرنے والوں سے نمٹا جائے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ جلوس شروع ہونے سے پیشتر ہی پیدل اور گھڑسوار پولیس کی بھاری نفری بھی وہاں آ موجود ہوئی۔

منصوبہ بندی کے مطابق قاتل ٹولیوں نے سنہری ازار پہننے ہی اپنی اپنی منزل کی طرف جانا تھا۔ ہم چاہتے تھے کہ ان کی کوئی ٹولی اس جگہوں سے الگ نہ ہو اور تحریک پاکستان کے خدام محفوظ رہیں۔ جلوس ڈرانا خیر سے شروع ہوا۔ بلوائیوں کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ وہ نکسسم ہند کے خلاف نعرے بازی کر رہے تھے۔ ”دھرتی ماتا کے گڑے نامعلوم نامعلوم“ بھی کبھی وہ فرنگی حکمرانوں سے درخواست کرتے کہ قرار دیا پاکستان پر توجہ نہ دی جائے۔ باقی کا مدھی جی اور دیگر نیتاؤں کے حق میں نعرے لگائے جا رہے تھے۔

جلوس کی دونوں جانب پولیس کے اہلکار مستعد ہو کر ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ میں نے وقار سے سرگرمی کی "جانم! ذرا دیکھو ان بلوائیوں کا کیا حشر ہونے جا رہا ہے۔" وقار تو گویا جلوس کی قیادت کر رہا تھا۔ اس کا چوڑا و خروش مصنوعی نہیں سچا لگ رہا تھا۔ وہ اچھل اچھل کر ہنسنے کے خلاف نعرے لگا رہا تھا۔ شرکائے جلوس اس کے نعروں کا جواب دے رہے تھے۔ مگر کوئی اس کی اصلیت سے واقف نہ تھا۔ ہم دونوں گویا آتش فشاں کے

پاک بھلا لگا۔ اب میں ہر صورت میں ہسپتال چانا چاہتی تھی۔ درمیان میں صرف بائیس والا بازار تھا۔ اس کے بعد میری منزل آجانی اور میرا وقار شاید محفوظ ہو جاتا۔ وقار کا خون مجھے رنگین کر رہا تھا۔ جب میں چوک میں پہنچی تو مجھے اپنی منزل دور لگنے لگی اور میرے قدم خود بخود مسجد شب بھری طرف اٹھنے لگے۔ کوئی زبردست طاقت مجھے اس راستے پر ڈال رہی تھی۔ ذرا اندازہ لگاؤ کہ ایک لڑکی ایسے رشتی کو اٹھائے جس کے لیے وہ خود کل و کھن بن رہی ہو، چوک میں کھڑی ہے۔ وہاں مسلمان اکٹھے ہو رہے تھے کہ پولیس کی کارروائی نے اس واقعے کی تشہیر کر دی تھی۔ مگر اب وہاں جلوس والوں کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ سب بزدل راہ فرار اختیار کر گئے تھے۔

گو کیا ہمارا منصوبہ سو فیصد کامیاب رہا اور اب تحریک پاکستان کے خدام یقیناً محفوظ تھے کہ بلوائیوں کو اپنی پڑائی تھی۔ مگر یہ کارروائی ہمیں بہت بھی پڑی کہ میرا وقار لاواں موت کی وادی میں تھا۔ جب میں مسجد کے قریب پہنچی تو اندر سے امام صاحب بچوں کو قرآن پاک پڑھا کر باہر نکل رہے تھے۔ ہندوان لباس میں ایک لڑکی کو خون میں لت پت دیکھ کر وہ گھبرا گئے مگر میں نے ان کو یقین دلایا کہ میں مسلمان ہوں اور یہ رشتی رسد شہادت پر فائز ہونے والا بھی مسلمان ہے۔ اس وقت وقار زندہ سلامت تھا۔ اس نے خود امام صاحب کو سلام کیا۔ امام صاحب نے جواب دیا تو میری جان میں جان آئی۔ رشتی کو مرزا بے قریب صف پر لٹا دیا گیا۔

جب وقار نے صاف الفاظ میں کہا، مولانا ادھر میرے قریب آجائیں اور مجھے سورہ البقرہ کا آخری رکوع سنائیں۔ میں حضور اکرم ﷺ کے قلام سعد بن معاذ کے طریقے پر عمل کر کے اپنی موت کو ٹالنے لگا ہوں۔ پریشان نہ ہوں، موت میرا انتقال کر لے گی۔ میں نے حیرت سے وقار کو دیکھا پھر مولوی صاحب کو دیکھنے لگی۔ مولوی صاحب نے فرمایا ”نبی جنگ احزاب میں سعد بن معاذ کو مہلک زخم آیا تھا مگر انھوں نے اللہ تعالیٰ

اس کے جواب میں جہنم نے پر جوش طریقے سے مردہ یاد کہا۔ ادھر وہ مرمت ہونے والی دکان قریب آچکی تھی۔ وقار نے آخری حربے کے طور پر وہاں سے اینٹ کا ایک ٹکڑا اٹھایا اور پوری قوت سے ایک پولیس والے کی طرف اچھال دیا۔ دوسری اینٹ میں نے ٹھٹھکی جون سے ایک سپاہی کے آگنی نوپ پر لگی۔ چند ایک اینٹیں اور بھی برسنے لگیں۔ بس ہم نے بھس کو چنگاری دکھائی تھی۔ پولیس کمانڈر نے چیخ کر حکم دیا۔ ”گولی چلاؤ“ پولیس والے تو گویا پیلے ہی تیار بیٹھے تھے، انھوں نے جلوس پر گولیاں چلانا شروع کر دیں لوگ گولیاں کھا کھا کر گرنے لگے۔ جلوس کے عقب میں بھگدڑ مچ گئی اور لوگ اپنی جانیں بچا کر بھاگ نکلے مگر جلوس کا اگلا حصہ یعنی فرنٹ بدستور ڈٹا رہا۔ مجھے اینٹ مارتے ہوئے کسی سپاہی نے دیکھ لیا تھا۔ اس نامراد نے مجھے ہدف بنایا مگر جوشتر اس کے گولی مجھے ستر آخرت کی طرف روانہ کرتی، میرا چاہنے والا میرے آگے آگیا۔ حالانکہ کچھ دیر پہلے وہ مجھ سے فاصلے پر تھا۔ گولی اس کے سینے میں لگی، گولی جو میرے لیے واقعی لگی تھی۔ یہ کہہ کر میری باقی خاموش ہو گئی اور اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔ میں نے عملاً ان کو پہنے دیا ورنہ اس کا کلیجہ پھٹ جاتا۔ یہ آنسو تو اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہیں۔ استاد قمر نے کہا تھا:

سو زل جے آنسوؤں کے اک قیامت ہے قمر
اس سے پوچھو جس کا گھر جلتا ہو اور پانی نہ ہو
”پھر کیا ہوا“ میں نے لرزیدہ سنجے میں پوچھا۔
”وقار کو میں نے فوراً تھام لیا۔ جانے مجھ میں اتنی طاقت کہاں سے آگئی کہ میں نے وقار کو ککاوے میں بھر کر کاندھے پر اٹھالیا۔ اس کے سینے سے خون کا فوارہ چھوٹ رہا تھا اور میں اس کے پاک خون سے رنگین ہو رہی تھی۔“
”کیا آپ نے وقار کو کاندھے پر رکھ لیا تھا؟“ میں نے حیرت کا اظہار کیا۔
”بالکل روئی کے ایک گڈے کی طرح وہ مجھے

کا فیصلہ نیتوں سے ہوتا ہے۔ انہوں نے خود آپ سے نکاح کی بات کی تھی۔ گویا یہ ان کا قبول کہنا تھا۔ بلکہ انہوں نے آپ کو قول و فعل سے قبول فرمایا تھا لہذا آپ کی شادی ہو گئی تھی۔“

”الاعمال بالنیات“ یا نبی نے زریں و ہریاں اور مسکراتے لگی۔ ”برخودار تو نے میرا بوجھ ہلکا کر دیا۔ جانے یہ بات میرے ذہن میں کیوں نہیں آتی تھی۔ واقعی اعمال کا فیصلہ تو نیت پر ہوتا ہے۔“

تھوڑی دیر بعد ہم جمو پڑی سے کچھ فاصلے پر وقار کی قبر پر فاتحہ خوانی کر رہے تھے۔ بعد ازاں میں نے تربت کے سر ہائے کھڑے ہو کر شعر پڑھا:

بنا کر رند خوش رسے مخا کرو خون غلطیدن
خدا رحمت کند این عاشقان پاک طہیت را

اس طرح میں ۱۹۶۰ء میں طویل مدت کے لیے امریکا چلا گیا جہاں میری پیشہ ورانہ تعلیم کی تکمیل ہوئی۔ واپس آیا تو پاکستان کے مختلف علاقوں میں مناسب مقامات پر ریڈیو اربوں کا سلسلہ قائم کیا۔ اس دوران میں مشرقی پاکستان گیا اور موت کے منہ سے زندہ نکل آیا۔ اس طرح عرصے تک باقی سے رابطہ نہ ہو سکا۔ اس داستان کا الٹناک پہلو یہ ہے کہ دسمبر ۱۹۷۱ء میں جس روز پاکستان دولت ہو، باقی یعنی ٹرانسپور پر خبریں سن رہی تھی۔ سقوط دھماکا کی خبر نشر ہوئی تو ان کے دل نے بغاوت کر دی اور دھڑکن ہی بھول گیا۔ اس الٹناک حادثے کے ۱۰ ارور بعد مجھے خبر ملی اور میں وہاں پہنچا مگر وہاں کچھ بھی نہیں تھا سوائے خالی جمو پڑی اور ایک جگہ قبر کے۔ کاروبار دنیا بوی چتر پانچم میں پاک فضا نیے سے سبکدوش ہو گیا تو بھولے ہوئے سارے کام یاد آئے۔ ہر خوشاں کی زیارت کی تو وہاں جمو پڑی تھی نہ وہ قبر جہاں نورانی شمع دفن تھی۔ مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ میرا لگایا ہوا سادو سا کتبہ ایک جگہ رو ٹھہرا ہوا تھا۔

کے حضور درخواست کر کے مہلت لے لی تھی۔ اسے وکیل (Stay Order) کہتے ہیں اور وہ درخواست قبول بھی ہو گئی تھی۔ شہدا کو یہ مہلت حاصل ہے اور موت ان کا انتظار کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔

حب وقار نے بظاہر بے سکی آرزو کا اظہار کیا اور کہا یعنی جانم! میرے قریب آ جاؤ اور مولوی صاحب سے کہو کہ وہ ہمارا نکاح پڑھا دیں۔ کیا تمہیں میری بیوی بننا قبول ہے؟ میں روتے روتے مسکراتے لگی البتہ مولوی صاحب حیرت میں ڈوب گئے۔ موانا! جلدی کریں وقت تنگ ہے۔ میں جنت میں بھی اسی لڑکی کو اپنی بیوی دیکھنا چاہتا ہوں۔ جب میں نے بلند آواز میں اقرار کیا ”مجھے ہزار بار لاکھ بار قبول ہے تمہاری بیوی بننا۔“

”بیٹا جی! میں تمہارا عا بھجھ گیا مگر زرا مکر، میں وہ گواہ لے آؤں۔“ یہ کہہ کر مولوی صاحب بھاگ بھاگ باہر نکلے اور پل بھر میں لوٹ آئے۔ ان کے ساتھ ۲ پہلو ان قسم کے آدمی تھے جو قرعہ جی اکھاڑے سے آئے تھے۔ پہلو انوں کا یہ اکھاڑہ سادے لادور میں مشہور ہے۔ مولوی صاحب نے حمزہ سے نکاح کی رسم ادا کرنی شروع کر دی۔

”یہ شادی بھی انوکھی شادی تھی۔ دلہا کا سر دلہن کی گود میں تھا اور وہ دلہا موت کو روکے ہوئے اپنا نکاح پڑھا رہا تھا۔ ہے نا انوکھی بات۔“ باقی نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کوئی انوکھی بات نہیں، وقت کے مطابق تھی یہ کارروائی۔“ مگر انہوں نے جب مولوی صاحب سب نکاح والی حدیث تلاوت فرما رہے تھے تو وقار کی طلب کی ہوئی مہلت پوری ہو چکی تھی۔ وہ آخری پہلی لے کر مجھے قبول کرنے سے چند منٹ ہی پہلے بسا۔ آج تک میری سمجھ میں نہیں آ سکا کہ میری شادی ہوئی۔“ یہ کہہ کر باقی نے سر جھکا لیا۔

”ہاں! آپ کی شادی ہو گئی تھی کیونکہ آپ نے گواہ کے سامنے وقار کو قبول کر لیا تھا اور یہ وقار صاحب آپ کو پہلے ہی قبول فرما چکے تھے کہ الاعمال بالنیات اعمال



انسٹریو

دنیا کے ایک بڑے ادارے
کے خالق سے ملیے

ہماری ایک حساندان کے مانند ہے

66

گوگل کے شریک بانی سیری تیج سے ایک فکر انگیز اور دلچسپ ملاقات

www.paksociety.com

جو کاروبار 1998ء میں ۲ لاکھ روپے سے شروع کیا، وہ آج پوری دنیا میں پھیل چکا۔ گوگل میں ساڑھے اٹھارہ ہزار ملازمین کام کرتے ہیں اور کمپنی کی آمدن پاکستانی کرنسی میں کھربوں روپے سالانہ ہے۔ گوگل کا شمار دنیا کی بڑی کمپنیوں میں ہوتا ہے۔ اس کی بین الاقوامی مقبولیت کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ گوگل کے صدر دفتر میں ملازمین کو سیکڑوں سہولیات حاصل ہیں مثلاً مفت کھانا، کھیلنے کی مخصوص جگہیں، فلم و تھیٹر، پیراکی کے تالاب،

کئی سال پہلے کی بات ہے، جب ایک گیارہویں سالہ لڑکی لڑکوں، لیری چیچ اور سرنی ہرن نے آئی ٹی کمپنی گوگل کی بنیاد رکھی۔ آج پوری دنیا میں تعلیم حاصل کرنے والے لاکھوں طلباء و طالبات کی پہلی تمنا یہی ہوتی ہے کہ کاش انہیں گوگل میں ملازمت مل جائے۔ وہ یہ ہے کہ گوگل کے دفتر دنیا میں کام کی بہترین جگہیں تصور کی جاتی ہیں۔

یہ

www.paksociety.com

میں سمجھتا ہوں کہ گوگل ایسے ہی منصوبوں پر کام کر رہا ہے۔
سن: ایک عشرہ قبل گوگل میں چند سو لوگ ملازم تھے،
آج ہزاروں ملازمت کرتے ہیں۔ کیا ان کے سامنے بھی
آپ کا مشن واضح ہے؟

ج: ۱۹۹۸ء میں جب گوگل کا آغاز ہوا، تو ہمارا مشن
یہی تھا کہ بکسری ہوئی عالمی معلومات منظم کر دی جائیں۔
مجھے یاد ہے، اس زمانے میں کمپنی میں تقریباً ۱۰۰ افراد
ملازم تھے۔ میرے دوست مجھے کہتے ”تمہارے ہاں
۱۰۰ لوگ ملازم ہیں۔ یہ بہت بڑی تعداد ہے لیکن تم مزید
کارکن کیوں چاہتے ہو؟“

میں انھیں بتاتا کہ ہم کسی ایک ملک نہیں پوری دنیا کی
معلومات منظم کر رہے ہیں، لہذا ہمیں بہت سارے ساتھی
درکار ہیں۔ یہ چند سو لوگ بھی صحیح طرح انجام نہیں دے
سکتے۔ ہم خوش قسمت ہیں کہ ہم نے جو منصوبہ بندی کی تھی،
وہ کامیاب ہوئی۔ ہمارے کام نے پوری دنیا پر گہرے
اثرات مرتب کیے۔ لیکن یہ کامیابی پانے کی خاطر ہمیں
زبردست محنت و مشقت کرنا پڑی۔

میں سمجھتا ہوں کہ گوگل کا کام ابھی ختم نہیں ہونے والا
کیونکہ دنیا میں بے شمار مسائل ہیں۔ ہمارے جتنے وسائل
ہیں، ان کی حد میں رہتے ہوئے ہم مسائل حل کرنے کی
اپنی سعی کرتے رہیں گے۔

سن: آپ گوگل کے ماحول کو کس طرح بیان کریں گے؟
ج: میرے دادا کارکن بنانے والے ایک کارخانے
میں کام کرتے تھے۔ انھوں نے ایک ہتھیار تیار کیا تھا
تاکہ وہ کارخانے میں خود کو ماکان اور فنڈہ گرد عناصر سے
محفوظ رکھ سکیں۔ وہ ہتھیار آج بھی میرے پاس محفوظ
ہے۔ یہ لوہے کا ڈنڈا ہے جس کے سرے پر فولادی گولا
نصب ہے۔ گویا اس زمانے میں کمپنیوں کے ملازمین کو اپنی
حفاظت کے لیے ہتھیار رکھنے پڑتے تھے۔ اس لحاظ سے
آج کمپنیوں کے ماحول میں انقلابی تبدیلی آچکی۔ بحیثیت
لیڈر میری ذمہ داری یہ ہے کہ گوگل میں ہر کسی کو
ترقی و کام کے عظیم مواقع ملیں۔ ہر کارکن کو محسوس ہو کہ وہ

سوائے خانے اور نہانے کیا کچھ۔ غرض کمپنی کو خوش کرتی
ہے کہ ملازمین کو تفریح کے گونا گوں مواقع میسر آئیں۔ اس
عمل کے پیچھے یہ فلسفہ پوشیدہ ہے کہ یوں ملازمین خوش
رہتے، ذہنی سکون پاتے اور زیادہ کام کرتے ہیں۔

لیکن گوگل میں ملازمت حاصل کرنا آسان نہیں، یہ
کمپنی دنیا کی بہترین یونیورسٹیوں سے تعلیم یافتہ صرف
وہی طلبہ و طالبات منتخب کرتی ہے جن کے اعلیٰ نمبر ہوں۔
جب بھی متوقع امیدوار انٹرویو کے وہ گیارہ مراحل سے
گزر رہے ہیں جن میں ان کی مختلف صلاحیتیں جانچی جاتی
ہیں۔ اب اگر گوگل نے جانچ کے کچھ معیار بلکے کیے ہیں
اور امیدوار چار پانچ مراحل ہی سے گزارے جاتے ہیں۔
لیبرری بیچ اس وقت گوگل کا سی ای او ہے۔ اس نے
پچھلے ماہ مشہور امریکی رسالے فورچون کو ایک انٹرویو دیا۔
اس میں لیبرری نے مختلف موضوعات مثلاً گوگل کے قیام،
کام، وقار میں خاندان ماحول اور مفت طعام کے متعلق
دلچسپ باتیں کیں۔ اس انٹرویو کو علاحدہ قسط خدمت ہے۔

سن: گوگل میں ملازمت کی حالت میں پچھلے ایک
عشرے کے دوران کوئی تبدیلی آئی ہے؟

ج: ظاہر ہے، جب کمپنی بڑی ہو اور اس میں زیادہ
ملازمین آجائیں، تو حالات بدل جاتے ہیں۔ لیکن سنا فورڈ
(یونیورسٹی) میں تعلیم پاتے ہوئے میں نے جانا کہ انسان
جب یونیورسٹی کا طالب علم ہو، تو وہ کوئی بھی کام کر سکتا
ہے۔ میں نے یہ بات نہیں بھلائی، چنانچہ ہم یونیورسٹیوں
سے ذہین ترین طلبہ و طالبات اور روشنی دلانے گوگل کے
آتے ہیں۔ اس تکنیک سے ہمیں بہت فائدہ پہنچا اور گوگل
نے حیران کن ترقی کی۔

دراصل دنیا بدلنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ اہم
منصوبوں پر کام کریں۔ تب ہی انسان اپنے اندر
جوش و جذبہ محسوس کرتا ہے۔ جب دو صبح اٹھے، تو اس میں
نئی اُمقیں اور کچھ کر گزرنے کا جذبہ جنم لیتا ہے اور یہی
بنیادی بات ہے۔ آپ کو چاہیے کہ ہاں مقصد اور کچھ کر دینے
والے منصوبوں پر عمل پیرا ہوں کہ دنیا میں انہی کی کمی ہے۔

ہے۔ ہم ساقیوں کو مزید طبی سہولیات دینا چاہتے ہیں تاکہ وہ ذہنی و جسمانی طور پر صحت مند رہیں۔

سن: کیا مفت کھانا گوگل میں "ممبرک" حیثیت رکھتا ہے اور کیا یہ ملازمین کو ہمیشہ ملتا رہے گا؟

ج: مجھے ہمیشہ کا تو علم نہیں، لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ اس سے کمپنی کو فائدہ پہنچا ہے۔ مجھے اخراجات کی کوئی پروا نہیں، بس یہ فکر ہے کہ بعض لوگ مفت کھانا کھا کر فریہ نہ ہو جائیں۔ مونے لوگ پھر عموماً کام صحیح طرح انجام نہیں دیتے۔ بہر حال مفت کھانے کی بدولت کمپنی ایک خاندان کے مانند نظر آتی ہے اور پھر خاصی حد تک یوں صحت مند طبی عادات نے بھی جنم لیا مثلاً لوگ جان رہے ہیں کہ زندہ رہنے کے لیے کھانا کھایا جائے، کھانے کی خاطر زندہ نہ رہا جائے۔

سن: آپ اور سگی جب غیر شادی شدہ تھے، تب بھی آپ کا نقطہ نظر تھا کہ بیوی، بچوں کو بھی بھرپور توجہ ملنی چاہیے۔ آپ اب خود بیوی بچوں والے ہو چکے، تو گھر اور دفتر کے مابین توازن کا نقطہ نظر تبدیل ہوا؟

ج: یہ نقطہ نظر بالکل تبدیل نہیں ہوا۔ ہم انتہائی لچک دار ہیں، اسی لیے ملازمین کو پوری سہولت دیتے ہیں کہ وہ اپنے خاندان سے بھرپور تال میل رکھیں۔ دراصل ملازمین کو عزت دی جائے، ان کی خواہشات کا احترام کیا جائے، تو وہ کمپنی کے لیے زیادہ مفید ثابت ہوتے ہیں۔

سن: لوگ کہتے ہیں کہ گوگل کے تمام فیصلے صدر دفتر میں ہوتے ہیں۔ کیا یہ بات درست ہے؟ کیونکہ آپ کی کمپنی کے دفاتر پوری دنیا میں پھیلے ہیں۔

ج: دراصل ہماری افرادی قوت کا ۴۰ فیصد صدر دفتر میں جمع ہے، چنانچہ بیشتر فیصلے وہیں انجام پاتے ہیں۔ لیکن مجھے امید ہے کہ مستقبل میں صدر دفتر کو مرکزی حیثیت حاصل نہیں رہے گی۔ ہم ایسے آلات بنا رہے ہیں جن کی مدد سے ہمارے ملازمین دنیا کے کسی بھی حصے میں بیٹھ کر مفید و موثر کام کر سکیں۔



اپنے کام سے باہر معنی اثرات مرتب کر رہا ہے اور یہ کہ اس کی کوششوں سے معاشرے میں نیکی و خیر جنم لے رہے ہیں۔ گوگل کا مشن یہی امر ہے۔

سن: گوگل میں ملازمین کو کئی سہولیات میسر ہیں مثلاً مفت کھانا، مساج مراکز وغیرہ۔ آپ کے نزدیک ملازمین کو ملنے والی سہولیات کتنی اہم ہیں؟

ج: یہ سہولیات کسی ایک فرد کو مد نظر رکھ کر سامنے نہیں آئیں۔ یہ نہایت ضروری ہے کہ کمپنی ایک خاندان میں داخل جائے، لوگ یہ محسوس کریں کہ وہ کمپنی میں حصے دار ہیں اور یہ کہ وہاں انھیں بالکل خاندان جیسا ماحول میسر ہے۔ دراصل ملازمین کے ساتھ ایسا سلوک کیا جائے، تو پیہ اور بڑھتی اور ترقی ہوتی ہے۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ دیکھا جائے، کارکن کتنے گھٹنے کاٹتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ وہ کام کھاتا کر رہا ہے اور آدھ معیاری ہے؟

گوگل میں ہم ایسے طریقوں کی تلاش میں رہتے ہیں جن کے ذریعے ملازمین اور مالکوں کے مابین تعلقات خوشگوار ہو سکیں تاکہ کام بہترین طور پر انجام پائے۔ اسی لیے ساقیوں کی صحت پر بھی ہماری توجہ ہے۔ ہماری سعی ہے کہ وہ ہمیشہ تندرست رہیں اور بڑی عادات مثلاً سگریٹ نوشی سے چھٹکارا پالیں۔ یہی وجہ ہے کہ دیگر کمپنیوں کی نسبت ہمارے طبی اخراجات کم ہیں۔ پھر ہمارے لوگ زیادہ خوش اور سودمند ہیں جو زیادہ اہم امر ہے۔

سن: کیا آپ ان اقدامات کا ذکر کر سکتے ہیں جو ملازمین کی صحت بہتر کرنے کے لیے کیے جاتے ہیں؟

ج: دیگر بڑی کمپنیوں کے ملازمین تندرست رہنے کی خاطر عموماً بڑے جتنازیم جاتے ہیں۔ لیکن ہم نے دیکھا ہے کہ ملازمین وہ جتنازیم پسند کرتے ہیں جو قریب ہو، چاہے وہ چھوٹا ہی ہو۔ وجہ یہ ہے کہ دفتر سے نکل کر کار پر جتنازیم جانا اور پھر پارکنگ وغیرہ کمبیزوں سے نبرد آزما ہونے میں بہت سا وقت و توانائی ضائع ہوتی ہے۔ اسی لیے ہم نے تمام بڑے دفاتر میں چھوٹے جتنازیم بنا دیے۔ مزید برآں ہمارے ہر دفتر میں ایک ڈاکٹر پیشہ

ٹینڈر نوٹس

درج ذیل کام کے لیے ای/ایم سائیڈ پر اہل کئیگری کے پاک پی ڈبلیو ڈی کے منظور شدہ ٹھیکیداران سے فیصد تناسب ریٹ کی اساس پر سربمہر ٹینڈر مطلوب ہیں۔ ٹینڈر بتاریخ 21-03-2012 کو دن 11:00 بجے تک دفتر زیر دستگی میں پہنچ جانے چاہئیں۔ ٹینڈر رزاسی روز 02:00 بجے دن حاضر رہنے کے خواہاں ٹھیکیداران یا ان کے مجاز نمائندگان کی موجودگی میں کھولے جائیں گے۔ ٹینڈر فارمز/ دستاویزات خواہشمند ٹھیکیداران کو دفتری اوقات کار کے دوران بتاریخ 20-03-2012 کو جاری کی جائیں گی۔ دیگر شرائط و ضوابط اور تفصیلات کسی یوم کار کو دفتری اوقات کار کے دوران دفتر زیر دستگی میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

Name of work	Estimated Cost Rs.	Earnest Money Rs.	Tender Cost Rs.
CONSTRUCTION OF 24 CAT-V HOUSES DOT (DT) ALLAMA IQBAL TOWN LAHORE. (SH: PUMPING SET).	520914/-	10418/-	500/-

شرائط و ضوابط :

- 1- ٹینڈر کے ساتھ ہر کام کے سامنے درج رقم کے لیے چیک ڈرافٹ/ ٹریسری چالان یا کال ڈیپازٹ بطور ضمانت بنام ایگزیکٹو انجینئر، سینٹرل ای/ایم ڈویژن-II، پاک پی ڈبلیو ڈی، لاہور آنا چاہیے۔
- 2- ٹھیکیدار کو سال برائے 2011-12 کے لیے اصل اعلیٰ ترین آرڈر اور تجدیدی سرٹیفکیٹ مع تصدیق شدہ فوٹو کاپی پیش کرنا ہوگی۔
- 3- ٹھیکیدار کو اورجنل انکم ٹیکس رجسٹریشن (این ٹی این) مع تصدیق شدہ فوٹو کاپی پیش کرنا ہوگی۔
- 4- ٹینڈر فارم صرف اورجنل ٹھیکیدار یا فرم کے مجاز نمائندگان جو اصلی موثر معتمد مع تصدیق شدہ فوٹو کاپی کے حامل ہوں گے، کو جاری کیے جائیں گے۔
- 5- ٹینڈر کھلنے کی تاریخ کو کوئی ٹینڈر فروخت/ جاری نہیں کیا جائیگا۔
- 6- بذریعہ ڈاک/ ٹیلیگراف یا کال ڈیپازٹ کے بغیر یا مقررہ تاریخ کے بعد موصول ہونے والے ٹینڈر رزیر فور نہیں لائے جائیں گے۔
- 7- ٹینڈر دستاویزات صرف کال ڈیپازٹ پیش کرنے پر جاری کی جائیں گی۔
- 8- مجاز اقدار ٹی ٹینڈر کو پی ٹی آر اے رولز-2004 کے مطابق منظور یا مسترد کرنے کا حق رکھتی ہے۔

ایگزیکٹو انجینئر، سینٹرل ای/ایم ڈویژن نمبر-II، 11-ایچ ٹرن روڈ،

پاک پی ڈبلیو ڈی، لاہور۔ فون نمبر: 042-99203610



۴۰۰ بچوں کے لیے مری آغوش پر کام جاری ہے یتیم بچوں کے لیے محبت بھری آغوش www.paksociety.com

عمرادریس

۸۰ ملین روپے سے "انف دسٹ" کا ملک گیر قرضہ لیا گیا (Orphan Family Support Program) پر ایک شہرہ پارک کے آفس

پائلٹ پراجیکٹ میں کامیابی کے بعد اس پروگرام کو پورے پاکستان کی سطح پر چلانے کا عزم رکھتی ہے۔ خالص اللہ کی خوشی اور رضا کے لیے شروع کیا جانے والا یہ کام ان شاء اللہ ہزاروں یتیم اور بے آسرا بچوں کو عزت، سہولت اور حفاظت دینے کا باعث بنے گا۔ اس خدمت اور نفع کے کام میں آپ بھی ذمہ دار احمد بن سکتے ہیں

www.Paksociety.com

کوئی

والدین یہ نہیں چاہتے کہ ان کے بچے ازل جائیں لیکن موت کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے۔ یہ کسی وقت بھی آسکتی ہے۔ موت یہ نہیں دیکھتی کہ کسی کے بچے چھوٹے ہیں یا جوان یا کسی خاندان کے تھیل کے اس جہان فانی سے رخصت ہو جانے کے بعد کفالت کیسے ہوگی۔ یہ اللہ کا نظام اور کسی معاشرے کا امتحان ہے کہ ان بچوں سے معاشرہ کیا سلوک کرتا ہے۔ انہیں کیا درجہ دیتا ہے، ان کو قومی سرمایہ خیال کرتا ہے یا محکوم و محتاج مخلوق سمجھتا ہے۔ اسلام نے جن اعمال کو بہت واضح طور پر صالح اعمال قرار دیا ہے ان میں یتیموں اور مسکینوں کی مدد کرنا بھی شامل ہے۔ اس ضمن میں حضور اکرم ﷺ کا فرمان ہے کہ یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں میرے ساتھ ایسے ہی ہوگا جیسے ہاتھ کی ۲ انگلیاں۔

ہمارے معاشرے میں یتیموں اور مسکینوں کی مدد روٹی اور کپڑے کی فراہمی کی حد تک ضروری جاتی ہے۔ لیکن ان بچوں کی مستقل اخلاقی اور مالی مدد کا تصور کم بڑے کا کار آتا ہے۔ الخدمت فاؤنڈیشن پاکستان نے اس حوالے سے وہیل کی اور ۲۰۰۲ء میں یتیم بچوں کی کفالت کا پروگرام شروع کیا۔ ضلع انک میں قائم کیے جانے والے یتیم بچوں کے لیے الخدمت کے پہلے پروجیکٹ کا نام ”آغوش“

رکھا گیا۔ جہاں ان بچوں کی تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ صحت اور خوراک کا خوب خیال رکھا جاتا تھا۔

۲۰۰۵ء میں آنے والے ہولناک زلزلے کے بعد ”آغوش“ پر خصوصی توجہ دی گئی۔ اس وقت ۲۰۰ بچے اس کیڈٹ کالج طرز کے دارالین (Orphan age) میں بلا مبالغہ ایک اچھی محفوظ اور باعزت زندگی گزار رہے ہیں۔ اسی نام سے ایک اور orphan age مری انکسپریس روے پر بھی زیر تعمیر ہے۔ اس کا رقبہ ۱۰۰۰۰ مربع میٹر ہے اور یہاں مستقبل قریب میں ۳۰۰ یتیم بچوں کے لیے نہ صرف تعلیم بلکہ ٹیکنیکل تعلیم کا بھی اہتمام ہوگا۔ آغوش کے قیام کا اگلا منصوبہ کراچی شہر میں ہے۔ الخدمت فاؤنڈیشن پاکستان ملک میں اللہ کے بندوں کی بے لوث خدمت کے ان جذبوں کو ہمبیز دیتے ہوئے پورے ملک کی سطح پر نہ صرف Orphanage کے قیام کا عزم رکھتی ہے۔ بلکہ رواں سال اسی سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے فلاح بنامی ”Orphan Family Support Program“ کا بھی آغاز کر دیا ہے۔ اس پروگرام کے تحت نہ صرف ان بچوں کی کفالت کی جائے گی جو آغوش میں رہائش پذیر ہیں بلکہ ایسے یتیم بچے جو اپنے خاندان کے تھیل کے نہ ہونے کے باعث بنیادی ضروریات زندگی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ان کی گھریلو کفالت کا اہتمام بھی ان کے گھروں تک پہنچ

مرحوم شوہر کی خواہش

”میرے ۳۰ بچے ہیں اور میرے شوہر کو فوت ہوئے تیسرا سال ہے۔ سب سے بڑا بیٹا چھٹی جماعت میں ہے اور باقی ایک بیٹا اور بیٹی چھوٹے ہیں۔ گھر کے اخراجات پورے کرنے کا کوئی اور ذریعہ نہیں تھا۔ گھروں میں کام کاج بھی کیا کہ کسی طرح بچوں کی تعلیم جاری رکھ سکوں لیکن دو وقت کی روٹی پوری کرنا محال ہو گیا۔ قریب تھا کہ بڑے بیٹے کو بھی سکول سے اٹھانا پڑتا مگر خدا کا کرنا کیا ہوا کہ الخدمت فاؤنڈیشن نے مجھ سے رابطہ کیا اور میرے مسائل سننے کے بعد میرے بچوں کی غذائی اور تعلیمی ضروریات کے حوالے سے مدد کی۔ بچوں کی تعلیم ان بچوں کے مرحوم والد کی سب سے بڑی خواہش تھی۔ میں اس خواہش کی تکمیل پر خوش ہوں۔ اس کے علاوہ مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔“

(زیب بی بی۔ والدہ ارسلان۔ حیدرہ، انک)

کر کیا جائے گا۔

چیک تقسیم کیے تاکہ اللہ تعالیٰ ان پر زندگی آسان کر دیں۔
الخدمت فاؤنڈیشن پاکستان پائلٹ پراجیکٹ میں کامیابی کے بعد اس پروگرام کو پورے پاکستان کی سطح پر پھیلانے کا عزم رکھتی ہے۔ خواص اللہ کی خوشی اور رضا کے لیے شروع کیا جائے والا یہ کام ان شاء اللہ ہزاروں یتیم اور بے آسرا بچوں کو عزت، سہولت اور حفاظت دینے کا باعث بنے گا۔ اس خدمت اور خیر کے کام میں آپ بھی ہمارا حصہ بن سکتے ہیں۔ ہمارا تو ایمان ہے کہ اگر یتیم کے سر پر ہاتھ رکھنے پر اللہ کے رسولؐ نے اجر کے لیے سر کے ان گنت بالوں جتنی خوشخبری سنائی ہے تو ان یتیم بچوں کی خدمت اور حفاظت کے لیے اپنی آغوش میں لینے پہ کس قدر بڑی کامیابی اور خوشی ملے گی۔ انسان تو نیت اور ارادہ کر کے ہی اللہ کی خوشنودی کا حقدار بن جاتا ہے۔



فلاح بنائی (Orphan Family Support Program) ابتدا میں پاکستان پراجیکٹ کے طور پر تمام صوبہ جات بشمول آزاد کشمیر، گلگت و بلتستان اور فنانس کی ایک منتخب یونین کونسل میں شروع کیا جا رہا ہے۔ اس کی مدت ایک سال رکھی گئی ہے۔ ہر منتخب یونین کونسل سے ایسے ۳۰ یتیم اور بے سہارا بچے منتخب کرنے کا کام شروع ہو چکا ہے۔

اسی سلسلے کا پہلا پروگرام اٹک شہر میں یتیم بچوں کی کفالت کے لیے قائم ”آغوش“ میں کیا گیا۔ اس خوبصورت تقریب کے اہل روح رواں یتیم بچے تھے، جو اپنے خاندان کا کفیل کے نہ ہونے کے باعث بنیادی ضروریات زندگی سے محروم تھے۔ مگر ذہانت اور زندگی میں کچھ کر گزرنے کا عزم ان کے چہروں پر عیاں تھا۔ اس تقریب میں الخدمت فاؤنڈیشن پاکستان نے ”قطر چرئی“

ڈاٹ کام

www.paksociety.com

- ✓ کیا آپ اپنی بیماری کی نوعیت کو سمجھنا چاہتے ہیں؟
 ✓ کیا آپ پریشان ہیں کہ لیزر والا آپریشن کرواؤں یا صرف شعلیں لگواؤں؟
 ✓ کالا موتیا کیا ہے اور کیا اس کا علاج ہو سکتا ہے؟
 ✓ آنکھ کا آپریشن کیسے کیا جاتا ہے؟
 ✓ شوگر آنکھوں کو کیا نقصان پہنچاتی ہے؟ اس سے بچاؤ کا کیا طریقہ ہو سکتا ہے؟
 ✓ بچوں کو عینک کیوں لگتی ہے؟ کیا عینک اتر سکتی ہے؟ لیزر سے عینک اُتارنے کا آپریشن کیسے کیا جاتا ہے؟
 ✓ کیا آپ کو لیزر لگوانے کا مشورہ دیا گیا ہے اور آپ کو سمجھ نہیں آ رہی کہ لگوائیں یا نہ لگوائیں کیونکہ لوگ کہتے ہیں کہ لیزر نقصان دہ ہوتی ہے؟
 ✓ آپ نے آپریشن کروایا اب آپ کو کیا احتیاطیں کرنی چاہئیں؟

اپنے سوالوں کے جواب جاننے کے لئے مندرجہ ذیل Website کا مطالعہ کریں

www.drasifkhokhar.com

آنکھوں کی بیماریوں سے متعلق اردو زبان کی واحد ویب سائٹ

Free Helpline

اپنے سوالوں کے جواب پوچھیے

Cell: 0333-4102266

Email: drasifkhokhar@hotmail.com

ڈاکٹر آئی سرجن

ایم بی بی ایس (باجا) ایم بی بی ایس (آئی) ایم اے (علوم اسلامیہ)

پنجاب شعبہ ہرمنٹ شریا عظیم ہسپتال لاہور

آئی سرجن لاہور میڈی کیئر انشٹیٹیوٹ آف انجینئرنگ اور ٹیکنالوجی لاہور

آپریشن لاہور میڈی کیئر جیسے جدید ترین آئی ہسپتال میں کئے جاتے ہیں

Vitreoretinal Surgery

- ✓ آنکھ کے پردے کے اکھڑ جانے (Retinal Detachment) کا آپریشن
- ✓ آنکھ کے اندر خون جمع ہو جانے (Vitreous Hemorrhage) کا آپریشن
- ✓ Macula کو کھینچنے والے نقصان کے علاج کیلئے ہونے والے آپریشن

Phaco Surgery

Corneal grafting surgery

- ✓ لائیکس، ٹیکر یا ریتنا سے Retina کو کھینچنے والے نقصان کا جدید لیزر علاج
- ✓ Excimer لیزر کے ذریعے Epi-LASIK آپریشن کی وجہ سے عینک سے نجات
- ✓ کالہ موتیا کا Diode Laser، Argon Laser، Yag لیزر کے ذریعے علاج
- ✓ سفید موتیا کے آپریشن کے بعد بچنے والی عمل کا جدید Yag لیزر علاج
- ✓ سہلی انکاس سے متعلق شدہ آنکھیں منظم اور قریب کی بیک نہ لگاری

✓ بطور ٹیکہ دہن یا نئے سفید موتیا کا علاج

✓ قریب اور دور کی نظر یک وقت صحیح کرنے والی Multifocal لیزر

یہاں پھر کشور غلطی کر گئیں۔ لائرنے چلو ورتھانے چلو والا واقعہ نیلو کے ساتھ نہیں،
فلمسٹار ممتاز کے ساتھ پیش آیا تھا۔ نیلو والا معاملہ گورنر کا لا باغ کے دور میں ہوا تھا



کشور نابید کی ”سناسائیاں“

یہ پچھلے اور عدل تحقیق تحریر، قارئین کو بے شک بہت پسند آئے گی کہ کچھ حسنین ملن آدھکی ہوں گی مگر کیا کریں، وجہ وہ خود ہیں، لکھنے والے کا کیا دوش
اپنے لیے آدھکی فکر اور آدھکی خیال کے نعرے لگانے سے حسرتاں ہوتے ہیں۔ ہاں دوسروں کو کسی آدھکی دینے میں کی مشکل مقام آتے ہیں

واقعات میں بعض بنیادی نوعیت کی غلطیاں اور غلط بیانیوں ہیں

محمود احمد شفیق لکھنوی

آپ شایع لکھنوی ہیں۔ اکثر جگہ محسوس ہوا کہ حاکم کی
کوئی غلطی ہو کر رہی ہے۔

مثال کے طور پر صفحہ نمبر ۳۳ پر رقم طراز ہیں
”حبیب جالب اور شورش کا شیریں کا ٹولٹن مارکیٹ میں
لڑائی اور ایک دوسرے پر بھی کے ڈپے بچھنے کا منظر بھی
مجھے آج تک یاد ہے۔“ ہم یہ عرض کرنے کی جسارت
کریں گے کہ یہ مہر کہ حبیب جالب اور شورش کا شیریں
نہیں بلکہ کوثر نیازی اور شورش کے درمیان وقوع پذیر ہوا۔
حبیب جالب نے اپنی سوانح عمری ”جالب یعنی“
میں کہیں اس کا تذکرہ نہیں کیا، البتہ یہ ضرور لکھا کہ شورش
سے اس کے دفتر میں بیٹھ جایا تھا ہوا تھا۔ اس کے برعکس

نابید کی
”سناسائیاں“
کتاب میں جالب کی لکھنوی کے

زیر اہتمام شائع ہوئی تھی۔ پچھلے دنوں یہ ہمارے
زیر مطالعہ رہی۔ کشور نابید کی حیثیتوں سے ممتاز ہیں۔
اس کتاب میں انہوں نے چند مشہور ادیبوں اور
شاعروں کے خاکے، چند واقعات اور کچھ لطائف بھی
شامل کیے ہیں۔ خاکے عقیدت اور محبت سے تحریر کیے گئے
مگر واقعات میں بعض بنیادی نوعیت کی غلطیاں یا
غلط بیانیوں ہیں۔ موصوفہ شاید تحقیق کے بغیر جلد بازی یا
کتاہوں کی فہرست میں اضافے کی جگہ وہ وہ میں

کشور

تخلیق کر ڈالی جیسے مقرر کو اپنا مال و دولت عزیز ہے نہ آرام و راحت سے دلچسپی ہے اور نہ اپنی جان پیاری ہے۔
 ”آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا، شورش گرفتار کر لیے گئے۔
 ویسے بھی شورش لڑائی کے بے حد شائق تھے لیکن اسے انہوں نے وزیروں، صدور، وزیراعظم اور دیگر باقیوں تک محدود رکھا۔ حبیب جالب اپنی تمام تر بہادری اور استقامت کے باوجود شورش کا نشانہ بننے کی صلاحیت نہ رکھتے تھے۔ ان کی کم باہمی بلکہ مشکوک الحالی کی داستان تو خود کشور نامید نے بھی اپنی کتاب میں تحریر کی ہے۔

دوسرا مخالف ان الفاظ میں دیکھیے ”بھٹو صاحب نے لاڑکانہ میں تمام ملکوں کے سفیروں کے لیے زبردست پارٹی کا اہتمام کیا۔ لاڑکانہ ریلوے اسٹیشن کو بہت بنایا، سنوارا گیا۔ شام کی محفل میں نیلو کو قرض کرنے کے بلانے کے لیے وہی ترکیب نمبر ۱۵ یعنی پولیس کے ذریعہ کہا گیا کہ حکم آیا ہے، چلائے، قرض کرتا ہے۔ نیلو کو یہ بات ناپسند ہوئی۔ اس نے زہر ٹھکانے کی کوشش کی اور لاڑکانہ نہیں گئی۔ اس کی اس جرأت رکھانے پر سب نے داد دی اور یہ تذکرہ بہت دن تک جاری رہا۔ نتیجی جالب نے مشہور زمانہ لکھ بھی ”تو کہ ناواقف آداب غلامی تھی مگر..... قرض نہ خیر پہن کر بھی کیا جاتا ہے۔“

اس جگہ بھی کشور نامید صاحب غلطی کر گئیں کہ نیلو کے ساتھ یہ تعلقات بھٹو دور نہیں بلکہ ایوب خان کے دور میں برتا گیا۔ حبیب جالب نے اپنی کتاب میں یہ قضیہ یوں بیان کیا ہے ”اس زمانے میں شیشہا ایران کے اعزاز میں کوئی افتتاح تھا۔ اس لیے نیلو کو تیار ہونے کو کہا گیا۔ لیکن کہنے کا انداز مہذب نہیں تھا۔ نیلو کے ریاض شاہد سے تعلقات یں رہے تھے۔ ابتدائی تعلقات تھے یا ذرا آگے چلے گئے ہوں گے تو ریاض شاہد انہیں منہ پھاڑ کے یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ ”نہ جاؤ“، لیکن نیلو نے محسوس کر لیا کہ ریاض شاہد نہیں چاہتے کہ اس تقریب میں شامل ہوں۔

اس پر نواب کالا باغ کی طرف سے جو لوگ اس کام کے لیے مامور تھے، انہوں نے غنڈہ گردی کی انتہا کر دی۔

کوثر نیازی مامور شخصیات پر مبنی خاکوں کی اپنی کتاب ”جنہیں میں نے دیکھا“ میں شورش کا شیریں کے خاکے میں صفحہ ۱۲۹ میں فرماتے ہیں ”شورش اور میں اب کے پھر متعارف کیسوں میں تھے۔ فلمی لڑائی پھر چمڑکی اور اب کے اس نے انتہائی مکروہ شکل اختیار کر لی۔ لاہور کی نولٹن مارکیٹ میں ہم دونوں میں باہمی پائی ہوئی۔ بات کا جھگڑا بن گیا، دونوں طرف احتجاجی جلسے ہوئے اور جلوس نکلتے گئے۔ ہم دونوں کو مارشل لاء انتظامیہ نے بلا کر وارنٹ دی۔ (اتنی وضاحت کرتے چلیں کہ یہ نیکی خان کے مارشل لاء کا ذکر ہے)۔

واقعی طور پر تصادم رک گیا لیکن طبیعتوں میں سختی بدستور باقی رہی تا آنکہ پتیلز پارٹی کی حکومت قائم ہوئی اور کچھ عرصے بعد شورش جیل میں ڈال دیے گئے۔ شاید ہمارے ماپ میں کافی دیر لگ جاتی کہ میری زندگی میں ایک ایسا حادثہ آیا جس نے ہم دونوں کو پھر ایک کر دیا۔ دونوں کا میل ایسے وصل گیا جیسے کبھی ان میں کدورت پیدا ہی نہ ہوئی تھی۔ یہ حادثہ میرے بیٹے فاروق کی جوانمردی کا تھا جو ۹ نومبر ۷۷ء کو ایک حادثے میں لاکھو پیارا ہوا۔ فاروق سنٹرل ماڈل سکول لاہور میں عزیز میسور شورش کے ساتھ پڑھتا تھا، اس حادثے پر شورش مرحوم کا دل پھٹل گیا۔ وہ ان دنوں نظر بندی ہی کے عالم میں میو ہسپتال لاہور میں زیر علاج تھے۔ وہیں سے انہوں نے ایک بار کے ذریعے اس لیے پر مجھ سے فلمی تعزیت کا اظہار کیا۔“

شورش مرحوم بہت گرم مزاج اور شعلہ بیان فرد تھے، ان کے استاد احسان دانش کے مطابق ”وہ ایسا مسلمان ہے کہ اس کا خون ٹھنڈا ہونے میں نہیں آتا۔“ مولانا مامور قادری اپنے رسالے ماہنامہ قارآن مطبوعہ جنوری ۱۹۷۶ء میں شورش کے متعلق لکھتے ہیں ”مشہور شخصیتوں پر تنقید کرنے میں وہ خاصے جری اور چمپاک تھے۔ لاپتہ (موجودہ فیصل آباد) میں میرے شیرنے دو دھواں دھار اور طوفانی تقریر کی کہ پورے ماحول کو شعلہ جوال بنا دیا۔ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو پر اس قدر کس کر

یہ لڑائی حبیب جالب اور شورش کشمیری کے درمیان نہیں بلکہ کوثر نیازی اور شورش کشمیری کے مابین ہوتی تھی

ایک اور غلط بیانی جو مذکورہ کتاب میں کی گئی وہ قرۃ العین حیدر کی پاکستان سے واپس بھارت روانگی کا معاملہ ہے۔ کشور ناہید لکھتی ہیں "۱۹۶۷ء میں چینی آپا پاکستان سے دلبرداشتہ ہو کر بھارت واپس چلی گئی تھیں"۔ روزنامہ ڈان نے ان کی روانگی ۱۹۶۰ء میں بیان کی ہے۔ اگر ہم قرۃ العین صاحبہ کی سوانح "کار جہاں دراز ہے" کا مطالعہ کریں تو صاف پتا چلتا ہے کہ ۱۹۶۰ء کے بعد والے واقعات بھارت سے تعلق رکھتے ہیں۔ تاریخ اور سال کا معاملہ اتنا اہم نہیں لیکن کتابیں حوالے کا کام دیتی ہیں۔ اگر انہی میں غلط سلاط باقی یا بقول مصنفہ کے "آپ شاپ درج ہوں تو پھر"۔ ڈسویٹی تو قوم نے فلاح کی راہ۔

اب ان کے ایسے تحریر کردہ خاکوں کا ذکر جن کے متعلق ہم نے اوپر درودھ اور مصیبتی کی مثال دی۔ سب سے پہلا خاکہ انہوں نے صوفی غلام مصطفیٰ جیسے کا تحریر کیا۔ ذکر بڑی محنت اور احسان مندی سے کیا ہے، لیکن جگہ جگہ ایسی باتیں تحریر کر دیں جس نے ان کی عظمت کا بت نہ صرف پاش پاش کر دیا بلکہ انتہائی گھناؤنی شکل پیش کی ہے۔

صفحہ ۸ پر یہ اطلاع دی ہے کہ صوفی صاحب کی بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ صفحہ ۹ پر تحریر کرتی ہیں "ان دنوں صوفی صاحب کے ساتھ ایک خاتون رہتی تھیں۔ وہ شاید کہیں پڑھاتی تھیں"۔ صفحہ ۱۰ کا یہ حوالہ بھی دیکھتے چلیں "ہر چند صوفی صاحب کے ساتھ اس زمانے میں ایک اور خاتون رہ رہی تھی مگر صوفی صاحب بہت بے چین رہتے تھے"۔ خاکے کے آخر میں بھی اسی طرح کی معلومات ملتی ہیں۔

صفحہ ۱۱ پر لکھتی ہیں "صوفی صاحب آخر عمر میں واہ بھی جانے لگے تھے۔ مجھے معلوم نہیں کون خاتون تھیں مگر راستے میں اسلام آباد میں حیدر ملوی کے یہاں قیام

اس کو برا بھلا اور لہانچہ بھی مارا۔ نیلو نے جواب میں خواب آور گولیاں کھائیں۔ میں اور ریاض اسے دیکھتے ہوئے ایٹھ گئے۔ جب دیکھ کر واپس آ رہے تھے تو میں نے کہا، ریاض شاید نیلو ٹیکم نے بڑا ہی ایٹھ ایٹھ پلٹ رول ادا کیا ہے۔ اس نے شہنشاہ ایران کے سامنے جو امریکی سامران کا اس علاقے میں سب سے بڑا ایٹھ او ہے، تاجپے سے انکار کر دیا۔ اس پر ایک نظم ہو گئی ہے۔ اس نے کہا، "سناؤ"۔ میں نے یہ نظم کہی تھی۔

تو کہ ناواقف آداب شہنشاہی تھی
قصہ زنجیر چین کر بھی کیا جاتا ہے
تجھ کو انکار کی جرأت جو ہوئی ہے تو کیونکر
سایہ شاد میں اس طرح جیا جاتا ہے

اب جالب صاحب کے الفاظ میں بھٹو صاحب کی کارکردگی پر نظر ڈالتے ہیں "بھٹو دور میں بھی ایوب دور کا ایک واقعہ دہرایا گیا تھا اور اداکارہ ممتاز سے چلنے کو کہا گیا۔ سٹوڈیو میں ان لوگوں نے اس کے گرد گھیرا ڈالا ہوا تھا۔ طارق عزیز نے کہا "اگر کوئی حبیب جالب ہوتا تو نیلو کی طرح ممتاز پر بھی نظم لکھتے"۔ میں شورش کشمیری کے ہاں ملک عبدالسلام کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے کسی نے یہ بات بتائی۔ میں نے کہا، ملک صاحب، ایک نظم نازل ہوتی ہے، کہیں تو سناؤں۔ انہوں نے کہا، "سناؤ"۔ تب میں نے یہ نظم کہی تھی۔

قصر شاہی سے یہ حکم صادر ہوا
لاڑکانے چلو ورنہ تھانے چلو
اپنے ہونٹوں کی خوشبو لٹانے چلو
گیت گانے چلو ورنہ تھانے چلو

گرتے۔ ہمیں خوشی ہے کہ انھوں نے یہ قصہ تین خواتین کے تہ کرنے تک محدود رکھا، ورنہ کیا تعجب تھا کہ ایک اور خاتون کا ذکر کر کے یہ تاویل پیش کی جاتی 'چار تک کی اجازت ہے۔

جوش ملیح آبادی کی شان میں 'قصیدہ ان الفاظ میں ہے "جوش صاحب نے جب اپنے سفر کا بل دیا۔۔۔ کاش یہ محفوظ ہوا ہوتا، اس میں ناخن کے کرائے کے علاوہ پانچواں کا خرچ بھی لکھا تھا"۔ یہ کہانی ایک مرتبہ بیان کرنا کافی نہ تھا لہذا اس دو جگہوں پر بیان کیا گیا ہے۔ صفحہ ۱۳۰ اور ۱۳۱ پر دہرائی گئی۔

مزید کہتی ہیں "لاہور کالج میں داخلہ لیا تو چند گھروں کے قاصد پر باہر سے روک رہی تھی۔ کالج میں وقفے کے دوران ان سے ملنے چلی گئی۔ وہ سفید ساڑھی پہنے اور سگریٹ پیتی بڑی سمور کن کھیں۔ انہوں نے بتایا کہ گھر کے باہر کئی لوگ ان کی ایک جھلک دیکھنے کے متمنی رہتے ہیں۔ اسی لیے وہ موٹر کے بغیر گھر سے باہر نہیں نکلتی۔ لیکن ہم گھر سے باہر نکلے تو وہاں سب سنا سن پڑا تھا۔"

ہم مصنفہ پر دروغ گوئی کا الزام نہیں لگاتے لیکن یہ

کہانی عجیب ہے۔ ان کا بیان کردہ قصہ کم از کم ۵۰۰ سالہ پرانا ہے۔ اس دور میں ذرائع نشر و اشاعت بڑے محدود تھے۔ ویسے تو آج کل بھی اتنے وسیع پیمانے پر پبلیکیشنز اور سیکڑوں فی وی چینلوں کی موجودگی کے باوجود مفسطصن کی شکل سے عوام واقف نہیں۔ شاعر کسی حد تک معصی ہیں کہ وہ فی وی براکٹر اپنا کلام پڑھتے نظر آتے ہیں۔ جب کہ سٹریٹکاروں کو یہ سہولت حاصل نہیں۔ ویسے بھی جس طرح جنوں کے فیصلے ہوتے ہیں، اسی طرح مفسطصن کی تحریریں ہوتی ہیں، اور شاعروں کا کام زندہ رہتا ہے۔ باجہرہ مسرور ایک معصی تھیں فلمی ہیروئن نہیں کہ ان کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے شائقین کا اڑدھام ہوتا۔ شورش سادہ نے آخری سطر میں انہیں جھوٹا ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

ایک افسوسناک پہلو یہ ہے کہ کتاب میں جلیلہ ہاشمی کے میاں اور مشہور رائٹر ڈاکٹر عائشہ صدیقہ کے والد

پیر صاحب کی بھی تضحیک کی گئی۔ وہ ان کی تحریر کے مطابق سردار احمد کو ایسی مرحوم ہیں۔ لکھتی ہیں "میں نے ایک مرتبہ کہا" میں آپ کو کبھی بلور پیر کے آب کے گاؤں میں دیکھنا چاہتی ہوں۔" اُنے، کہنے لگے "چلو" ہم لوگ ان کے گھر خانقاہ شریف گئے۔ صبح ۸ سے ۱۲ بجے تک خانقاہ کے آدھے میں موڑ جا بچھا کر وہ بیٹھ جاتے۔ سامنے ایک چادر پھیلا دی جاتی۔ لوگ آتے، ہاتھ جوڑے، پلویا وضوئیں سے مزارِ انوار نکالتے، نیلی چادر پہ بڑی لجاہٹ سے رکھ دیتے اور عرض گزار تے۔ او یہی ہماری بھی دائیں اور سجائی بائیں ہاتھ کی میز سے ایک پرچی اٹھا کر دیتے۔ وہ شخص دو زانو ہوئے پیچھے کی طرف ایسے جاتا کہ اس کی پیٹھ پیر صاحب کی طرف نہ ہوتی۔ ساڑھے بارہ بجے کے قریب اندر تشریف لاتے۔ لڑکے کو حکم ہوتا "آؤ"۔ تب میرے اور ان کے لیے ٹھنڈی ہوئی میسر آ جاتی۔ یہ پیر صاحب کی "مدح سرائی" کا عمدہ نمونہ ہے۔ کتاب میں شراب اور بیڑا اس قدر تذکرہ ہے کہ لگتا ہے جو اس سے محروم ہیں، وہ دنیا جہاں کے سارے لطیف و اکرام سے محروم ہو گئے۔ انہوں نے بے شمار اوپوں اور شاعروں کا اس سے یوں تعلق داشت از بام کیا ہے کہ محسوس ہوتا ہے، یہ ایک کتاب نہیں قرطاس انبیض (واضع ہیچ) ہے۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ ان میں سے ایک دو کے علاوہ سب اس جہان سے کوچ کر چکے۔ یہ کتاب ایک "میڈیا نرائل" نہیں تو ادنیٰ مقدمہ مندرجہ ہے۔ کیا کشورِ امید پسند کریں گی کہ ان کے دنیا سے گزرنے کے بعد ان کی شراب نوشی کے قصے کتابوں میں تحریر کیے جائیں۔ کیا موصوف کی آیندہ نسل ان کی شراب نوشی کی داستانیں سن کر فخر ہے انداز میں سر اٹھا سکیں گی؟ فیض احمد فیض کی خفا کی زندگی کا بھی ایک واقعہ بھی بیان ہوا ہے۔ وہ اگر غلط ہے تو اسے بہتان کہا جائے گا۔ اگر سچ ہے تو عبرتناک اور محبت کی افسوسناک مثال۔۔۔۔۔ تقویر تو اسے چرخِ دورانی۔۔۔۔۔ یہ واقعہ کشور صاحب کے الفاظ میں یوں ہے:

فیض احمد فیض کی جس بیٹی نے باپ سے گھر میں رہنے کا کرایہ مانگا تھا، کشور نے اُس کا نام دینے سے گریز کیا ہے

تھا اور بیگم بھٹو کو یقین تھا کہ بھٹو صاحب نے ایک خاتون سے شادی کر لی۔ بیگم بھٹو نے کچھ ایسی قاتل چیز غصے اور غم کے عالم میں کھائی کہ وہ کئی دن ہسپتال میں رہی تھیں۔

ایک اور پہلو بھی دیکھتے چلیے "اس خاتون نے چاہے وہ وزیر کی بیوی تھیں یا پھر وزیرِ عظم کی بیوی، دوسری خواتین کو گھر میں آتے جاتے دیکھا اور خاموش رہیں۔ خدا کو شاید ان کے صبر کا امتحان لینا تھا۔ شاہنواز کی موت کی خبر ہم سب عورتوں نے نیرونی کانفرنس سے واپسی پہ ہوائی اڈے پر سی سن کی تھی۔ کتنا صبر کیا اس عورت نے! پھر ایک المناک امتحان مرتضیٰ کی ہلاکت کی شکل میں نمودار ہوا۔ اللہ میاں اُن کی زندگی ہی میں کمال کھینچے چلا جا رہا تھا۔ اذیت ان کے اندر ابھی تک بچو کے لگا رہی ہے۔

یہ کتاب ۲۰۰۸ء میں شائع ہوئی تھی۔ بد قسمتی سے ۲۰۰۷ء نومبر ۲۰ء کو ایک اور سانحہ نصرت بھٹو کی بیٹی، چٹکی (بینظیر بھٹو) کی زندگی کی شمع جل کر گیا۔ پھر ۲۳ برسوں بعد نصرت بھٹو کی زندگی کا چراغ بھی بجھ گیا۔

مرتضیٰ بھٹو کے قتل کے بعد جس طرح بے نظیر نصرت بھٹو کو جبراً ساتھ لے گئیں، اُس واقعے کا تذکرہ نہیں ہے۔ بعد کے سال تو بے چاری اپنے یادداشت سے ہی محروم ہو گئیں۔ خاکہ لکھا جائے تو پھر مکمل احاطہ کرنا چاہیے۔ کشور ناہید ناراض نہ ہو تو اتنی گزارش ضرور ہے کہ مشہور ہونے والے لکھاریوں کو اپنی کتابیں شائع ہونے سے پہلے دو چار پڑھ لکھے لوگوں کو ضرور دکھائینی چاہیے۔ ایسی غلطیوں سے بچنے کا یہ آسان اور کم خرچ طریقہ ہوتا ہے۔



"سید سید حسن بہت افسوس کے ساتھ سناتے تھے کہ کس طرح فیض صاحب سے ان کی بیٹی نے اس گھر کا کرایہ مانگا، جس میں وہ رہتے تھے۔ وہ کونھی اس بیٹی کے نام پر خریدی گئی تھی۔ جب سید صاحب نے ڈانٹ کر بھٹ لکھا اور کہا کہ تم مجھے بیوی باری لگ رہی ہو تو اس نے کہا تھا "ہاں میں ہوں بیوی باری، آخر گھر میرے نام ہے، مجھے کرایہ پانا ہے۔" سید صاحب بڑے افسوس کے ساتھ کہتے "شکر ہے کہ میرا گھر ہر چند بیٹی کے نام ہے مگر میں نے خود بنایا ہے۔" میں تڑپ کر کہتی، فیض صاحب نے بھی خود ہی گھر بنایا تھا۔ خود کرسی پہ بیٹھ کر بھٹوں کے پودے لگواتے جاتے اور سگریٹ پیتے جاتے تھے۔" معذرت کی جرات نہ دے تو دیکھیے کہ فیض صاحب کی ۲ بیٹیوں میں جس نے یہ ایمان افروز کارنامہ انجام دیا، اس کا نام دینے سے گریز کیا ہے۔ یوں قارئین کی صلاح دینے پر مجبور دیا کہ جس سے چاہے، اسے منسوب کر لے۔

اس کتاب کا البتہ ایک پہلو قابلِ تعریف ہے کہ نصرت بھٹو کی مظلومیت کا ذکر کر کے انہیں خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔ کشور صلابہ لکھتی ہیں "۱۹۷۵ء کا ذکر ہے کہ نصرت بھٹو صاحبہ کی ایک تقریر کے دوران ان سے کہا گیا "آپ تو تقریر پڑھ رہی ہیں، دل سے بولیں۔" تنہو زنی دیر بعد وہ اٹھ کر ریٹائرنگ روم میں آئیں۔ ایک سگریٹ ساگایا اور کافی پیتے ہوئے کہنے لگیں "قلم برداشت کرنے والی عورت بس ایسی ہی بول سکتی ہے، جیسے میں بول رہی ہوں۔"

یہ ۱۹۷۵ء کا ذکر ہے۔ اس وقت بھٹو صاحب کی حکومت تھی اور ان کی حکومت کو کوئی چیلنج درپیش نہ تھا۔ یہ جاننے کے لئے کسی غیر معمولی ذہانت کی ضرورت نہیں کہ اس قلم کا محرک کون تھا۔ خود کشور ناہید اطلاع دیتی ہیں "بیگم بھٹو کی تو میں وہ حالت نہیں بھول سکتی، جب کہا جا رہا

ہم کس سے کھم نہ ہیں

تحریک حنا صدیقی

ہم ان دنوں بڑی مشکل میں ہیں۔ عالمی اداروں کی دیکھیں سے لے کر اپنے پیاروں کی تنبیہ اور ناخوشی سے بھرے خط سنتے ہیں۔ اس ملک میں کیا ہے۔ اس نے ہمیں کیا دیا؟ یہ جملہ کہتے ہوئے ایک لمحے کو نہیں سوچتے کہ ہمیں قدر والوں کو ملتی ہیں اور ناقدری کرنے والوں سے واپس لے لی جاتی ہیں۔ انسانوں کا ملک ہے۔ چار پرانیاں ہیں تو ۱۰۰ اچھائیاں کیوں نظر نہیں آتیں۔ یہ وطن ہمارا ہے۔ اسے اچھا نہ بنا سنے کی ذمہ داری بھی ہمیں ہی ملنی چاہیے۔
تحریک نے اس مضمون میں اپنے طور پر کچھ باتیں اور دلائل جمع کیے ہیں کہ ہم کسی سے کم نہیں۔ ممکن ہے کہ آپ اس سے اچھے دلائل دے سکیں، نگہ کریں۔ ذرا سوچ کر تو دیکھیں۔

نئی فصیح اللسان۔ آسیہ

آئیے! اب آپ کی ملاقات نئی فصیح اللسان آسیہ سے کراتے ہیں۔ آسیہ عارف ایک ۶ سالہ پاکستانی بچی ہے۔ جس کی پیدائش تو قطر کے دارالحکومت دوحہ میں ہوئی لیکن وہ ساڑھے تین سال کی عمر میں واپس پاکستان لوٹ آئی۔ آسیہ کی شہرت کی کہانی اس وقت شروع ہوئی جب ۳ سال کی عمر میں وہ قطری وی کے عربی چینل پر آئی اور فصیح عربی زبان میں اپنی نئی مٹی باتوں سے عرب ناظرین کو اپنی توجہ کا مرکز بنالیا۔ پھر قطر کے بیشتر اخبارات کے علاوہ ایران، عراق، سعودی عرب، متحدہ عرب امارات اور مصر میں بھی آسیہ پر رپورٹس شائع ہوئیں۔ بہترین اردو اور معمولی انگریزی جانتے والی یہ بچی فصیح عربی زبان بولنے کی وجہ سے عرب دنیا میں بڑی تیزی سے ایک نمایاں مقام حاصل کر رہی ہے۔

آسیہ پاکستان، قطر اور سعودی عرب کے کئی بڑے علماء سے ملاقاتیں کر کے فصیح عربی زبان میں اپنی شاعرانہ کارکردگی کی وجہ سے واہ حاصل کر چکی ہے۔ آسیہ عارف عربی، انگریزی اور اردو کے معروف پاکستانی مصنف عارف صدیق کی اکلوتی صاحبزادی ہے۔ عارف صدیق دوحہ کے ایک بڑے تعلیمی ادارے میں شعبہ عربی کے سربراہ کے طور پر ۱۳ برس تک کام کرنے کے علاوہ جاری ناؤن امریکن یونیورسٹی کے سکول آف فارن سروس، قطر جیسے نمایاں اداروں میں بھی تدریسی فرائض انجام دے چکے ہیں۔

آسیہ عارف نے اس حقیقت کو ثابت کر دیا ہے کہ تھوڑی سی محنت، تھوڑی سی توجہ سے اس ذہین قوم کے بچے اقوام عالم میں اپنا لوہا منوا لیتے ہیں۔ یقیناً پاکستانی بچے دنیا کے بچوں سے کسی لحاظ سے بھی کم نہیں ہیں۔



دُنیا کا سب سے بڑا گلکشیر

طور طریقے بہت زیادہ پرانے یورپی طور طریقوں، رسم و رواج سے ملتے جلتے ہیں۔ موجودہ دور سے بچنے سے قبیلوں میں ”کیلاسا“ دُنیا کا سب سے عجیب اور حیرت انگیز قبیلہ ہے۔

دُنیا کی سب سے بڑی مسجد یعنی فیصل مسجد بھی پاکستان میں ہے۔ ۱۹۷۶ء میں مکمل ہونے والی یہ مسجد اتنی بڑی ہے کہ اس میں اسلام آباد کے تمام لوگ ایک ساتھ باجماعت نماز پڑھنا چاہیں تو پڑھ سکتے ہیں۔

پاکستان میں واقع شمال مغربی علاقے چترال کو رقبے میں کم ہونے کے باوجود یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہاں ہیک وقت ۱۳ زبانیں بولی جاتی ہیں۔ رقبے اور زبان کے حساب سے اگر دیکھا جائے تو یہ دُنیا کا سب سے لمبی پتھر خطہ ہے۔

پاکستان میں دُنیا کے سب سے زیادہ مہاجر آباد ہیں۔ ۱۹۷۹ء سے شروع ہونے والے اس سلسلے کے بعد تقریباً ایک کروڑ مہاجر پاکستان آچکے جو کہ اپنی طرز کا عالمی ریکارڈ ہے۔

دُنیا کی سب سے اونچی سڑک جو ۲۲ ملکوں کی سرحدوں کے بیچ واقع ہے، وہ پاکستان اور چین کے درمیان ہے۔ قراقرم روڈ پر واقع سب سے اونچا پوائنٹ خنجراب پاس ہے۔ اتنی اونچی پہلی سڑک ۲۲ ملکوں کے درمیان دُنیا میں کہیں بھی نہیں پائی جاتی۔

پاکستان دُنیا کا واحد ملک ہے جو ایک مذہب کے بہتر عملی نفاذ کے لیے وجود میں آیا تھا۔ ہم نے مذہبی قوانین کو عملی شکل دینے کے لیے ایک نیا ملک بنایا تھا۔ اس کی مثال انسانی تاریخ میں کوئی اور نہیں ملتی۔

ہم محنتی، باصلاحیت، ذہین لوگوں کی قوم ہیں۔ ایک پاکستانی ملک سے باہر آتا ہے۔ بغیر کسی کی مدد کے گھر، گاڑی، بینک بیلنس سب بنا لیتا ہے۔ ایسی ایک نہیں کئی

دُنیا کا سب سے بڑا گلکشیر پاکستان میں ہے۔ اس کے شمالی علاقے کو بے شک دُنیا کا کمین ترین خطہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اگر آپ کو پہاڑی علاقے میں گھومنے کا شوق ہے تو نیپال میں واقع مشہور زمانہ کوہ ہمالیہ کو بھول جائیں جو حسن آپ کو پاکستان کے ایک گلکشیر میں ملے گا۔ وہ کہیں نہیں ہے۔ پاکستان کے انتہائی شمال مغربی علاقے میں واقع کرگلی گلکشیر دُنیا کا سب سے بڑا گلکشیر مانا جاتا ہے۔

پاکستان میں واقع ہنزہ وِلی نے اپنے حسن کی وجہ سے وہاں لوگوں کو آنے پر مجبور کیا ہے لیکن یہ علاقہ دُنیا کے لیے صرف اس وقت کھلا جب شاہراہ قراقرم ۱۹۸۶ء میں کھلی۔ اس لیے یہاں ایک ایسی زبان بولی جاتی ہے جس کا حوالہ دُنیا میں کہیں اور نہیں ملتا۔ اس زبان کا نام ہے ”بروساشی“۔

”نانگا پربت“ دیکھنے والا نظارہ ہے۔ دور تک پچھلی ہوئی پہاڑیاں۔ نانگا پربت ساؤتھ فیس ”پوٹلی“ کے نام سے جانا جاتا ہے اور یہ دُنیا کی سب سے اونچی پہاڑی ہے۔ یہ زمین سے ۲۸ ہزار ۶۰۰ فٹ اونچائی پر ہے۔ اگر نانگا پربت کی کھلی اونچائی زمین کے اوپر اور نیچے سے ملا کر ناپی جائے یعنی دریائے سندھ سے تو نانگا پربت کوئی ۷۰ ہزار فٹ اونچا ہے۔

گرینڈ ٹرانگکو دُنیا کی سب سے بڑی Chin ہے جس کی چوٹی کی اونچائی ۱۳۳۰ میٹر ہے۔ یہ بھی پاکستان میں واقع ہے۔

دُنیا کا سب سے عجیب و غریب قبیلہ بھی پاکستان میں موجود ہے۔ کیلاسا (Kalasa) نامی یہ قبیلہ پاکستان کے ایسے جنگلوں میں رہتا ہے جہاں کسی کا بھی باہر سے اندر جانا ممکن نہیں۔ پاکستان ایک اسلامی ملک ہے، اس کے باوجود بھی اس قبیلے میں ایک ایسے مذہب کو مانا جاتا ہے جو اسلام کے ظہور سے پہلے کا ہے اور ان لوگوں کے

پاکستان کا افتخار۔ سلیم ڈار

قوم کے اس سپوت کی جتنی بھی پذیرائی کی جائے کم ہے۔ صرف ایک شخص نے تو تنہا اپنے احساس ذمے داری اور ایمانداری سے دنیا بھر کے لوگوں کا اعتماد جیت کر ثابت کیا ہے کہ غلوں میں سے کی گئی کوششیں کبھی رائیگاں نہیں جاتیں۔ مسائل میں گھری قوم کے سامنے ایسے روشن دیے جلانے کی جتنی ضرورت اب ہے شاید کبھی نہ تھی۔

سلیم ڈار نے مسلسل تیسری بار سال کے بہترین امپائر کا آئی سی سی ایوارڈ حاصل کر کے پاکستان کا پرچم بلند رکھا۔ سیوڈیوس، ای این گولڈ اور ۵ بار یہ اعزاز اپنے نام کرنے والے سامنٹ ٹوفل بھی ڈیوڈ شیفرڈ ٹرافی کے امیدواروں میں شامل تھے مگر ون ڈے اور ٹوئی ۲۰ میں ۱۰۰ جبکہ ٹیسٹ میں ۹۸ فیصد درست فیصلوں کا تناسب رکھنے والے پاکستانی نے کسی کو بھی اپنی مسند پر قبضہ نہ کرنے کا

مثالی بلٹی ہیں۔

اگلی بار جب کبھی آپ اپنے دوستوں، رشتے داروں کے ساتھ ٹینس اور پھر کوئی آپ کو یہ گنوانے لگے کہ کیا نہیں ہے پاکستان میں، آپ یقیناً انہیں جواب میں یہ بتا سکتے ہیں کہ پاکستان کے پاس وہ کچھ ہے جو دنیا میں کسی اور کے پاس نہیں۔ کئی ایسی چیزیں ہیں جو ہمیں عام سے دوسروں سے خاص بناتی ہیں۔

یہ اچانک ملی عباسی کی تحریر تھی۔ اب نصرت مرزا آپ کو بتائیں گے کہ اللہ تعالیٰ ہم پر کس قدر مہربان ہے۔ آج تمام دنیا بشمول اسرائیل، امریکا اور پکساد بازاری کا شمار ہیں لیکن تمام مشکلات اور کمزوریوں کے باوجود پاکستان میں کساد بازاری نہیں ہے۔

اس کی ایک وجہ تو چھٹی ہوئی زیر زمین معیشت بناتی جاتی ہے۔ دوسرے پاکستان کا قومی بچت کا ادارہ پاکستان کی معیشت کو سنبھالا دے رہا ہے جس سے دو فائدے ہو رہے ہیں۔ ایک پاکستان کے سفید پوش اور غریبوں کو اس قومی بچت سکیم سے مالی فائدہ ہو رہا تو دوسرے وہ حکومت کو قرض دے کر معیشت کو سنبھال رہا ہے۔ ورنہ ٹوٹ چھاپے جاتے تو مہنگائی کا ناقابل برداشت طوفان اٹھ کھڑا ہوتا اور ہنگامہ آرائی اس دورے پر چلی جاتی کہ جسے سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ اس وقت پاکستان کی قومی سرمایہ کاری ۲۰ ہزار ارب تک پہنچ گئی ہے۔ اس کے مقابلے میں یورپ میں واقع یونان کا ملک کساد بازاری کے تھیلے برداشت نہ کر سکا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ آج جبکہ ترکی، یونان، اسپین، آسٹریا، اٹلی اور دیگر یورپی ممالک کساد بازاری کے عفریت کا سامنا کر رہے ہیں، ہم سرمایہ کاری کے نئے نئے منصوبوں کے پارے میں غور کر رہے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے درست ہی کہا ہے

ذرا غم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی



پیش اوپس گیمز میں پاکستان کا نام روشن کرنے والی طالبہ



پاکستان کی بونہار طالبہ فخر علیہ نے انٹرنیشنل اوپس گیمز میں ایک گولڈ میڈلسٹک ریس میں چاندی کا تمغا حاصل کیا ہے۔ انٹرنیشنل اوپس گیمز میں ۱۸۵ ممالک کے ۵۰۰۰۰ خصوصی بچوں نے شرکت کی تھی۔ فخر علیہ اس سے قبل ۲۰۱۰ء میں پنجاب کھیل اوپس اور بین الاقوامی کھیلوں میں بھی طلائی تمغا حاصل کر چکی ہیں۔ فخر علیہ کا کہنا ہے کہ ان کے ادارے کی ڈائریکٹر مس عبیدہ نے ان کی سائنٹس ریس میں تیاری سے اوپس گیمز تک ہر موقع پر رہنمائی کی۔ جس سے وہ فوری اور عالمی سطح پر ترقی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئیں۔

میں اضافہ کیا۔ ۶ ماہ بعد ہی وہ آئی سی سی ایلیٹ پیش کا حصہ بن چکی تھیں۔ سائنس ٹیٹل اور عظیم ڈار دیگر سینئر امپائرز کی نسبت کم عمر ہونے کے باوجود زیادہ پُر اعتماد اور قابل اعتبار ثابت ہوئے۔

اکتوبر میں ون ڈے میچ کے دوران عظیم ڈار نے انگلش بور ایئر فیلڈ ٹیٹل کی گیند پر میٹ پر انز کے کچے کو درست اور ٹنڈ وکر کو آؤٹ قرار دیا لیکن بعد ازاں احساس ہوا کہ بیٹ گیند کے بجائے پیٹ سے ٹکرایا تھا۔ انھوں نے اعلیٰ طرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی غلطی کو تسلیم کیا اور ٹنڈ وکر سے معذرت بھی کی، ایسا کرنے کا حوصلہ بھی بہت کم امپائرز رکھتے ہیں۔

کم گوگھر اپنے کام پر بھرپور توجہ مرکوز رکھنے والے امپائر نے ناچو شکواریت کو ذہن پر سوار کرنے کے بجائے ہمیشہ ہادی دیانت واری سے فرائض انجام دیے ہیں۔ جس کے صلے میں انھیں کپتانوں، کھلاڑیوں اور شائقین کی طرف سے ملنے والی عزت اور احترام ہے۔ عظیم ڈار کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس بھی ہے۔ کھلاڑیوں اور تماشاچیوں کے جذبات کی قدر بھی۔ ان کا کہنا ہے کہ جدید دور میں امپائرنگ آسان کام نہیں ہے۔ ٹیکنالوجی مختلف زاویوں سے لیے گئے ری پلیرز کے ذریعے آپ کے ایک ایک فیصلے پر نظر رکھتی ہے۔

موقع نہیں دیا۔ آئی سی سی کی ۱۰ رفل ممبر ٹیموں کے کپتانوں، ۱۸ ایٹ پیش میچ ریفرز کے ووٹ حاصل کر کے ایوارڈز کی ہیٹ ٹرک کرنے میں کامیاب رہے۔

۳۳ سالہ عظیم ڈار نے ۱۳ اگست ۲۰۱۰ء سے ۳ اگست ۲۰۱۱ء تک کے مرحلے میں ورلڈ کپ فائنل سمیت ۱۳ ایون ڈے اور ۵۵ ٹیسٹ میچز میں امپائرنگ کرتے ہوئے کئی بار اپنے فیصلوں سے ٹیکنالوجی کو مات دے دی۔ ان کا کوئی فیصلہ اگر کسی ٹیم نے چیلنج کیا بھی تو اسے مندرجہ کھائی پڑی۔ مضبوط اعصاب اور انسانی آنکھ کی مدد سے درست نتیجے تک پہنچنے کی اس صلاحیت نے دنیا بھر کے کروڑوں شائقین کو حیران کرتے ہوئے عظیم ڈار کی عزت و احترام میں اضافہ کیا۔

مڈل آف ڈسٹینس اور ایک سینئر کے طور پر ایک دہائی تک فرسٹ کلاس کیریئر کے بعد سابق ٹیسٹ کرکٹر عظیم ڈار نے ریڈی کے مشورے سے امپائرنگ کی طرف آنے والے عظیم ڈار نے ۲۰۰۲ء میں پہلا ون ڈے سپر وارز کیا تو ان کی عمر ۳۳ سال تھی۔ ۲ برس میں ہی وہ آئی سی سی پیش میں شامل کر لیے گئے۔ ۲۰۰۳ء میں پہلی بار ورلڈ کپ میں ڈسٹینس سے انصاف کیا۔ اکتوبر میں انھیں بنگلہ دیش اور سری لنکا کے مابین سیریز میں پہلی بار ٹیسٹ امپائرنگ کا موقع ملا۔ سخت دباؤ میں کیے گئے فیصلوں نے ان کی قدر

اور چند منٹوں میں ٹھیک کر کے واپس بھجوا دیا۔ برطانوی چانسلر نے فوری طور پر امریکی بینک کو آگاہ کر دیا جس نے اس کامیابی پر لڑکے کے لیے ۲۵ ہزار ڈالر نقد انعام کا اعلان کیا۔ سبزی فروش کے اس لڑکے محمد عمار افضل نے اپریل ۲۰۰۹ء کی ۲۲ مارچ کو کمپیوٹر کے مشکل ترین امتحان اور نیٹل ٹائمن آئی میں سب سے زیادہ نمبر لے کر ورلڈ ریکارڈ قائم کیا اور اس کے صرف ۴۲ روز بعد امریکی بینک ایل لائیڈ کی تاریخ کا سب سے بڑا مسئلہ بھی حل کر دیا۔

عمار افضل اوکاڑہ میں پیدا ہوا، اس کے والد محمد افضل سبزی منڈی اوکاڑہ میں ایک آڑھتی جبکہ دادا چودھری اشرف انجمن آڑھتیاں اوکاڑہ کے صدر ہیں۔ ۲ مئی ۲۰۰۹ء تک عمار اوکاڑہ کا رہائشی اور مقامی سکول میں ختم جماعت میں پڑھتا تھا مگر ۲ مئی کے بعد وہ برطانیہ کا رہائشی اور دنیا کی پہلی ترین یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہے۔ وہ اوکاڑہ سے مائچسٹر کیسے پہنچا، اس کے لیے ہمیں ۲ سال پیچھے جانا ہوگا۔ ۲ سال قبل کسی نے اسے بتایا کہ تعلیمی ادارہ بریٹن سچ دنیا بھر میں آن لائن کمپیوٹر کورسز کرواتا ہے۔ کمپیوٹر اور ایب کیمرہ کی مدد سے سبق پڑھے جاسکتے اور امتحان بھی دیا جاسکتا ہے۔ عمار نے اپنے والد سے واسطے کی

ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ میں فیلڈ میں غیر جذباتی انداز اختیار کرتے ہوئے اطمینان کے ساتھ صرف اور صرف اپنے کام پر نظر رکھتا ہوں۔ کسی ٹیم یا کھلاڑیوں کی جو بھی پوزیشن ہو، میری تیج کی صورت حال سے زیادہ ہر گیند پر نظر ہوتی ہے جو چھٹکی یا پھیلی جا رہی ہے۔ امپائر کو تیج کا نتیجہ نہیں بلکہ اوور کی ہر گیند دیکھنا ہوتی ہے۔

۴ کروڑ روپے سالانہ تنخواہ لینے والا پاکستانی لڑکا

آجے! اب آپ کی ملاقات عمار افضل سے کراتے ہیں۔ عمار افضل نے آئی ٹی کے شعبے میں اپنی کامیابی کے جہز ۲۰۰۹ء میں گاڑ کر ملک سے باہر اپنے ملک کی عزت و عظمت کا اہتمام کیا۔

اپریل ۲۰۰۹ء میں ایک امریکی بینک کی اسے ٹی ایم مشین کے نیٹ ورک میں خرابی پیدا ہوئی۔ اس بینک کا صدر دفتر امریکا میں، جب کہ برانچیں ۳۰ ممالک میں پھیلی ہوئی ہیں۔ خرابی کے باعث سیکڑوں برانچوں کو کروڑوں ڈالر کا نقصان اٹھانا پڑا۔ امریکا کے بڑے بڑے ٹکنیکی ماہرین سرزاتے رہے لیکن مسئلہ حل نہیں ہوا۔ بینک نے امریکا کے علاوہ برطانیہ کی آئی ٹی ٹیمز کو بھی متعدد یونیورسٹیوں اور اداروں سے رابطہ کیا مگر مسئلہ کسی بھی ماہر اور پروفیسر کی سمجھ میں نہیں آیا۔

اس دوران مائچسٹر کی ایک یونیورسٹی کے چانسلر کو خیال سوچا۔ اس نے اپنے اسٹنٹ کو پاکستان کے شہر اوکاڑہ میں ایک نمبر پر کال ماننے کو کہا۔ فون پر دوسری طرف اوکاڑہ کی سبزی منڈی کے آڑھتی محمد افضل کا ۱۵ سالہ بیٹا تھا۔ چانسلر نے لڑکے کو مسئلہ بتایا۔ لڑکے نے غور سے مسئلہ سنا، چانسلر سے سافٹ ویئر کا کوڈ طلب کیا



خواہش ظاہر کی۔ والد محمد افضل نے رضا مندی کا اظہار کیا۔

عمار نے کمپیوٹر کے مشکل ترین کورس اور ریکل (Oracle) کا انتخاب کیا۔ عمار صبح سکول جاتا، دوپہر کو گھر آکر سہرے کھینچتا اور شام کو گھر کے کمپیوٹر روم میں چلا جاتا۔ ٹھیک ۶ بجے اس کی کلاس شروع ہو جاتی۔ وہ صبح ۶ بجے تک سبق سنتا اور ساری رات جاگنے کے باوجود صبح ۸ بجے سکول پہنچ جاتا۔ یہ سلسلہ کوئی ۷ ماہ جاری رہا۔ ایک روز عمار نے اپنے والد کو بتایا کہ اس کا پروفیسر زیادہ وقت طلبات کے ساتھ گپ شپ میں ضائع کر دیتا ہے، اس وجہ سے اس کی پڑھائی کا حرج ہو رہا ہے۔ عمار نے باپ کو بتایا کہ اس نے ایک بڑی دلچسپ ترکیب سوچی ہے۔

اس نے اپنے کمپیوٹر میں ایک سافٹ ویئر انسٹال کیا ہے جس کے ذریعے مردکی آواز عورت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ عمار نے اپنا نام بدل کر اسی پروفیسر سے کلاسیں لینا شروع کر دیں۔ اب پروفیسر عمار کو لڑکی سمجھ کر پڑھانے لگا۔ پروفیسر نے نوٹ کیا کہ اس کا یہ طالب علم غیر معمولی طور پر ذہین ہے۔ اسے شک کڑا تو اس نے عمار کا ایڈمیشن ریکارڈ لکھوایا۔ فارم پر عمار کی مردانہ تصویر دیکھ کر فیسے میں اسے چپخٹ کیا کہ تمہارے پاس ۳۳ دن ہیں۔ تم بتادیا ۳۳ ٹیسٹوں کی تیاری خود کرو اور مجھے پاس ہو کر دکھاؤ۔ عمار نے کہا کہ آپ مجھے نوٹس دیں، میں آج ہی ٹیسٹ دوں گا اور ٹاپ کر کے دکھاؤں گا۔ پروفیسر نے چپخٹ کیا کہ ٹاپ کرنا تو درکنار، اگر تم اس امتحان میں پاس بھی ہو گئے تب بھی میں اپنی فونٹری سے استفادے دوں گا۔ عمار نے چپخٹ قبول کر لیا۔ پروفیسر نے اسے نوٹس دے دیے۔ عمار نے ایک گھنٹے میں تیاری مکمل کر لی۔ امتحان شروع ہو گیا۔ ایک پرچہ ۳۵ سوالات پر مشتمل تھا۔ اس کا امتحان ماچسٹر میں موجود ایک کمپیوٹر لے رہا تھا۔ عمار نے ۵۵ میں سے چار اعشاریہ نواوے نمبر حاصل کیے تھے۔ یوں عمار ورلڈ ریکارڈ ہولڈر بن گیا۔ پروفیسر نے اپنے وعدے کے مطابق استعفا دے دیا اور عمار سے اپنے رویے کی معافی مانگی۔ عمار نے کھلے دل کا مظاہرہ کیا اور کہا کہ آپ قابل احترام ہیں اور

میں آج جو کچھ بھی ہوں، آپ ہی کی وجہ سے ہوں۔

ایک برطانوی کمپنی نے عمار کو ۳۵ لاکھ روپے ماہانہ ملازمت کی پیشکش کی جو عمار نے قبول کر لی جبکہ برطانوی یونیورسٹی نے اس کی سالانہ ۹۰ ہزار ڈالر فیس معاف کر دی۔ عمار نے ۲۳ مارچ کو اورنگل ٹائن آئی کا امتحان پاس کیا تھا، وہ ۲۴ کی پرواز سے والدین سمیت برطانیہ پہنچ گیا۔ عمار نے ثابت کر دیا کہ ہم دنیا میں کسی سے کم ذہین نہیں ہیں۔ ایک پاکستانی سپورٹ نے اپنی قابلیت اور صلاحیت سب سے منوالی۔ ۱۵ سالہ پاکستانی بچہ سالانہ ۴۴ کروڑ تنخواہ، مفت گھر، مفت تعلیم اور دیگر سہولیات کا مالک بن گیا ہے۔ عمار جیسے کئی بچے گلی کوچوں میں پھر رہے ہیں کاش کوئی ان کی تعلیم و تربیت کا بندوبست کرنے والا ہو۔

پھولوں سے بنے نقش و نگار

گزشتہ دنوں امریکی شہر بوٹن میں Wafa ورلڈ الیمپک ایٹن آف فلاورز ایجنسی نے بچوں کی ہر کینگریز بنا کر ان کے درمیان پھولوں سے خوبصورت اور دیدہ زیب اشیا بنانے کا مقابلہ کروایا۔ ۲۰۱۱ء کے مقابلے کا موضوع CRITTER تھا۔ اس میں ۶۷ سال تک کے بچوں کو خشک پھولوں، پتوں، جھاڑیوں اور ٹھنیوں سے آرٹ ورک بنا کر بھیجے کا کام دیا گیا۔ پاکستان سے تیسری اور چوتھی کلاس کے ۳۳ بچوں میں کمال نذیر، شاہ میر شاہد، رافع علی خاں اور میر یازد نے شرکت کی۔ ان بچوں کے بنائے گئے آرٹ ورک کو مقابلے کی جیوری نے بہت پسند کیا۔ میکائل نذیر اور شاہ میر شاہد کے ”لاہسز“ اور ”ٹیکٹونز“ کے نمونوں کو طلافی تمغا دیا گیا۔ رافع علی خاں کے ”چوڑے“ اور میر یازد نذیر کے ”ٹینیڈ بیگز“ کو چاندی کے تمغے کے لیے منتخب کیا گیا۔



اُردو ڈائجسٹ کا مقبول سلسلہ
آپ بھی ان مشوروں کا حصہ بن سکتے ہیں،
چھوٹے چھوٹے مسئلوں کے چھوٹے چھوٹے حل
اکثر زندگی آسان کر دیتے ہیں

مشورہ حاضر ہے

صغیرہ بانو شیریں

شہد

مسز کرگل فاروق میاں کوئی سے پوچھتی ہیں، آنکھوں میں شہد لگانے سے نقصان تو نہیں ہوتا، اس بارے میں ضرور لکھیے اور سروسوں کا تیل پاؤں کے انگوٹھے پر لگا دیا جائے تو کیا فائدہ ہے۔ بہت دن سے آپ نے کوئی مضمون صحت کے حوالے سے نہیں لکھا۔ آپ کے مشورے بہت پسند ہیں اور سارے زمانے سلجھال کر رکھے ہیں۔ سب کو بتانی ہوں، فائدہ ہوتا ہے۔ شہد مکمل غذا ہے جس میں شلا ہے۔ اعتماد سے استعمال کریں تو فائدہ ہی فائدہ ہے۔ شہد لگانے سے آنکھیں صاف رہتی ہیں۔ رات کو شہد آنکھ میں لگانے سے بصارت تیز ہوتی ہے۔ شروع میں شہد بہت لگتا ہے اور چند لوگوں کو موافق بھی نہیں آتا۔ سروسوں کا تیل بزرگ حضرات پاؤں کے انگوٹھے پر لگاتے تھے، یہ بھی لودکا ہے۔ اس کے لگانے سے نقصان نہیں۔ ناف کے اندر سروسوں کے تیل میں تھوڑی سی روئی کھسکا کر رکھنے سے ہونٹ نرم رہتے ہیں۔ وقت ملا تو سروسوں پر مفضل لکھوں گی۔ زمانہ پسند کرنے کا شکریہ۔

الربحی

۶ رسالے سے میری بیوی کو الربحی ہے۔ پاؤں سے دھبے لال رنگ کے شروع ہوتے ہیں جو بڑھتے بڑھتے ناخنوں اور بازو تک آجاتے ہیں۔ چلنے پھرنے سے سوجھن ہوتی ہے۔ سیدھا لینے سے آرام ہوتا ہے۔ صبح تک دھبے لہیک ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر الربحی کہتے ہیں۔ ٹیسٹ بھی کرائے۔ کیا آپ مجھے نیم کے بارے میں بتا سکتی ہیں اور اس کے کیا فائدہ ہیں؟ آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔

(محمد یاتھ بانی)

محترم! آپ نے خط میں جگہ کا نام نہیں دیا، ورت میں وہی کسی ڈاکٹر حکیم کا پتا دے دیتی۔ الربحی کی بے شمار وجوہ ہیں۔ کچھ لوگوں کو کسی بھی چیز سے الربحی ہوتی ہے۔ وہ لوگ جو حساسیت کا شکار ہوں، وہ زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ اب جیسے اسلام آباد میں پولن الربحی کا بہت زور ہے۔ میری ایک عزیزہ نے اسلام آباد رہنا ہی چھوڑ دیا۔ بغیر وہاں کے پائلن لہیک ہیں۔ پودوں، دھانکیوں، چانوروں، گندھ، وغیرہ موسم وغیرہ سے الربحی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح ننھاؤں سے بھی ہوتی ہے۔ کوئی

دودھ سے، کوئی انڈے، مچھلی، گندم، گھانا، موم، کھجلی، چاکلیٹ، گوشت سے الگ ہے۔

گائے کا گوشت کھانے سے ہونٹ سوج جاتے ہیں۔ سر درد، ڈیپریشن، مایوسی، الیگزیمیا، آنکھوں اور منہ کا سوج جانا ہے، دماغ سانس کی تکلیف وغیرہ شامل ہے۔ ہمارے ایک ملنے والے بھی غلطی سے گائے کا گوشت کھائیں تو گلا سوج جاتا ہے۔ دو تین دن بعد دوا سے آرام آتا ہے۔ اسی طرح بالوں کو رنگنے سے بھی الرجی ہوتی ہے۔ منہ اور آنکھیں سوج جاتی ہیں۔ یہ لوگ بالوں کو رنگ نہیں سکتے۔ منہدی (مہندی) تک سے الرجی ہو جاتی ہے۔

اب تو نیا زمانہ ہے، ٹیسٹ ہیں، وہاں ہیں۔ پہلے زمانے میں نیم کی افادیت تھی۔ نیم کی مسواک کی جاتی۔ دانت مضبوط رہتے۔ نم کی لمپ لیاں بچوں کو زبردستی عرصہ دن کھلائی جاتی، کوئی دانت نہیں نکلتا تھا۔ نیم کا کھی بنا کر چوری میں کھلوا دیا جاتا۔ پھوڑے پھنسیاں، جلدی امراض نہیں ہوتے تھے۔ آپ کی بیگم کا مرض پرانا ہے، آپ انہیں ہمدردی میں لے جا کر دیکھائیے اور دوا استعمال کرائیے۔ مصلیٰ خون دوا کھانے سے مسئلہ ٹھیک ہو جائے گا۔

قدرتی طریقہ علاج

آپ کے مضامین صحت کے حوالے سے پسند آتے ہیں۔ اسی طرح حکیم سلیمانی صاحب کے نئے بھی مفید ہیں۔ اگر وہ اپنے مضامین میں جڑی بوٹیوں کے اندر ان کیمیکلز کا حوالہ دے دیں کہ کون ہا جز زیادہ مفید ہے تو بہت اچھا ہوگا۔ قدرتی طریقہ علاج پر بہت تحقیق ہو رہی ہے۔ ٹیسٹ ٹیوب بے بی کے ماہرین بھی الکلیس کانسٹ (قدرتی پودا) کی سفارش کرتے ہیں۔ اب جیسے اجوائن سے پیٹ کا مسئلہ خصوصاً ہوا کا خارج ہونا حل ہوتا ہے۔ اس کی خصوصیت کس بنا پر ہے۔ اسی طرح لڑکیوں کا منایا عموماً مابا نہ نظام کی خرابی سے ہوتا ہے۔ اس کا قاعدہ علاج ہونا چاہیے۔

(ذکر لعل احمد - انگلینڈ)

انگلینڈ سے ڈاکٹر بہن کا خط ہے۔ رسالہ پڑھ کر نے کا شکر ہے۔ قدرتی نباتات اور جڑی بوٹیوں کی مدد سے آج بھی مدد ملی جاتی ہے۔ فطری علاج، غذائیت کے بارے میں گھریلو خواتین علم رحمتی اور گھریلو علاج سے فائدہ پاتی تھیں۔ پہلے پان کھانے کا رواج تھا۔ پاندان میں لوہہ، الہیجی، سونف، مٹھن، اجوائن، کالا نمک وغیرہ سرور ہوتا۔ چوٹ لگتی تو بلدی دودھ سے آرام آ جاتا۔ بلدی کا لپ کیا جاتا۔ رنگ نکھارنے کے لیے بلدی اجوائن میں شامل کی جاتی۔ گھریلو لوگوں کا یہ علم تجربات کی روشنی میں سب درست چلتا جاتا۔ آج بھی ان سے استفادہ کیا جاتا ہے۔

پاکستان میں طب کے حوالے سے کافی رسالے نکلتے ہیں۔ بہت ساری معلومات فراہم کرتے ہیں۔ ہمدرد صحت، راہنمائے صحت، رحمت صحت، شفا نیوز وغیرہ صحت کے حوالے سے جدید تحقیق کے ساتھ اپنے قارئین کو ہر بات سے آگاہ کرتے ہیں۔ ہمارے ڈائجسٹ میں بھی صحت پر جو مضامین شائع ہوئے ان میں بھی کافی معلومات تھیں۔ سونف اجوائن پر بھی لکھا گیا ہے۔

ہمارے ہاں دماغ کا استعمال عام ہے۔ تھلایا، بین، ریو، فلیو، بین، نیا بین، پائیریلکسین، فوگک ایسڈ وغیرہ کے متعلق معلومات ہیں۔ اسی طرح فاسفورس، لوہا، سلفر، سوڈیم، پکٹن، ٹیم، پوناٹیم، آئیوڈین، زنک وغیرہ ہیں۔ انٹو ایسڈز کا مطالعہ باب ہے۔ اس بارے میں کم لوگوں کو علم ہے۔ آپ نیٹ پر یہ ساری معلومات لے سکتی یا طبی رسائل پڑھ سکتی ہیں۔ آپ نے مثالی کے بارے میں لکھا ہے۔ پہلا سوال خواتین سے ان کے نظام کے بارے میں پوچھا جاتا ہے، پھر ان کو کسی اچھے مشق جسم کے مطب کا بتایا جاتا ہے۔ بے شمار لڑکیوں کو فائدہ ہوتا ہے۔ طب مشرق میں بہت اچھی ادویات ہیں جو نظام بہتر کرتی ہیں۔ آپ کا مضمون میں نے نہیں دیکھا، اس لیے کچھ لکھ نہیں سکتی۔ امید ہے آئندہ بھی رابطہ رکھیں گی۔

بغلوں میں پسینہ

عمر ۱۸ سال ہے۔ میری بغلوں میں سردی گرمی بہت پسینہ آتا اور بدبو ہوجاتی ہے۔ اس کے بارے میں ضرور بتائیے۔ چہرے اور گردن پر بالوں کے لیے بھی مشورہ دیں۔ یہ میری بہن کا مسئلہ ہے۔

(حرم ارشد، راولپنڈی)

بھریلو ٹونکا تو یہ ہے۔ نیم کے پتے سکھا کر باریک صوف بنالیں۔ نہا کر خشک جگہ پر لگا لیں۔ اسٹریپٹنک ہے، دوسری بات یہ کہ پھلکڑی سفید کا ایک بڑا ڈالا ٹھنڈا کر غسل خانے میں رکھیے۔ نہانے کے بعد جسم خشک کر کے ڈالا اچھی طرح مل لیں۔ میری ایک دوست پھلکڑی ضرور استعمال کرتی ہے۔ اس سے پسینہ نہیں آتا۔ اپنے ڈاکٹر سے ضرور مشورہ کریں۔ دوسرے غیر ضروری بالوں کو زیادہ نہ چھیڑیں، وہ کالے اور سخت ہوجائیں گے۔

دانت بھر بھرے ہیں

میری عمر ۲۳ سال ہے۔ دانت خراب ہو رہے اور نکلے کر رہے ہیں۔ اس کے لیے بتائیے، درد بھی ہے، یہ کیسے ٹھیک ہوگا؟

نیکشیم کی کمی سے یہ مسئلہ ہوتا ہے۔ آپ فوراً دانتوں کے کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھائیے۔ پھل، بھڑی، دودھ اپنی غذا میں شامل کریں۔ پھلکڑی، ۶ گرام اور مازو ۲۵ گرام باریک چس کر رکھیے۔ نمک ذرا سا ملا کر دانتوں پر رات کو مٹیے۔ آدھ گھنٹے بعد کھلی کریں۔ دانت مضبوط ہوتے ہیں۔ ویلوکی مسواک دانتوں کو صاف رکھتی ہے۔ کیسینائی تجزیے سے پتا چلا ہے کہ اس میں کلورین، ٹینک، ایسڈ، گندھک، نمکیات وغیرہ ہیں۔ سب سے اچھی ویلوکی مسواک ہے۔ دانتوں سے خون نکلتا ہو، مسوڑھے سوج جائیں، کھانے میں تکلیف محسوس ہوتو ہمدرد صلب کی ریونڈ پیسٹ استعمال کرنے سے بہت فائدہ ہوتا ہے۔ میں نے بے شمار لوگوں کو بتایا اور ان کا مسئلہ ٹھیک ہو گیا۔

دانت میں درد رہتا ہو تو امرود کے تازہ پتے دس پندرہ لے کر ڈیڑھ گلاس پانی میں خوب پکا اور چھان کر غرارے کرنے سے آرام آجاتا ہے۔ اس عمر میں لڑکیاں کیے آم کی کھٹائی اور آچار خوب کھاتی ہیں۔ گرم گرم کھانا کھا کر برف کا پانی پی لیتی ہیں۔ احتیاط کریں۔ نیکشیم ضرور کھائیے اور صبح شام دانت صاف کریں۔ ہلچاپ میں آج بھی دنداسہ دانتوں پر ملا جاتا ہے۔ اس سے دانت صاف ہوجاتے ہیں۔ آپ دانتوں کی صفائی کا خاص خیال رکھیے اور ڈاکٹر کو ضرور دکھائیے۔

جسم کا بھدا پسین

میرا بچہ ڈیڑھ سال کا ہے۔ اسے میں نے ڈبے کا دودھ نہیں دیا لیکن محسوس کیا ہے کہ دودھ پلانے سے جسم بھدا ہوجاتا ہے۔ کیا بچوں کو دودھ نہیں پلانا چاہیے، اس بارے میں بتائیے۔

(سیر، وازی)

ماں کا دودھ بچے کے لیے ایک نعمت ہے۔ اب تو ڈاکٹر بھی تاکید کرتے ہیں کہ بچوں کو دودھ پلانے سے ماں اور بچہ، دونوں صحت مند رہتے ہیں، آپ اس بارے میں پریشان نہ ہوں۔ جسم کی سائنٹ قدرتی ہوتی ہے۔ آج کل طرح طرح کے اشتہار آتے ہیں، سب فضول ہیں۔ حمل کے دوران اور بچے کو دودھ پلانے تک فرق پڑتا ہے۔ جسم میں تہہ بلیاں ہوتی ہیں، پھر آہستہ آہستہ جسم معمول پر آجاتا ہے۔ بہت ساری خواتین اسی لیے بچے کو ڈبے کا دودھ پلاتی ہیں۔ آپ اپنی ڈاکٹر سے پوچھ سکتی ہیں، وہ بھی ماں کے دودھ کو فوقیت دیتی ہیں۔

سنہرے بال، نیلی آنکھیں

آپ سب کو مشورے دیتی ہیں۔ میرا بچہ ایک سال کا ہے۔ دوسرے کی خوشخبری ہے۔ میں نے پڑھا تھا، ناریل کا پھول کھانے سے بچہ بہت خوبصورت، نیلی آنکھوں اور سنہرے بالوں والا ہوتا ہے۔ یہ پھول کہاں ملتا ہے؟ خوبصورت بچے کے لیے آپ بچتے کو لکے جانتی ہیں، ضرور لکھیے۔

بی بی! بڑی بوڑھیاں کہتی تھیں، عمل کے شروع میں وہی چاول ناشتے میں کھائیں اور اس میں ناریل کاٹ کر ملائیں تو بچہ گورا ہوتا ہے۔ یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز پر قادر ہے۔ اپنی مرضی سے بچے کی شکل و صورت نہیں بنا کرتی۔ آپ نماز کے بعد قرآن پاک پڑھ کر دعا کریں، اس سے دل کو سکون ملے گا۔ نیلی آنکھوں اور سنہرے بالوں سے کیا ہوگا، صحت مند بچہ ہونا چاہیے۔ ناریل کا پھول ناریل کے اندر ہی ہوتا ہے، بازار میں نہیں ملتا۔ ضروری نہیں کہ پھول کھانے سے آنکھیں نیلی ہوں۔ اپنے دل سے یہ بات نکال دیجیے۔

لال پیاز

بازار میں اکثر سرخ پیاز ملتا اور بہت تیز ہوتا ہے۔ یہ پیاز صحت کے لیے کیسا ہے؟ اس کی تیزی اچھی نہیں لگتی۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں۔

پیاز کی کئی قسمیں ہیں اور سب ہی صحت کے لیے مفید ہیں۔ سفید پیاز، مکی پھلی پیاز، سرخ پیاز، گلابی رنگ کی چمکوں والی پیاز بازار میں ملتی ہے۔ سرخ پیاز میں کاٹے وقت آنکھوں سے پانی آجاتا ہے۔ ہول والے پیاز ٹنڈے پانی میں بھگو کر کاٹتے ہیں۔ اب سائنس دانوں نے تحقیق کی ہے جو لوگ دل کی بیماریوں میں مبتلا ہیں، وہ سرخ پیاز استعمال کریں تو دل کی شرحیں بند ہونے کا شکر بہت کم ہو جائے گا۔ ہمارے جسم کے اندر مضر صحت کو لیٹرول پیاز کھانے سے کم ہو جاتا ہے۔ پہلے زمانے میں طرح طرح کی سلاو بنی تھی بلکہ پیاز کا استعمال کھانے کے ساتھ ہوتا تھا۔ پیاز باریک کاٹ کر ہرا دھنیا، پودینہ، ہری مرچ ملا کر لیوں چمڑتے تھے۔ وال سبزی کے ساتھ یہ پیاز بہت اچھی لگتا۔

پیاز کا کچھور بناتے، باریک چوکور پیاز کے ٹکڑے، نمائش، ہری مرچ، پودینہ کے ساتھ رکھے جاتے۔ پیاز کا اچار سرکہ میں ڈالا جاتا۔ برسات کے موسم میں پیاز کا استعمال زیادہ ہوتا۔ پیاز گوشت، قیمہ پیاز، خشک پیاز پکائی جاتی، روزانہ صرف ایک پیاز کی سلاو کھائی جائے تو آپ بہت ساری بیماریوں سے بچ سکتی ہیں۔ دیہاتوں میں کڑی دھوپ میں کام کرنے والے کسانوں کی من بھائی غذا پیاز اور روٹی ہے۔ طاقت پیاز چل کر نمک مرچ ڈال کر کھاتے ہیں۔ صحت تحکیم رہتی ہے۔ آپ لال پیاز سے نکھیرائیے۔ خرید کر لائیں اور استعمال کریں، اس کے بہت فائدے ہیں۔

مچھلی

مچھلی گرم ہوتی ہے، اسے حمل کے دوران کھانا چاہیے یا نہیں، ضرور بتائیے۔ میری بہن حاملہ ہے۔ اسے مچھلی بہت پسند ہے لیکن ہم اسے کھانے نہیں دیتے۔

اس بارے میں آپ اپنی ڈاکٹر سے بھی پوچھ سکتی ہیں۔ مچھلی صحت مند غذا ہے۔ بچے میں ۲ بار لے سکتی ہیں۔ ہر چیز کی زیادتی اچھی نہیں ہوتی۔ آپ ایک ۲ ٹکڑے کھائیے۔ حاملہ خواتین کو چاہیے، وہ ڈاکٹر سے غذا کے بارے میں ضرور پوچھیں تاکہ ان کا وہم دور ہو جائے۔



باپ اور شوہر تو بہت اختیار دیتے ہیں
لیکن اولاد ہی اکثر بے اختیار کر دیتی ہے

خواتین کے بے اختیار ہونے کے باوجود وہ خود کو بے اختیار کیوں محسوس کرتی ہیں؟

میریج منٹ

ڈاٹ کام

بچے ہیں۔ امریکا جیسے ملک میں تو آج تک یہ بھی نہیں ہوا۔ اسلام میں خواتین کا کیا مقام اور اختیار ہے۔ ایک ماں کے قدموں تلے جنت رکھ دی گئی اولاد کی بخشش کے لیے ماں کی خوشی کو لازم کیا گیا۔ لیکن موجودہ دور میں خواتین کیا محسوس کرتی ہیں اور مردوں کی کیا رائے ہے، اس خصوصی سروس میں ملاحظہ کریں۔
سلیمہ ہاشمی (ڈین آف ٹکن باؤس پریذیڈنٹ)

خواتین کے اپنے آپ کو بے اختیار سمجھنے کی سارے وجود ہیں۔ پہلی یہ کہ تاریخی اور روایتی طور پر عورت کو کسی کی ملکیت سمجھا جاتا ہے اور اکثر قانون بھی اس معاملے



میں عورت کا ساتھ نہیں دیتا۔ عدالتوں میں جج صاحبان

عورت ٹلمر مثال ہے، اجلا لباس ہے شہمت لگا کے اس کو کبھی دیکھیں نہ وہ

خواتین کا احترام بنی دراصل ان کا اختیار ہوتا ہے۔ اسلام نے ان کو یہ حق بہت پہلے دے دیا تھا۔ چشمہ اسلام نے بار بار اپنے عمل سے اس کو پختہ کیا۔ لوگوں کو چاہیے کہ ان کی رہنمائی ملے آئی ہو۔ یہ حالت خانی کی بنی کی آمد ہوئی۔ آنحضرتؐ کی اپنی پیاری بیٹی فاطمہ کے لیے بھی روایات میں آیا ہے کہ آپؐ عزت اور احترام کے لیے کھڑے ہو کر استقبال کرتے۔ اپنی چادر بٹھا کر بٹھاتے اور عورت کی عزت اور تقدس کا واضح پیغام دیتے۔ ہم نے دین سے دوری اختیار کی تو ساری تعلیمات بھی بھلا دیں۔ مغرب کی بیرونی شروع کی جہاں عورت بے حرکت کی جوتی سے زیادہ کچھ نہیں تھی۔ اسے تو وہ حق ملے بھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ اب بھی باقاعدہ پہنی جاتی ہے۔ وہاں اس کی تجارت کی جاتی ہے۔ ہم ایک عورت کو دو بار وارز اعظم بنا

اولاد آجائے یا پھر وہ رشتے جو ہم پر لاگو ہیں۔ ہم ان تمام اختیارات کے باوجود بھی بے اختیار محسوس کرتے ہیں۔ کیونکہ کچھ رشتوں سے چھکارا آسان نہیں، ذمہ داری کا احساس ہمیں پیدا ہوتے ہی ہو جاتا ہے۔

میری اپنی مثال ہے کہ میرے پاس وہ تمام اختیارات ہیں جو ایک بیوی، ایک بیٹی اور بہو اور معاشرے کا ذمہ دار فرد ہونے کے تھے اگر میں استعمال کرنا چاہوں تو میں کر سکتی ہوں، لیکن یہ اختیار صرف اس لیے استعمال نہیں کرتی کہ میں صرف ایک بے اختیار عورت نہیں، بلکہ ان تمام رشتوں سے جو ایک عورت ہوں جو بے اختیار ہونے کے باوجود بھی بے اختیار ہے۔

ارم اشفاق (مسورہ انجیو انشیریشنز واپس)



عورت کی جذباتی بناوٹ اللہ نے ایسی بنائی ہے کہ وہ تحقیق کے احساس میں غرق ہے۔ یہ اس کی فطری خواہش ہی نہیں بلکہ اس کے لیے ایک خوبصورت احساس

ہوتا ہے کہ مرد اس کی حفاظت کرتا ہے۔ اللہ نے مرد کو عورت پر حاکم بھی اسی لیے مقرر کیا ہے کہ اس پر عورت جیسی نازک اور مقدم ہستی کو اپنی پناہ اور حفاظت میں رکھے۔ عورت کوئی بھی طاقتور نہیں ہے، وہ ایک امر قابل کی طرح ہوتی ہے جو ایک مضبوط اور تیز آواز درخت سے لپٹ کر پھلنا پھولنا چاہتی ہے۔

ایم اے رشید سینئر ایڈیٹر، کالم نگار، مصنف

سیاسی تجزیہ کار، کارکن تحریک پاکستان گولڈ میڈلسٹ موجودہ معاشرے میں اختیار کا ہونا یا نہ ہونا اس بات کی بنیاد سے پرکھا جاسکتا ہے کہ ان اختیارات کا استعمال کیسے ممکن بنایا جاسکتا ہے۔ ایسے اختیارات استعمال کرنے

عورت کو مرد کی ملکیت سمجھتے ہیں اور اگر عورت مرضی سے شادی کرنا چاہے یا چاہیہ اوکا اتفاق کرے تو اس کی رائے کو ترجیح نہیں دی جاتی۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اگر پارلیمنٹ اور اسمبلی میں مرد حضرات کا رویہ دیکھیں کہ وہ کس طرح عورتوں کو پیچھے دھکیلتے کی کوشش کرتے ہیں۔ تیسری وجہ اجتماعی ہے، جب بڑا پیدا ہوتا ہے تو گھر میں کس قدر خوشی منائی جاتی ہے لیکن بیٹی پیدا ہو تو یہ کہا جاتا ہے کہ اللہ کی مبینی مرضی ہے۔ لہذا میرے خیال میں جب تک یہ معاشرہ خود کو تبدیل نہیں کرتا، جب تک عورت اپنے آپ کو اختیار نہیں کر پائے گی۔

فریدہ خانم (مکھوہ)



آج کے دور کی خواتین بہت باہمت اور محنتی ہیں، ان پہ وہی ذمہ داریاں ہیں۔ وہ گھر بھی سنبھالتی اور ملازمت بھی کرتی ہیں۔ شروع سے ہی ہمارے معاشرے

اور گھروں میں یہ ماحول رہا ہے کہ عورت کی رائے اور وجود کو کوئی اہمیت ہی نہیں دی جاتی۔ انھیں بے شمار مسائل کا سامنا ہے۔ اسی لیے وہ اتنے ترقی یافتہ دور میں بھی خود کو بے اختیار پاتی ہیں۔ ہوتا تو یہ چاہیے کہ گھر والے اور خاص طور پر شوہر اپنی بیوی کا خیال رکھے اور حکومت کو بتا دے کہ وہ خواتین کے مسائل میں اور انھیں مل بھی کریں۔

آمنہ اسماعیل (ایڈیٹر، شریار علی میڈیم، لاہور)

تمام اختیارات ہونے کے باوجود ہم بے اختیار اپنے ہی ہاتھوں میں۔ ہمیں جو اختیار باپ دیتا ہے بیٹی ہونے کے ناتے، ہمیں جو اختیار شوہر دیتا ہے بیٹی ہونے کے ناتے، اور ہمیں جو اختیار معاشرہ دیتا ہے ایک خاتون ہونے کے ناتے، وہ حقیقت ہے۔ اب جہاں ہم بے اختیار ہو جاتے ہیں وہ ہے جب ہمارے سامنے ہماری

”شوہر صاحب“ (مرد) کا ہی چلتا ہے۔ مگر اس کی وجہ ہماری اپنی اجازت اور مرضی ہوتی ہے بے اختیار ہی نہیں۔

پروفیسر ایوب ندیم (شاعر، ڈرامہ نگار، پورٹریٹ ڈیلنگ کا لیڈنگ لائبریرین)



ہمارے معاشرے کے مختلف طبقاتوں میں خواتین کی حیثیت مختلف ہے۔ یقیناً ایسے طبقات بھی ہیں، جن میں خواتین کی حیثیت ایک تماشائی کی ہے یا پھر کنیز کی۔

لیکن ایسے طبقات کی بھی کمی نہیں، جہاں خواتین نہ صرف اپنی مرضی سے زندگی بسر کرتی ہیں، بلکہ بہت سے گھریلو معاملات میں ان کے فیصلوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔

رخشنده خالد (جنرل سیکریٹری لیڈنگ کلب، ڈال ٹاؤن، لاہور)

یہ ایک حقیقت ہے کہ عورت کی فطرت ہی کچھ ایسی ہے کہ وہ مرد کی محکوم ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے ایسے ہی پیدا کیا ہے اور وہ ایسے بھی مرد کو تو پروردگار عالم نے ایک بلند رتبہ عطا کیا ہے۔ جہاں تک بے اختیار ہو کر بھی بے اختیار محسوس کرنے والی بات ہے تو اگر ہم سوچیں اور غور کریں تو یہ بات ہمارے سامنے آتی ہے کہ ہمارے صدیوں سے جو معاشرتی رویے رہے ہیں اور عورت کی تربیت میں یہ بات شامل ہے کہ وہ مرد کی حاکمیت کو دل سے قبول کر چکی ہے اور وہ اسی میں ہی خوش اور راضی بردشا ہے۔ یہی بات تو یہ ہے کہ اسی میں خیر ہے۔ ہم نے دوسری صورتیں بھی دیکھی ہیں۔ بہت وسائل اور دیکھتے ہوئے ہیں اس اختیار میں۔

ڈاکٹر فارخہ شیرازی (بانی چیئر برائے نام خواتین اقبال، ایم اے اقبال، لاہور)

اصل وجہ یہ ہے کہ خواتین اپنے حقوق کو نہ پہچانتی اور نہ ہی اپنے فرائض جانتی ہیں۔ وہ دو تہہ بیوں میں الجھ

کے لیے جو ذرائع چاہیں، ان کا میسر نہ آتا خواتین کو بے اختیار محسوس کرواتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ اگر ایک بیوہ یا ایسی خاتون جو اپنے خاوند کی سرپرستی سے محروم ہے تو قانون اسے اختیار دیتا ہے کہ شرعی طور پر وہ اور اس کے بچے کفالت کے حقدار ہیں، انہیں یہ حق حاصل کرنے کے لیے بہت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہی اسے بے اختیار ہونے کا احساس کراتا ہے۔

مقصود عامر (شاعر، بانی اپنی تنظیم کروڑوں، لاہور)

دراصل عورت کو اختیار نہیں مرتبے کی ضرورت تھی، جو اسے ماں، بہن، بیٹی اور بیوی کی شکل میں عطا ہوا ہے۔ اگر اختیار مردوں پر حکومت کا نام ہے تو عورت کی یہ خواہش غلط ہے کیونکہ اپنے مرتبے کے لحاظ سے وہ کہیں احترام کے قابل ہے، کہیں خاندان کی عزت ہے، کہیں ناموس کی طمپر دار ہے اور مرد کی نسل کی امین بھی ہے اور اس کے دل پر راج بھی کرتی ہے۔ اب اور کیا اختیار چاہیے عورت کو جسے قدرت نے آجی کو ای کہا ہے۔

ریحانہ ظریف (صدر، مل)

وہ جدید میں خواتین خاصی بے اختیار ہونے کے باوجود بے اختیار بھی ہیں۔ وہ اس لیے کہ مردانہ معاشرے میں قدم قدم پر ان کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کی جاتی



ہیں مثلاً میں ایک سرکاری سکول کی صدر معلمہ اور گریڈ ۱۸ کی اعلیٰ سرکاری افسر تھی۔ خواتین اساتذہ کو میرا کہنا مان لیتیں لیکن ایک مرد چچا ہی اور ایک کلرک کو میں قواعد و ضوابط کا پابند اس لیے نہیں بنا سکتی کہ ان کا تعلق ایک خاص گروہی و لسانی تنظیم سے تھا۔ اس طرح شوہر اور بیوی کے حقوق برابر مگر گھر کے معاملات میں حتمی حکم

پروین عاطف (امراہ نگار/کالم کار)



ہمارے معاشرے
میں خواتین صدیوں سے
نہ بہت زیادہ با اختیار تھیں
اور نہ بے اختیار ہیں۔
اپنے فیصلے ذاتی طور پر
انہیں کرنے کی اجازت
تھیں دی جاتی۔ بہت کم
ایسا ہو جاتا ہے کہ شادی میں

عورت کی مرضی شامل ہو۔ آج سے ۵۰ سال پہلے عورت
ایکلی ستر نہیں کر سکتی تھی اور بچوں کی شادیوں میں بھی اس
کی رائے نہیں لی جاتی تھی۔ لیکن آج کے دور میں خواتین
تعلیم بھی حاصل کر رہی ہیں اور انہیں اقتصادی خود مختاری
بھی حاصل ہے۔ اس وجہ سے انہوں نے اپنی اولاد اور اپنی
زندگی کے لیے آواز اٹھانا بھی شروع کر دیا ہے اور اب
معاشرہ بھی انہیں اجازت دے رہا ہے۔ پہلے دور میں
خواتین خود کو بے اختیار محسوس کرتی تھیں لیکن اب ۵۰
سال تک کی خواتین اپنے فیصلے خود کرتی ہیں۔ میں اپنا
واقعہ سناتی ہوں۔ مجھے ایم اے میں داخلہ والد صاحب نے
اس شرط پر لینے دیا کہ میں پہلے مگنی کرا لوں۔ یونیورسٹی کی
طرف سے مجھے وقفہ دے کر امریکا بھیجا جا رہا تھا لیکن
والد اور شوہر (دوران تعلیم شادی بھی ہو گئی تھی) نے بالکل
اجازت نہ دی۔

نانازیر حسن ملک (پنجاب)

ہمارے پیارے وطن میں اکثر مرد عورت کو کوئی

گنتی ہیں۔ انہیں پتا ہی نہیں چلتا کہ ہماری اسلامی اقدار کیا
ہیں؟ صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے
عورت کو اعلیٰ مقام دیا ہے۔ اسے تخلیق کا وارث بنایا ہے۔
اس لیے اس کے قدموں کے پیچھے جنت ہے۔ لیکن اب
ہمارا معاشرہ ایسا ہو گیا ہے کہ خواتین کہیں سے گزر نہیں
سکتیں اور اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھتیں۔

نیلیم احمد بشیر (اندولہ)



سب سے بڑی
بات یہ کہ خواتین با اختیار
نہیں ہیں، کیونکہ وہ
معاشرتی دباؤ میں ہیں۔
ان کے کسی بھی عمل کا اثر
ان کی گھریلو زندگی یا
معاشرتی سیٹ اپ کے

حوالے سے دیکھا جاتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں وہ اتنی
با اختیار نہیں جتنی کہ ان کی ذہنی استطاعت اور قابلیت
ہے۔ ہمارے مذہب اسلام نے عورت کو بہت سے حقوق
دے دیے ہیں۔ اسلام کے لحاظ سے بیوہ عورت اور طلاق یافتہ
کا فوراً رشتہ ہو جانا چاہیے۔ لیکن ہمارے معاشرے میں اگر
کوئی عورت بیوہ یا طلاق یافتہ ہو جائے تو وہ شادی کا نام
نہیں لے سکتی۔ وہ اپنا یہ حق اور اختیار استعمال نہیں کر سکتی۔
وہ اسی ذہنی دباؤ میں رہتی ہے کہ باپ کیا کہے گا، بھائی
سوچیں گے۔ پاکستان میں ایسا نہیں ہوتا، جبکہ سعودی
عرب اور ایران میں عورت کو یہ سب حقوق حاصل ہیں۔

عورت کتنی ہی مضبوط کیوں نہ ہو، اُسے سہارے کے لیے
تن آ و در درخت سے لپٹ کر ہی پھلنا پھولنا ہے

گنیا جھانسی کی رانی، رضیہ سلطانہ، نور جہاں،
فاطمہ جناح، حیدرہ واجدہ، اندرا گاندھی، سونیا گاندھی،
محترمہ بے نظیر بھٹو، فہمیدہ مرزا، شمشاد اختر، بیگم نسیم ولی
خان اور آج کل کی اسمبلی میں خواتین کی شرکت اور ووٹر
ووچر ان کے سامنے نہیں۔ خواتین کو ان کی طاقت کا
احساس دلانے کی ضرورت ہے، کوئی اور آپ کی زندگی نہیں
بدل سکتا، اس کے لیے خود میدان میں اترنا پڑتا ہے۔

عاصمہ مختار (پیشین)

بڑی بڑی باصلاحیت لڑکیاں اپنے گھروں میں
مردوں کے سامنے بے اختیار ہوتی ہیں، وہ اپنی صلاحیت
استعمال نہیں کر پاتیں اور وہ لڑکیاں جو فیلڈ میں آنے میں
کامیاب ہو جاتی ہیں وہ خود کو بہت با اختیار محسوس کرتی ہیں
لیکن کبھی نہ کبھی اور کہیں نہ کہیں انہیں اپنا آپ بے بس اور
بے اختیار محسوس ہوتا ہے۔ مردوں کا بھی قصور نہیں۔
معاشرے کے عدم تحفظ کی وجہ سے سب اپنی عورتوں کا
تحفظ چاہتے ہیں۔ ان کی حفاظت کے لفظ نگاہ سے بعض
مرتبہ بھی بچی ہوتی ہے۔

عمر ملک (آرے ایف ایم ۹۵- کوآرڈینیٹر)

آج کی دنیا عورت کی دنیا ہے۔ اب خواتین پوری
دنیا میں پرجھاپکھی ہیں۔ پہلے گھر سے باہر نہیں جاسکتی تھیں
اب وہ اونچی سطح پر پہنچ رہی ہیں۔ تعلیم سے لے کر حکومتی
امور تک میں شریک ہیں۔

میں یہ بات کہتا ہوں کہ عورت اکثر زیادہ فیسے وار
ہوتی ہے۔ نہ جانے خواتین خود کو بے اختیار کیوں محسوس
کرتی ہیں۔ اب تو وہ دور آچکا ہے کہ مرد ذہنی تناؤ اور دباؤ کا
شکار ہیں کہ عورتیں آگے نکل گئی ہیں۔ حد یہ ہے کہ ملک میں
سب سے زیادہ منیجر شرف خدی بھی تو ایک عورت ہے۔

ٹی وی چینل چلانے سے لے کر جہاز اڑانے تک کون
سی جگہ ہے جہاں عورت نہیں ہے۔ اتنی عزت اور آزادی اور
کہاں ہے۔ عورتوں کو اپنی آزادی، عزت اور دفاتر کا خیال
بھی رکھنا چاہیے اور اس کو بڑھانے کا بھی سوچنا چاہیے۔



حیثیت نہیں دیتے ہیں۔ عورت چاہے کسی بھی روپ میں
ہو، ماں، بہن، بیٹی یا بیوی۔ حالانکہ اسلام میں عورتوں کے
بہت سے حقوق ہیں۔ خود نبی کریم ﷺ کی بہت سی
احادیث ہمیں عورت سے مساوات کا درس دیتی ہیں۔ جبکہ
عورت کو مرد و حضرات کی طرف سے گالیوں اور تشدد کا سامنا
ہے، جس کی وجہ سے اس کی صلاحیتیں بُری طرح سے متاثر
ہوتی ہیں۔ حالانکہ وہ اپنی ان صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر
معاشرے میں ایک فعال رکن کی طرح اپنا کردار بھی ادا کر
سکتی ہیں۔ ملازمت پیشہ خواتین کو شادی کے بعد بہت سے
مسائل کا سامنا ہے۔ اس وقت پاکستانی عدالتوں میں
عورتوں سے متعلق بہت سے مقدمات پھل رہے ہیں۔
حالانکہ پاکستان کی آزاد عدلیہ نے عورت کو بہت سے
حقوق دینے کے لیے نئے قوانین بھی متعارف کرائے ہیں
لیکن اگر عورت اپنے حق کے لیے آواز اٹھائے تو اسے
بدکردار ہونے کے الزامات تک کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔
عورت کو اس کا مقام دلانے کے لیے صرف کانڈی قوانین
کی حد تک نہیں بلکہ عملی شکل دینا ہوئی تاکہ وہ باصلاحیت
ہونے کے ساتھ بے اختیار نہ رہے۔

پرویش شاہین (مستند ڈائریکٹر نگہ دار، صبح سٹور، سوات)

خواتین بے اختیار نہیں بلکہ با اختیار ہیں۔ خواتین
صرف احساس کمتری اور تن آسانی کے مرض میں مبتلا
ہیں۔ دراصل ان کو مردوں نے نہیں، بلکہ انھوں نے اپنے
آپ کو خود کمزور اور بے اختیار سمجھا ہوا ہے۔ ورنہ تاریخ
ایسی بیشمار مثالوں سے بھری پڑی ہے کہ خواتین نے وقت فوقتاً
وہ کام کیے جو مرد بھی نہیں کر سکتے۔ خواتین نے مختلف میدانوں
میں رہبری کے فرائض انجام دیے ہیں۔ خواتین کو خود اپنی
حیثیت کا احساس نہیں، اس لیے وہ اپنی قوت کا بھرپور مظاہرہ
بھی نہیں کر سکتیں۔ خواتین میں بیداری پیدا کر کے
بڑے بڑے جلسوں کے بجائے محلہ کمیٹی بنانے کی ضرورت
ہے جہاں وہ اپنے مسائل پر بحث کر سکتی اور ایک دوسرے
کے تجربے سے فائدہ اٹھا سکتی ہیں۔

صحت کی دنیا

طاہرہ اعجاز ڈاٹم

شہد کا وہ مخصوص عنصر دریافت ہو گیا جو بیکٹیریا ختم کرتا ہے

جوانی یا بچپن کے اثر کے خلاف اٹکھن کو کم کریں گی۔
اس تحقیق کے ماخذ ڈاکٹر Sebastia A. J. Zaaij
ہیں جن کا تعلق میڈیکل سینٹر Amsterdam سے ہے۔
ان کا کہنا ہے شہد یا شہد سے حاصل کیے جانے والے اجزا
بیکٹیریا سے محفوظ رکھتے اور ان کا خاتمہ کرنے کے لیے
بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

اس دریافت کے لیے طبی ماہرین نے بیماری پیدا
کرنے والے بیکٹیریا کے خلاف شہد کی اینٹی بیکٹیریل
کارکردگی کو چیک کرنے کے لیے لیبارٹری میں ٹیسٹ
ٹیوب میں شہد کے اجزا کو ملحدہ علقہ بیکٹیریا کے خلاف
عمل کروایا اور نتیجے میں دیکھا گیا کہ Defensin-1
پروٹین جو کہ شہد کی مٹیوں کے ایمون سسٹم کا حصہ ہے اور
یہ ان کے شہد میں شامل ہو جاتی ہے، اس کی وجہ سے شہد
میں اینٹی بیکٹیریل خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہ تحقیق
شہد کی مٹیوں کے ایمون سسٹم کی اندرونی کارکردگی پر بھی
روشنی ڈالتی ہے جس کی وجہ سے شہد کی مٹیوں سے مزید اچھا

زمانے سے شہد کی بیکٹیریا ختم
کرنے والی اور اینٹی مائیکروبیئل
(Anti Microbial)
خصوصیات دریافت ہو چکی ہیں

قدیم

اور پرانے زمانوں سے روایتی علاج میں شہد رگوں کو ٹھیک
کرنے کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔
اب پہلی دفعہ سائنسدانوں نے اس بات کا سراغ لگایا
ہے کہ شہد جلد میں اٹکھن پھیلاتے والے بیکٹیریا کو کیسے
ختم کرتا ہے۔ یہ تحقیق جرنل FASEB کے جولائی ۲۰۱۰ء
کے شمارے میں شائع ہو چکی ہے۔ اس کے مطابق شہد کی
کھیاں ایک ایسی پروٹین بناتی ہیں جو ان کے شہد میں
شامل ہو کر اس میں اینٹی بیکٹیریل خصوصیات پیدا کرتی
ہیں۔ اس پروٹین کا نام Defensin-1 ہے۔ طبی ماہرین
کے مطابق ایک دن ایسا آئے گا کہ اس سے ایسی دوائیاں
تیار کی جائیں گی جو جلد اور جلد کی اٹکھن ٹھیک کرنے
کے لیے استعمال ہوں گی اور ایسی دوائیاں بنائی جائیں گی

انگوروں کا رس سر اور گردن کے کینسر کے خلیے ختم کرتا ہے

ہر سال پوری دنیا میں ہزاروں لوگ سر اور گردن کے کینسر کی وجہ سے فوت ہوتے ہیں۔ ایک نئی تحقیق کے مطابق طبی ماہرین نے چوبیس اور لیس پارٹری میں غلیوں پر تجربات کرنے کے بعد یہ ثابت کیا ہے کہ انگوروں کا پھل (Grape Seed Extract (GSE)) کینسر کے غلیوں کو ختم کرتا ہے اور صحت مند غلیوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتا۔

Rajesh Agarwal نے ایچ ڈی ڈاکٹر ایچ بیوڈی آف کولورڈو کینسر سینٹر کے مطابق انگوروں کا یہ اثر بہت ہی زبردست ہے۔ کینسر کے خلیے بہت جلدی سے پھیلنے میں لگتے ہیں لیکن جب ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں جو ان کے پھیلنے کے لیے موافق نہ ہوں تو اس کی وجہ سے وہ ختم ہو جاتے ہیں۔

انگوروں کا رس ایسی حالت پیدا کرتا ہے جو سر اور گردن کے کینسر کے غلیوں کے نشوونما اور پھیلنے کے لیے نقصان دہ ہوتی ہے۔ یہ کینسر کے غلیوں کے DNA پر حملہ کر کے ان کو نقصان پہنچاتا ہے اور ایسے حمل کو ہونے سے روکتا ہے جو کہ کینسر کے غلیوں کو ٹھیک ہونے میں مدد کرتا ہے۔ Agarwal کے مطابق کینسر کے غلیوں میں بہت سے ایسے خراب Pathways ہوتے ہیں جن پر ٹارگٹ کر کے ان کو ختم کیا جاسکتا ہے جب کہ تندرست غلیوں میں ایسا نہیں ہوتا۔

Agarwal لب کے مطابق یہ تحقیق سر اور گردن کے کینسر کے خلاف تحریکی میں بہت مددگار ہوگی اور اس قسم کے کینسر کو ختم کرنے میں مفید ہوگی جس کا علاج پہلے بہت مشکل تھا۔

اور صحت افزا شہد حاصل کیا جاسکتا ہے۔

طبی ماہرین کا کہنا ہے کہ ہم سب کو پتا ہے کہ شہد کا استعمال بہت اچھا ہے لیکن کیسے، یہ پہلے واضح نہیں تھا۔ اب اس تحقیق کے ذریعے ہمیں شہد کے اس مخصوص عنصر کا پتا چل گیا ہے جو اس میں بیکٹیریا کو ہارنے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔ اب ہم اس کو بیکٹیریل انکھشن کے خلاف مزید موثر بنا سکتے ہیں۔

سر جری سے پہلے پروٹین یا امائیونائزڈ کا کالم استعمال سر جری سے ہونے والی پیچیدگیوں کو کم کرتا ہے

بارڈر سکول آف ہیلتھ HSPH کی نئی تحقیق کے مطابق سر جری سے چند دن پہلے خوراک میں تبدیلی کر کے سر جری کی پیچیدگیوں سے بچا جاسکتا ہے جیسا کہ ہارٹ انیک یا فالج وغیرہ سے۔ اس تحقیق کو ثابت کرنے کے لیے HSPH کے طبی ماہرین نے چوبیس کے ۱۲ گروہوں پر تجربہ کیا۔ ایک گروہ کو ۲ سے ۱۳ دن کے

لیے حامل غذا اٹھائی گئی اور دوسرے گروپ کو پروٹین اور امائیونائزڈ زفری غذا دی گئی۔ ۲۰ ہفتوں کے بعد چوبیس کے دونوں گروہوں کو سرجیکل سٹریس (Surgical Stress) دیا گیا جو کہ گردن یا جگر کو نقصان پہنچا سکتا تھا۔ نتیجہ میں دیکھا گیا کہ جو چوبیسے حامل خوراک استعمال کر رہے تھے ان میں ۳۰ فیصد مارے گئے اور جو پروٹین اور امائیونائزڈ کے بغیر والی غذا کھا رہے تھے وہ زندہ رہے۔

طبی ماہرین کے مشاہدے کے مطابق ایسے جین (Gene) جو کسی بھی جسم کے امائیونائزڈ کی مقدار کو کم کرتے ہیں، اگر ان کو نکال دیا جائے تو بھی اس سے فائدہ ہوگا اور سر جری کے دوران پیچیدگیوں کم ہو سکتی ہیں جیسا کہ کارڈیو وید سکولر سر جریوں کے دوران سڑک کا خطرہ ۸۰ فیصد سے ۷۰ فیصد تک ہوتا ہے، لیکن یہ سر جری پر منحصر ہوتا ہے کہ سر جری جتنی مشکل ہوگی خطرہ بھی اتنا زیادہ ہوگا اور ہارٹ انیک کا خطرہ ۳ فیصد سے ۴ فیصد تک ہوتا ہے۔

پچھلے کئی سالوں کے دوران مختلف تحقیقات سے

Chemical Intolerance ہوتے ہیں، ان کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ خوشبو بدھتی جا رہی ہے اور بھی ختم نہیں ہوگی۔ لیس اینڈ ریسن نے ایسے افراد اور نارمل حساسیت رکھنے والے افراد دونوں کے درمیان خوشبو سونگھنے کے ردعمل کا مشاہدہ کیا اور نتیجہ اخذ کیا کہ زیادہ حساسیت رکھنے والے افراد نے خوشبو کو بہت زیادہ محسوس کیا اور وقت گزارنے کے ساتھ ان کو خوشبو زیادہ تیز محسوس ہوئی حالانکہ اس کی مقدار کو زیادہ نہیں کیا گیا تھا۔

ان افراد میں ۴ ریسٹ (EEG) اور (FMRI) کرنے کے بعد یہ نتائج نوٹ کیے گئے کہ زیادہ حساسیت رکھنے والے افراد میں دماغ کی کارکردگی بھی دوسرے افراد سے مختلف تھی۔ نارمل افراد کے برعکس زیادہ حساسیت والے افراد میں خوشبو کے سونگھنے کے ایک ٹھنڈے بعد بھی دماغ کی کارکردگی میں کمی نہ آئی اور وہ مسلسل اس کو محسوس کرتے رہے اور وقت گزارنے کے باوجود بھی اس خوشبو سے مانوس ہونے کی اہلیت نہ ہونے کی وجہ سے دماغ کی کارکردگی برقرار رہی۔

ایسے افراد میں دماغ کے طرف خون کا بہاؤ بھی مختلف طریقے سے ہوتا ہے اور ان میں درد کو محسوس کرنے کی حساسیت بھی زیادہ ہو سکتی ہے۔ سونگھنے کی حس پورے جسم پر اثر کرتی ہے۔ ایک اور تحقیق کے مطابق ایسے افراد میں ان چیزوں کا ردعمل بہت زیادہ ہوتا ہے جو ان کے ناک اور منہ کے Mucous Lining (خلیوں کی ایک بیرونی تہ) کو چھیرتے ہیں۔ ایسے افراد جو کہ سرخ مرچیں کھانے کی وجہ سے بہت زیادہ کھانستے ہیں، ان کے دماغ میں بھی دوسری خوشبوؤں کی نسبت اس کی وجہ سے زیادہ ردعمل ہوتا ہے۔

Chemical Intolerance حیرت انگیز طور پر بہت عام ہے لیکن دمہ اور الرجی کے برعکس اس کے لیے بہت کم تحقیقات کی گئی ہیں۔ اینڈامز یہ تحقیقات کی ضرورت ہے۔ جس کی وجہ سے اس کی تشخیص اور علاج کے مختلف نئے طریقے ڈھونڈے جاسکیں۔

سانسندہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ سرجری سے پہلے خوراک میں تبدیلی کرنے سے صحت کو بہتر بنایا جاسکتا ہے اور زندگی کی مدت کو بھی زیادہ کیا جاسکتا ہے۔ ان فوائد میں ذہنی دباؤ میں کمی، سوزش یا جلن میں کمی، بلڈ شوگر میں بہتری اور کارڈیو اسکولر صحت میں بہتری وغیرہ شامل ہیں۔ طبی ماہرین چوہوں کے بعد یہ تجربہ انسانوں پر کرنے والے ہیں اور امید کی جاسکتی ہے کہ انسانوں پر بھی یہ کامیاب ہوگا۔ ویکس باہمل یوسٹن میں مرلینوں پر اس کو شروع کر دیا گیا ہے۔ ان کو سرجری سے پہلے پر دین فری غذا استعمال کروائی جا رہی ہے۔ اگر انسانوں میں اس کے فوائد کی تصدیق ہوئی تو اس کی وجہ سے پیچیدگیوں کے خطرے کے بغیر سرجریاں کی جاسکیں گی۔

کچھ لوگ مختلف خوشبوؤں سے سونگھنے سے بیمار کیوں ہوتے ہیں؟

آپ کو کبھی یہ محسوس ہوا ہے کہ پاس کھڑے شخص کے لگائے ہوئے پرفیوم سے آپ کو سرد شروع ہو گیا ہو یا کام کے دوران کسی جگہ پر صفائی کرنے والی ٹیکلر سے آپ کی جلد میں غارش شروع ہو جائے یا کوئی بھی خوشبو آپ کو تنگ کرے؟ تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ کو اس خوشبو سے الرجی ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ایسی خوشبو کے عادی نہیں یا آپ کا دماغ اس خوشبو کو برداشت نہیں کرنا چاہتا۔ اس کو میڈیکل کی زبان میں Chemical Intolerance کہتے ہیں۔

سائیکالوجسٹ لیس اینڈ رسن جو کہ Umea یونیورسٹی سویڈن میں پڑھاتے ہیں، ان کے مطابق یہ بہت زیادہ حساسیت (Hypersensitivity) اس وجہ سے ہوتی ہے کہ آپ میں یہ اہلیت نہیں ہوتی کہ آپ ان خوشبوؤں کو برداشت کر سکیں۔

عام طور پر جب کوئی انسان کسی خوشبو کو سونگھتا ہے تو اس خوشبو کا احساس کچھ دیر بعد ختم ہو جاتا ہے لیکن وہ افراد

وٹامن بی سپلیمنٹ کا دل کی بیماری پر کوئی اثر نہیں ہوتا

اس مایکرویل کی زیادہ مقدار دل کے عارضے کے خطرے کو بڑھاتی ہے لہذا پہلے یہ تجویز کیا جاتا تھا کہ وٹامن بی سپلیمنٹ کے استعمال سے اس مایکرویل کا لیول کم کیا جاسکتا ہے جس کی وجہ سے دل کی بیماریوں کا خطرہ کم ہو سکتا ہے۔ لیکن طبی ماہرین کے مطابق اس دعوے کا کوئی سائنسی ثبوت ابھی تک نہیں ملا لہذا اس پر نظر ثانی کے لیے ۲۱۰-۲۳۰ افراد پر ۸ مرحلہ آزمائشی کوشش (Trials) کی گئی جین کسی مرحلہ بھی اس بات کے حق میں کوئی ثبوت نہ ملا کہ وٹامن بی سپلیمنٹ دل کی بیماریوں سے بچاتے ہیں اور نہ ہی ان کا کوئی اثر ہارٹ اٹیک، سٹروک یا دل کی بیماریوں سے ہونے والی اموات پر دیکھا گیا۔

طبی ماہرین کا کہنا ہے کہ ان سپلیمنٹ کو دل کی بیماریوں کے لیے تجویز کرنا ٹھیک نہیں۔ جب تک کسی نئی تحقیق سے اس کا کوئی ثبوت نہ مل جائے۔

دل کے عارضے کے خطرے سے بچنے کے لیے وٹامن بی تجویز کرنا بے کار ہے۔ طبی ماہرین کے مطابق وٹامن بی سپلیمنٹ دل کے عارضے کے خطرے کو کم یا اس سے بچا نہیں سکتا۔

اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملا جو یہ ظاہر کرے کہ وٹامن بی سپلیمنٹ کے استعمال سے ہارٹ اٹیک، سٹروک یا دوسری کارڈیو ویکسٹریوں کے خطرے میں کمی آتی ہے۔ چنانچہ ایسی تحقیقات ان عوامل کو سمجھنے کے لیے بہت مفید ہیں جن سے دل کی بیماریوں کا خطرہ یا اس سے موت واقع ہونے کا ڈر ہوتا ہے کیونکہ ایسی اموات دنیا بھر میں پہلے نمبر پر ہیں۔

پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ بعض وٹامن بی خاص طور پر B6، B9، B12 خون میں موجود ایک امینو اسید ہوموسسٹین (Homocysteine) پر اثر کرتے ہیں۔



۲۴ ممالک کے سربراہان کے مزاجوں کا بلا تبصرہ

”تقابلی جائزہ“



افردہ ناراض سوچ بچار خوش مایوس عام حالت تھکاوٹ



تحقیق و ترویج

حیرت انگیز علم اور حیرت زدہ
کرنے والی تفصیل

قتل کے

قتل کی گواہی
کیس برٹے

www.Paksociety.com

یہ

کائنات بڑی مہربان ہے۔ سوچئے کھینچنے والے لوگ جانتے ہیں کہ اگر اس کائنات کے مہربان مالک کی نشانیوں (Signs) پر توجہ دی جائے اور انسانی مشاہدے کو بہتر بنایا جائے تو یہ ہمارے لیے نئے علوم کے دروازے کھولتی رہے گی۔ ان علوم کے بہتر استعمال سے ہم اپنی زندگی کے لیے بے شمار آسانیاں پیدا کر سکتے ہیں۔

زندگی کی الجھنوں میں مدد کرنے والا ایسا ہی ایک دل چسپ علم فرینزک اینٹومولوجی (Forensic Entomology) ہے۔ اس علم میں کھنڈیش جرم کے سلسلے میں کیڑے مکوڑوں کی ساخت اور عادات کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔

خودکشی یا موت کا سبب بننے والے حادثے کی صورت میں موت کا صحیح تعین اور جگہ کا تعین بہت ضروری ہوتا ہے۔ موت کے بعد مختلف قسم کے کیڑے مکوڑے انسانی جسم کا رخ کرتے ہیں اور گوشت، خون، ہڈیاں، بال اور دیگر حصوں کو اپنی خوراک بنانے لگتے ہیں۔ مگنے مرنے کے مختلف مراحل میں مختلف کیڑے مردہ جسم پر موجود ہوتے ہیں۔ ان کیڑے مکوڑوں سے جرم کی کھنڈیش میں معاون بننے والی اہم معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً موت کو کتنا وقت گزر چکا ہے؟ کیا موت کے بعد انسانی جسم کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا گیا ہے؟

اس علم کی ابتدائی کتابوں میں سے ایک (Washing away of wrongs) ہے جو ۱۲۳۵ء میں چین میں لکھی گئی۔ اس میں ایک دلچسپ ٹھیس کا ذکر ملتا ہے۔ چین کے ایک چھوٹے گاؤں میں قتل کا ایک واقعہ ہوا۔ اس میں چاول کاٹنے والی درانٹی سے ایک شخص کو مارا گیا تھا۔ اس گاؤں میں چاول اگائے جاتے تھے اور ہر شخص کے پاس درانٹی موجود تھی۔ اس لیے قتل کی تفتیش مشکل تھی۔ تفتیش کرنے والے اہلکار نے تمام کسانوں سے کہا کہ وہ اپنی اپنی درانٹی ساتھ میں کیڑے قتلار میں کھڑے

ہو جائیں۔ اہلکار نے اس قتلار میں کھڑے کسانوں کا بغور جائزہ لیا اور قتل کی نشاندہی کر دی۔ قاتل نے بعد ازاں اپنے جرم کا اقرار بھی کر لیا۔ اہلکار کو ثبوت اس بات سے ملا کہ ایک خاص طرح کی ٹھیاں (Green Bottle Flies) صرف اس ایک کسان کی درانٹی کی طرف جاری تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ درانٹی کو چاہے جتنی بھی اچھی طرح صاف کیا جائے کھیاں خون کی باقیات کا سراغ لگا لیتی ہیں۔ موجودہ دور میں یہ علم بہت ترقی کر چکا ہے۔ کمپیوٹر ٹیکنالوجی اور ڈی این اے تحقیق سے اس علم میں اضافہ ہو رہا ہے۔ فی وی جیٹلوپ اس سائنس سے تعلق رکھنے والے مختلف مقبول شوں سے عام لوگوں کی بھی اس علم سے آگاہی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ پچھلے چند سالوں سے اس علم کو جرم کی تحقیق میں اہم مقام مل رہا ہے۔ اس کی مدد سے جرم کے کئی معمول کو حل کیا جا چکا ہے۔

اس علم کے استعمال کے لیے موت کے بعد کا پہلا مہینہ بہت اہم ہوتا ہے۔ جب موت واقع ہوتی ہے تو اس کے چند منٹوں کے بعد ہی کیڑے مکوڑے انسانی جسم پر پھینچ جاتے ہیں۔ اگر ان کی آمد، سائٹ اور عادات کو سامنے رکھا جائے تو اس علم کی روشنی سے اہم شواہد ملنے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ اس علم کا سب سے اہم پیمانہ یہ ہے کہ یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ موت کو کتنا عرصہ گزر چکا ہے۔ اس علم کی مدد سے قتل کی جگہ کا تعین بھی کیا جاسکتا ہے۔ بعض اوقات قاتل ثبوت کو مٹانے کے لیے مردہ جسم کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر دیتا ہے۔ مثلاً اگر ایک شخص کو مارنے کے بعد میدانی علاقے سے بلندی والے مقام پر منتقل کیا گیا ہے تو اس علم کا باہر جانا ہے کہ مختلف کیڑے مختلف جغرافیائی حالات میں پائے جاتے ہیں۔ اس طرح وہ تفتیش جرم میں اہم معلومات مہیا کر سکتا ہے۔

موت کس سبب سے ہوئی، اس حوالے سے بھی یہ علم قانون نافذ کرنے والوں کی راہنمائی کر سکتا ہے۔ مثلاً اگر موت کو ایک لمبا عرصہ گزر چکا ہو تو پولیس کے لیے موت کا سبب جاننا مشکل بن جاتا ہے۔ عام حالت میں کیڑے

اس علم کی ترقی سے
یہ بات روشن ہو رہی
ہے کہ اس کائنات میں
کوئی چیز بے کار نہیں
خواہ وہ کوئی حقیر سا کیڑا یا
مکھی ہی کیوں نہ ہو۔
انسان کا کام ہے کہ اپنے
مشاہدے کو وسعت
دے۔ چھوٹی چھوٹی تفصیلات
پر توجہ دے اور بڑے
بڑے نتائج اخذ کرے۔
اس طرح وہ اپنی صلاحیتوں
کو انسانوں کیلئے
مفید بنا سکے گا

مخصوص جگہوں پہ اٹھ دیتے ہیں لیکن اگر جسم پہ کھلے زخم
ہوں تو وہ ان میں بھی اٹھ دیتے ہیں۔ معمول سے بہت
کر دیگر جگہوں پہ انڈوں کی موجودگی زخموں کی نشاندہی
کرتی ہے۔

اگر اندیشہ ہو کہ قتل یا خودکشی زہر کے باعث ہوئی
ہے اور موت کو ایک لمبا عرصہ گزر چکا ہو تو جسم پہ موجود
کیڑوں پر مختلف تجربات کر کے اہم معلومات حاصل کی
جاسکتی ہیں۔

میرں کے قریب رہنے والے بریجرٹ
(Bergeret) (۱۸۵۵ء) کے بارے میں کہا جاتا ہے
کہ وہ اس علم کا پہلا مغربی ماہر تھا۔ اس کے زمانے میں
ایک گھر سے چھوٹے بچے کا مردہ جسم ملا جسے آتش دان کے
اوپر بنے تھپے میں چھپایا گیا تھا۔ تحقیق شروع ہوئی۔ اس
ماہر نے مخصوص کیڑوں کی موجودگی سے اندازہ لگایا کہ اس
موت کو کتنی سال گزر چکے ہیں اور اس مکان کے موجودہ
کیمینوں کے بجائے پرانے کیمینوں کے اس قتل میں ملوث
ہونے کے امکانات زیادہ ہیں۔

ہنگری کے ایک کشتی چلانے والے شخص کو ایک
ڈاکے کے قتل کے واقعے میں عمر قید کی سزا دی گئی۔ اس
ڈاکے کی لاش متبر کی ایک شام کشتی پر پائی گئی۔ اس دن یہ
کشتی چلانے والا شام ۶ بجے اپنی کشتی پہ پہنچا تھا اور
ڈاکے کی لاش اس کی آمد کے کچھ گھنٹوں کے بعد وہاں
دیکھی گئی تھی۔ لاش کا طبی معائنہ اگلے دن ۳ بجے ہوا۔
طبی رپورٹ میں مخصوص قسم کے کیڑوں کے انڈوں اور
لاروؤں کی موجودگی کا ذکر بھی کیا گیا۔ لیکن مقدمے کی
کارروائی میں اس پر کوئی خاص توجہ نہ دی گئی۔ مقدمے میں
کشتی چلانے والے کو عمر قید کی سزا سنائی گئی۔ ۸ سال
بعد مقدمہ دوبارہ سنا گیا۔ حشرات کا علم رکھنے والے ماہر
نے ثابت کیا کہ طبی رپورٹ میں جن لاروؤں کا ذکر کیا گیا
ہے ان کے اٹھنے والے دن شام ۶ بجے سے پہلے
دیے گئے ہیں۔ اس ثبوت سے کشتی چلانے والے کو قید
سے رہائی ملی۔

ایک مردہ قبل شامی انگلینڈ کے ملاتے میں موسم سرما
کے آخری دنوں میں ایک مردہ جسم ملا۔ جسم کم و بے حرارت
کے باعث محفوظ حالت میں تھا۔ عام طبی معلومات کی مدد
سے کہا گیا کہ اس شخص کی پلاگت ۲ یا ۳ مرتبے پہلے ہوئی
ہے۔ اس کے برعکس مردہ جسم پر موجود کیڑوں کی مدد سے
ملنے والی معلومات سے پتا چلا کہ اس شخص کو مرے ۲ ماہ
سے زائد عرصہ گزر چکا ہے۔ یہ انکشاف دیگر شواہد سے
زیادہ مطابقت رکھتا تھا لہذا عدالت نے اسے تسلیم کر لیا۔



اپنے بچوں کی آنکھوں کا خیال رکھیں

فریہ عباس

ڈاکٹر عامر اسرار بچوں کی آنکھوں کے مسائل اور علاج بتاتے ہیں

ذہانت

وشرارت سے چمکی آنکھوں والے، ہنستے، مسکراتے، پیارے پیارے صحت مند بچے سب کو اچھے لگتے ہیں۔ مکی آبادی کے ایک بڑے حصے سے تعلق رکھنے والے بچوں کی اکثریت کسی بھی بڑے مرض کا شکار ہونے کی صورت میں عدم توجہ، مسائل کی کمی، لاعلمی اور شعور و آگاہی کے فقدان کے باعث بروقت و معیاری علاج کی سہولیات سے محروم رہتے ہیں۔ خصوصاً بصارت سے محروم بچے کی زندگی کا ایسا المیہ اور عظیم نقصان ہے جس کی تلافی آئندہ زندگی میں ممکن نہیں ہو سکتی۔ بصارت سے محروم بچوں کا مستقبل ہی تاریک نہیں ہوتا بلکہ پوری زندگی اندھیروں میں گم ہو جاتی ہے۔

اپنے بچوں اور ان کی صحت سے متعلق مختلف امور کے حوالے سے ہماری مجرمانہ غفلت کا اس سے بڑا ثبوت اور لمحہ فکریہ اور کیا ہوگا کہ ہمارے پاس ایسے کوئی سرکاری و غیر سرکاری مصدقہ اعداد و شمار ہی سرے سے موجود نہیں ہیں کہ جن سے پتا چل سکے کہ ہر سال کتنے فیصد بچے پیدائشی طور پر آنکھوں کے امراض و مسائل کا شکار ہوتے ہیں؟ ترقی یافتہ ممالک کے برعکس پاکستان میں بچوں کے آنکھوں کے امراض و مسائل کا تناسب کیا ہے یا پیدائشی طور پر بصارت سے محروم بچوں کی شرح کیا ہے؟

گزشتہ دنوں معروف مدیر امراض چشم ڈاکٹر عامر اسرار سے ۱۶ سال تک کی عمر کے بچوں کی آنکھوں کے امراض و مسائل اور ان کے علاج کے حوالے سے ایک طویل معلومات افزا نشست ہوئی، جس کا مقصد والدین و اساتذہ میں شعور و آگاہی پیدا کرنا اور باب اختیار و صاحب بصیرت افراہی اس جانب توجہ مبذول کرانا تھا۔ ڈاکٹر صاحب سے ہونے والی گفتگو کے اہم نکات تذکرہ نگار ہیں۔

ہذا دیگر ممالک کے برعکس پاکستان میں بچوں کی آنکھوں کے امراض و مسائل کی شرح کا کوئی درست ریکارڈ موجود نہیں ہے۔ نہ ہی پیدائشی طور پر بصارت سے محروم ہونے والے بچوں سے متعلق کوئی اعداد و شمار ہیں۔ ہذا پاکستان سمیت دنیا بھر میں بچوں کے ۳۰ بڑے امراض نظر کمزور ہونا، پٹیکائین اور اربوٹین کے ہذا حاملہ خواتین کو کبھی بھی ڈاکٹر کے مشورے کے بغیر خود سے یا ارد گردی خواتین سے پوچھ کر دوا استعمال نہیں کرنی چاہیے کیونکہ بے شمار دوائیں ایسی ہیں جو بچے کے Optic Nerves کو نقصان پہنچاتی ہیں۔ آنکھوں میں

موٹاپہ پیدا کرنے یا بچے کی نشوونما میں رکاوٹ کا باعث بنتی ہیں۔ پیدائش کے بعد بچوں سے ڈاکٹر خاص طور پر بچے کی آنکھوں کا معائنہ ضرور کرتے ہیں کیونکہ فرض کریں اگر نومولود کی دونوں آنکھوں میں سفید موتیا موجود ہے تو اگر ۵۵ سال یا ایک مہینے کے اندر اس کا علاج نہیں کرایا جاتا تو بچہ ساری زندگی کے لیے بصارت سے محروم ہو سکتا ہے۔ ہذا کسی بھی بچے میں سب سے زیادہ جو نظر کی خرابی پیدا ہو سکتی ہے وہ پہلے ماہ میں ہوتی ہے۔ اس کے بعد دوسرا نام سے پہلا سال۔ تیسرا مرحلہ سے عمر کے پہلے ۱۰ سال۔ کسی بھی بچے میں اگر آنکھوں / نظر کی کوئی خرابی یا



بیماری ابتدائی ۱۰ برسوں کے اندر تشخیص ہو جاتی ہے تو وہ عموماً قابل علاج ہوتی ہے۔

☆ ابتدائی ۱۰ برسوں میں بچے کی نظر ۰۰ در فیصد ہوتا چاہیے جسے ہم ۶/6 یا Vision 20 / 20 کہتے ہیں اور یہ Vision دونوں آنکھوں میں ملحد و ملحد ہونا چاہیے۔

☆ آنکھوں کے موروثی امراض میں سب سے پہلی چیز ہے چشمہ لگنا، پھر موتیا بند کا آنا، اس کے علاوہ Retina کی Degenerations بھی موروثی امراض میں شامل ہے۔ گھوک مایا کا لاموتیا بھی عام ہے۔

☆ کلر بلائنڈنس موروثی ہونے کی وجہ سے ناقابل علاج ہے۔ اس میں کوئی ایک رنگ بھی ہو سکتا اور سارے رنگ بھی ہو سکتے ہیں۔

☆ نظر کا ہماری جسمانی صحت کے ساتھ ۹۹ فیصد تعلق ہے۔

☆ وہ بچے جو کم یا غیر متوازن غذا رکھتے ہیں ان کی نظر پر اثر پڑتا ہے۔
☆ چٹائی تیز کرنے / برقرار رکھنے کے لیے صحت بخش متوازن غذا کا استعمال ضروری ہے۔

☆ آنکھوں کی الرجی میں اگر تیز مریض مسالے اور کھنی چیزیں استعمال نہ کریں تو یہ نہیں ہوتی۔
☆ گرمیوں میں بچوں میں الرجی اور لکیشن عام دیکھنے میں آتے ہیں۔

☆ گرمیوں میں ایک خاص وائرس پھیلتا ہے جسے ہم اینڈینو وائرس کہتے ہیں۔ یہ واحد وائرس ہے جو Dead Objects پر بھی Survive کر جاتا اور ہاتھوں کے ذریعے پھیل کر دوسرے افراد خصوصاً بچوں کو متاثر کرتا ہے۔

☆ واپائی / متعدد امراض میں الرجی اور لکیشن اہم ہیں۔ ان سے بچنے کا بہترین علاج یہ ہے کہ اپنے ہاتھ دھوئے رہیں۔ آنکھوں کو بااوبہ نہ چھوئیں، اپنا تولیہ اور ٹکیہ الگ رکھیں۔ اس دوران جو نشو و نما استعمال کریں انھیں پوری طرح تلف / ضائع کریں۔

☆ وہ بچے جو کچھ تار آنکھ ملتے رہتے ہیں اس سے ان کی نظر کمزور ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ یہ ایک کنڈیشن ہے جسے ہم کیرنکولس کہتے ہیں۔ یہ قرینہ کا میزھا پن ہے جو آگے جا کر بہت سارے مسائل پیدا کرتا ہے۔
☆ وہ بچے جن کو چشمہ لگا ہو اور وہ نہ لگاتے ہوں، ان کی نظر پر بھی اثر پڑتا ہے۔

☆ وہ بچے جو اندھیرے میں ٹی وی دیکھتے یا اندھیرے میں پڑھنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کی نظر بھی متاثر ہوتی ہے۔

☆ ٹی وی، کمپیوٹر اور موبائل گیمز آنکھوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچاتے ہیں۔

☆ وہ بیماریاں جو دماغ اور اعصاب کو متاثر کر رہی ہوتی ہیں، ان کا براہ راست اثر آنکھوں پر بھی پڑتا ہے۔
☆ ۱۲ سے ۱۶ برس کے بچے خود بھی اپنی آنکھوں کا

کنسٹیکٹ لینز اچھی چیز ہے مگر بچوں کے لیے نہیں

جوجے اندھیرے میں ٹی وی دیکھتے ہیں، اُن کی نظر ضرور متاثر ہو جاتی ہے

پھر لینز کو سلوشن سے دھوئیں۔ کیمنٹر کی صفائی، جس جگہ لینز کو رکھا جائے، اس جگہ کے نمبر پچر اور صفائی کا خاص خیال رکھیں۔

ہمہماہر سلوشن ختم ہوا، تو اس نام پر ہرگز لینز استعمال نہ کریں۔ اکثر لوگ عام پانی سے دھو کر لینز لیتے ہیں جو بالکل غلط ہے۔ ایک ذرا سی قطعی آنکھوں کو ساری عمر کے لیے ضائع کر سکتی ہے۔

ہمہماہر فیشن کے طور پر استعمال کیے جانے والے رنگ برنگے سن گلاسز اور لینز کے معیار کا خیال ضرور رکھیں۔

ہمہماہر والدین اور اساتذہ میں بچوں کے آنکھوں کے امراض و مسائل سے متعلق شعور و آگاہی پیدا کرنے کے لیے لکچر، ورکشاپس، سیمینارز وغیرہ کا انعقاد کیا جائے تو میرے خیال میں ۹۹ فیصد مسائل تو بروقت تشخیص کے باعث ایسے ہی حل ہو جائیں۔

ہمہماہر آپریشن سے خوفزدہ والدین سے گزارش ہے کہ جب معاملہ بچے کی صحت، زندگی اور مستقبل کا ہو تو اپنا دل سخت کرنا پڑتا ہے، کیونکہ اس میں نام فریم کی اہمیت سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ اپنی ہر طرح سے تسلی کر کے بروقت فیصلہ کرنے ہی میں ان کے بچے کی بہتری ہوتی ہے۔

خیال رکھ سکتے ہیں۔ انہیں چاہیے کہ آنکھیں نہ ملیں، اندھیرے میں پڑھائی نہ کریں، رات کو جاگ کر والدین کے ڈار سے کمرے کی لائٹ بند کر کے میپونو یا موبائل پر کسیر نہ چلیں۔ اگر انہیں احساس ہو کہ ان کی آنکھ نظر کمزور ہو رہی ہے تو بروقت والدین کو آگاہ کریں۔

ہمہماہر والدین کے برعکس اساتذہ بہتر طور پر بچے کے آنکھوں کے مسائل سے آگاہ ہوتے ہیں کیونکہ کلاس روم میں اس کا Visual Behaviour زیادہ بہتر طور پر سامنے آ رہا ہوتا ہے۔ اس لیے والدین اور اساتذہ میں باہمی مشاورت اور رابطے کا قائم ہونا ضروری ہے۔

ہمہماہر سورج گرہن کے موقع پر مختلف طریقوں سے سورج کو دیکھنے سے اگر آنکھ کے پردے کے سیل مل جائیں تو آنکھ کے درمیان میں ایک دھبہ نمودار ہو جاتا ہے جو جڑوں کو فوکس کرنے میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔

ہمہماہر بچوں میں نظر کمزور ہونے کی بنیادی وجہ والدین یا دونوں میں سے ایک کا چشمہ لگانا ہے۔ آنکھوں کو بے دردی سے ملانا اور اندھیرے میں پڑھنا، ٹی وی دیکھنا وغیرہ اس کے علاوہ چوٹ لگنا، الرتی دینا اور آٹھکھٹور بھی نظری کمزوری کا باعث ہو سکتے ہیں۔

ہمہماہر کوٹیک لینز بلاشبہ اچھی چیز ہیں، لیکن ہم چھوٹے بچوں کو ان کے استعمال کی ہدایت نہیں کرتے کیونکہ ذرا سی بے احتیاطی سے پیدا ہونے والی الرتی اور آٹھکھٹور بعض اوقات ساری زندگی کے لیے نظر/آنکھ کو متاثر کر سکتے ہیں۔

ہمہماہر کوٹیک لینز ہمیشہ کسی ماہر و مستند Prescriber کی ہدایت کے بعد خریدنا چاہیے۔

ہمہماہر لینز لگانے سے پہلے ہاتھ اچھی طرح دھونا چاہیے

ڈاکٹر ناصر اسرار نے میڈیکل کی بنیادی تعلیم راولپنڈی کے میڈیکل کالج سے حاصل کرنے کے بعد آئرلینڈ کے رائل کالج آف سرجری سے ایف آر سی ایس کیا۔ سرچن بورڈ آف گریجویٹس کونسل برقی کی لیڈ شپ کی فہمیں کے بعد لندن کے کالج آف اپڈیٹس سے وی آر جی شپ کیا۔ آئرلینڈ اور برطانیہ میں تقریباً ۶ سال تک پریکٹس کرنے کے بعد ۲۰۰۰ سے پاکستان میں پرائیوٹ پریکٹس کر رہے ہیں۔ آپ کے والد اور ایک بھائی بھی آنکھوں کے ماہر ڈاکٹر ہیں۔

آئیے

بات کرتے ہیں

کتابیں سچی پڑھے لکھے
پڑھتے ہیں، ہاں کچھ کتابیں
اپنے آپ کو پڑھوا بھی لیتی ہیں۔ کچھ کو ہم بھول جاتے اور کچھ یاد
رہتی ہیں۔ کچھ کتابوں کا نام، موضوع، فکر، خیال اور انداز اس
قدر جاندار ہوتا ہے کہ انگلی پکڑے ساتھ لیے جاتی ہیں۔
اس ماہ کا موضوع ایسی ہی شاندار کتابوں کے حوالے سے ہے



اس ماہ کا موضوع

- ♦ آپ کی زندگی میں آنے اور حیران کرنے والی کتاب کون سی ہے؟
- ♦ اُس نے آپ کی سوچ کیسے بدل دی؟
- ♦ اُس کتاب کی کون سی خاص بات ابھی تک یاد ہے؟

آپ کے جوابات ایک صفحے پر مشتمل آپ کی تصویر کے ساتھ ہمیں ۱۸ مارچ ۲۰۱۴ء
سے پہلے مل جانے چاہئیں۔ آپ ہمیں جوابات editor@urdu-digest.com پر بھیج سکتے ہیں۔
بذریعہ ڈاک بھجوانے کے لیے پناوٹ کر لیں۔

مدیر اردو ڈائجسٹ

325/G-III جوہر ٹاؤن لاہور

rejected. The tender opening committee reserves the right to accept / reject any or all tenders without assigning any reason.

10. Earnest money @ 2% of the estimated cost as specified against the work in shape of deposit at call drawn in favour of the Executive Engineer, Khanwah Division DCC Depalpur from a scheduled bank must be accompanied with tender, failing which tender will not be entertained.
11. The successful bidder shall have to submit construction schedule within specific mobilization period for approval and will abide by the approved construction schedule thereof. In case of failure the contractor will respective to pay for the lost benefits, damages it occurred during execution and additional cost for the said work.
12. The contractor will establish all type of material testing lab for all type of relevant tests etc, in case of failure the contractor will be responsible to bear the cost of testing material from other sources.
13. The case of any dispute, the case will be referred to the Superintending Engineer, Depalpur Canal Circle Lahore, whose decision will be final and binding on both the parties.
14. The Engineer in-charge reserves the rights to drop / reduce / increase any work to any extent at any time as per site conditions or requirement without assigning any / reason.
15. The payment will be made according to the actual work done subject to the clearance by the consultant / Departmental committee or other agencies and subject to availability of funds.
16. The contractors will have no right to claim any interest on account of delay in making payment for the work done because of done receipt of funds well in time.

Sr.#	Name of work	T.S. Estimate		Earnest money @ 2% of bid price (in Rs.)	Tender Fee (in Rs.)	Completion period
		S.E. DCC Lahore No. & date	Cost (in Million)			
1	Lining of Mancharian Minor RD. 0+000 – 21+030 (Tail).	1107/69-W dated 22.02.2012	21.452	429100	10727	3 ½ (Months)


 Executive Engineer
 Khanwah Division DCC
 Depalpur
 23-02-12

IPL # 2492

۲۰۱۲ مارچ ۲۳

DRAFT NOTICE INVITING TENDER

1. Sealed tenders are invited on item rates based on Market Rates System from the approved Contractors of Irrigation Department who have got their names enlisted / renewed in the appropriate category for the current financial year 2011-12.
2. The tenders on Form LB will be received by the tender opening committee constituted by the Secretary Irrigation Department on 10.03.2012 at hours 11:00 AM in the office of the Executive Engineer, Khanwah Division DCC Depalpur. The tender will be opened and received by the tender opening committee on the same date and time in the presence of the Contractors or their authorized representative who care to remain present at the occasion.
3. The blank Tender Form can be purchased from the office of the Executive Engineer, Khanwah Division DCC Depalpur up to 09.03.2012 during office hours at the non refundable cost mentioned against work. No tender form will be sold on date of receipt of tenders. No tender except, those purchased from this office will be entertained / accepted.
4. The contractors / Firms who desire to obtain tender forms shall have to furnish the original documents to the Executive Engineer, Khanwah Division DCC Depalpur, regarding enlistment / renewal of their names with Irrigation Department and Pakistan Engineering Council for the current Financial Year 2011-12. Government receipts for payment of professional tax, enlistment / renewal fees etc and any other documents to his entire satisfaction along with copies of all documents duly attested by Gazetted officer. The Executive Engineer, Khanwah Division DCC Depalpur shall issue the tender form after verification of all documents.
5. All the bidders should satisfy themselves about site location, conditions prevalent at site and its accessibility because successful bidders will have to mobilize to site of work within 7-days after issuance of acceptance letter from office of the Executive Engineer, Khanwah Division DCC Depalpur.
6. The successful bidder shall have to execute the agreement with the Executive Engineer, Khanwah Division DCC Depalpur within 7-days of issuance of acceptance letter. The mobilization period is restricted to 7-days. The successful bidder is bound to deposit additional performance security equal to amount of bid if it is more than 5% below of the sanction amount from any scheduled Bank or cash with the Office of the Executive Engineer, Khanwah Division DCC Depalpur. He will have to furnish a list of the site Engineer / technical staff to be deployed by him on the project before start of work at site.
7. The work will be executed according to the approved Design / Drawings by the competent authority and specification.
8. The tenders must be delivered by intending bidders in person or their authorized agents to the Tender Opening committee in sealed envelope. Any tender received by post shall not be entertained.
9. The conditional incomplete and overwritten tenders by the bidders will be liable to

اپنا وزن
سنجھائیے

اُردو ڈائجسٹ کا ایک اور قابلِ قدر سلسلہ



وزن

کم کریں مگر

صحت

نہیں

توشین ناز

ہمیں آپ کی صحت ہی کی جیسے وزن کی بھی فکر ہے

آج کی قوموں میں کامیاب اور بے پست و مسرور زندگی میں ہر کام کے لیے وقت میں صحت ہے۔
سوائے اپنی صحت اور وزن پر دھیان دینے کے... پھر جب بوزوں کے درد و شوگر والی کے امراض
جسم کا راستہ دیکھ لیتے ہیں تو جیت اور خوش رہت مشکل ہو جاتا ہے۔ صحت از ماہر غذا ہے
توشین ناز صاحبہ نے ہماری درخواست پر اس سلسلے کو ہفت حصوں کی ہے
کرنے پر اماندگی عطا ہو رہی ہے

www.paksociety.com



www.paksociety.com

زندگی

کی سب سے بڑی نعمتوں میں سے ایک نعمت صحت ہے۔ اگر یہ نہیں تو کوئی بھی خوبصورتی چاہے وہ جسمانی ہو یا پھر منطقی، اچھی نہیں لگتی۔ اس لیے میں اپنے سب مریضوں کو بتاتی ہوں کہ وزن کم ضرور کریں لیکن صحت کے ساتھ۔ کیا فائدہ آپ کے بال بھڑ جائیں، چہرہ بوڑھا دکھائی دینے لگے اور آپ خود کو اندر سے ہر وقت کمزور محسوس کریں۔ زندگی تو صحت کے ساتھ ہی پر لطف ہو سکتی ہے، اس لیے اپنی صحت بہتر بنائیں۔ آپ کا جسم خود بخود بہتر ہو جائے گا کیونکہ مٹا پا بھی ایک بیماری ہی ہے۔

کئی قارئین نے شام کو یا اتوار کو فون کرنے کی اجازت مانگی ہے۔ اس سلسلے میں گزارش ہے کہ براہ کرم اتوار کو تو بالکل فون نہ کریں۔ پورا ہفتہ اس قدر مصروف اور مشین کی طرح کام کرتے گزرتا ہے کہ خود مجھے آرام کا وقت نہیں ملتا۔ میں چونکہ صبح شام انڈیکس کی کلاس بھی کرواتی ہوں تو دوران کلاس فون نہیں سن سکتی۔ ہاں ۱۲ سے ۲ بجے تک میرا کلیٹک ٹائم ہے اور میں نے اردو ڈائجسٹ کے قارئین کے لیے ان اوقات میں رابطہ کرنے کی سہولت رکھی ہے۔ فون ملانے سے پہلے مناسب ہوگا آپ اپنا ایک سوال پہلے سے سوچ لیں۔ اپنی خواہش اور مطلوبہ وزن لکھ لیں تو زیادہ اچھا ہے۔ فون کرتے ہی پہلے مطلوبہ معلومات یعنی اپنا قد، عمر، وزن، کوئی جسمانی مسئلہ پہلے سے جاری معمول اور اب کیا خواہش ہے، بتاویں۔ میرے لیے دوسروں کی راہ نمائی بے شک خوشی کا باعث ہوتی ہے کیونکہ جب جب مریض ٹھیک ہو کر اور اپنا مطلوبہ وزن پا کر خوشی سے فون کرتے اور ان کے پیارے ذمائی دیتے ہیں تو میں سمجھتی ہوں کہ اللہ رب العالمین کی دی ہوئی صلاحیت اور علم کے سچے اور صحیح استعمال کا سکھ دیا ہوا ہو جاتا ہے۔

آپ کو حیرت ہوگی یہ وزن کی زیادتی ایسا عالم فیتا منا ہے کہ جس نے بیسیوں لوگوں کی زندگی آجیرن (مشکل)

بنارکھی ہے۔ بچیوں کے رشتے رکے رہتے ہیں اور وہ مایوسی میں زیادہ کھا کھا کر اور موٹی ہو جاتی ہیں۔ شادی کے بعد منانے کے باعث بے نی کنیہا کرنے میں مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس سے جتنی بستی زندگی عذاب بن جاتی ہے۔ جب بدن بے ڈول اور بھدا ہوتا ہے چاہے مرد کا ہو یا عورت کا تو صرف جسم ہی نہیں تعلقات بھی بگڑ جاتے ہیں۔

لباس ہی نہیں میاں بھی تنگ ہو چکے

سب سے پہلے عائشہ کا سوال حشر نظر ہے، جو راولپنڈی سے تعلق رکھتی ہیں۔

میری عمر ۳۷ سال، وزن ۹۵ کلو اور قد ۵ فٹ ۳ اینچ ہے۔ میں صبح کھانے میں پراٹھے کے ساتھ آلیٹ اور چائے پینے کے ساتھ لیتی ہوں۔ پھر وہ پیر میں کچھ نہیں کھاتی اور رات میں ۳ روٹیاں اور گھر کا ساں ہوتا ہے۔ اکثر بے باہر سے کھانا لے آتے ہیں۔ مجھے بیڑا اور شورما بہت پسند ہے اور گاڑ کا حلوہ بھی شوق سے کھاتی ہوں۔ بکری کی اشیا اور گولیاں ناقابل پسند نہیں، لیکن حلوے سب پسند ہیں۔ میرا وزن سال میں ۱۳ کلو بڑھا ہے۔ حالانکہ میں پہلے بھی اس طرح بلکے اس سے زیادہ کھاتی تھی۔ براہ میری میری مدد کریں۔ میرے لباس سب تنگ ہو چکے ہیں اور اب تو میاں بھی تنگ آ کر خاصے بے ریماکس پاس کرتے ہیں۔

(عائشہ، راولپنڈی)

عائشہ! میں آپ کے لیے اس لیے ڈائنٹ پلان کر رہی ہوں کیونکہ ایک تو آپ نے سب کچھ سچائی سے بتایا ہے اور دوسرا آپ کے سوال کے ساتھ وہ ساری معلومات موجود ہیں جو مجھے پلان کرنے کے لیے درکار ہوتی ہیں۔ میں ادھوری معلومات کے ساتھ ڈائنٹ پلان نہیں کر سکتی۔ اگر آپ کا کوئی جسمانی مسئلہ ہو تو وہ بھی براہ کرم آپ لوگ ضرور لکھ بھیجا کریں۔ عائشہ آپ کے لیے میں جو ڈائنٹ پلان کر رہی ہوں اگر آپ اسے مستقل مزاجی اور

پورے یقین کے ساتھ اختیار کریں گی تو ان شاء اللہ آپ کو فائدہ ہوگا۔

صبح ۶ بجے: ایک پکوترا (Grape Fruit)

۸ بجے: ۲ براؤن سائیکس ایک انڈے کی سفیدی اور براؤن شکر کے ساتھ چائے لیں۔

دوپہر ۱۲ بجے: ۲ امرود

۲ بجے: گھر کا بنا سائین چھوٹی کنوری اور ایک پھلکا اور سلا کی ایک کنوری

۳ بجے: گرین ٹی

۳:۳۰ بجے: چائے کے بعد ۳ پادام

۶ بجے شام: چھوٹی پیالی بغیر بالائی دودھ

۸ بجے: بھاپ میں پٹی سبزیوں کے ساتھ ایک پھلکا رات ۹ بجے: ایک پیالی گرین ٹی

کوشش کریں رات کے کھانے کے بعد نماز پڑھیں اور سجدے رکوع توجہ سے ادا کریں۔ کبھی آپ نے سوچا کہ ہماری عشاء کی نماز سب نمازوں سے بھی کیوں ہوتی ہے؟ یہ اتنی بڑی سائنس ہے اگر آپ اس پر غور کر لیں تو کبھی بھی آپ کو کوئی جسمانی مسئلہ نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے خود ہی قدرتی طور پر عبادت میں روحانی ہی نہیں جسمانی مسائل کے بھی حل دے رکھے ہیں۔ کوشش کر کے دن میں ایک گھنٹہ پیدل چلیں اور کم از کم ۶ سے ۸ گلاس پانی پیئیں۔ خوش رہیں اور دوسروں کے لیے خوشی کا باعث بنیں۔ پھر دیکھیں وہ معجزہ جو کہ اس وقت ناممکن لگتا رہا ہے۔

جسم پر ہی نہیں، دل پر بھی بوجھ ہے

میری عمر ۳۷ سال، وزن ۶۲ کلوگرام اور قد ۵ فٹ ۳ اور ۳ رائج ہے۔ میں شادی شدہ ہوں اور ۳ بچے ہیں۔ میرے آپریشن ہوئے۔ میں صبح ۶ بجے اٹھتی ہوں، نماز پڑھنے کے بعد ذرا کھانا پانی چیتی ہوں۔ اگر کھانا نہ کھاؤں تو دودھ کی پیالی پی لیتی ہوں۔ یا قاعدگی سے پیدل چلتی ہوں مگر وزن کم نہیں ہو رہا۔ وزن سے جسم پر ہی

۲۶۸ آرڈو ایکسپریس مارچ ۲۰۱۳ء

(ام بادی۔ میانوائی)

نہیں دل پر بھی بوجھ ہے۔

آپ کا وزن ۱۰ کلو زیادہ ہے۔ لیکن ۶ کلو بھی کم کریں گی تو صحت مند ہو جائیں گی۔

آپ صبح اٹھتے ہی آدھے گھنٹے کے اندر ایک کھالیں۔

پہلا کھانا، ۶ بجے: کھانا/ اورنج

۷ بجے: سیب کا مرکب اور لہسن کے ۲ جوتے

سازے ۷ بجے: ایک ابا انڈ اور چائے کی ایک پیالی

۱۱ بجے: ۲ امرود

دوپہر ۱۲ بجے: ایک چھوٹی کنوری گھر کا سائین اور

ایک پھلکا اور سلا

۱۳ بجے: چائے کے ساتھ ایک ویت بسکٹ

۶ بجے شام: بالائی کے بغیر دودھ ایک چھوٹی پیالی

۸ بجے: ۲ شامی اور شمار کی سلا، گرین ٹی کی ایک پیالی

اگر بھوک محسوس ہو تو ایک پھل مزید کھا سکتی ہیں اور

اپنی ورزش ایک گھنٹہ ذرا تیز قدم کے ساتھ کریں۔

☆☆

۱۸ سال میں ۵۵ کلو وزن

میری عمر ۱۸ سال ہے۔ ۵۵ کلوگرام وزنی ہو گئی ہوں۔ قد ۵ فٹ ۵ رائج ہے۔ میں بہت شدت سے وزن کم کرنا چاہتی ہوں، مجھے کتنا وزن کم کرنا ہوگا۔

(ذریعہ: بہاولپور)

آپ کا وزن کم کرنے کا ہدف ۳ کلو تک ہے اور آپ بہت آسانی سے کر سکتی ہیں۔ بس اپنی طرز زندگی میں قدرے تبدیلی لائیں۔ بازاری کھانوں سے پرہیز کریں۔ آپ کی عمر کم ہے۔ اس عمر میں میٹابولزم بہت تیز ہوتا ہے جو کہ آپ کو وزن کم کرنے میں جلد مدد دے گا۔ آپ ایک گھنٹہ پیدل چلیں۔ اپنے کھانوں میں سبزیوں کا استعمال کریں۔ جب بھوک زیادہ لگے تو پھل استعمال کریں۔ پانی کا استعمال زیادہ کریں۔ آپ کو پروگرام یا پلان نہیں دے رہی۔ آپ ایک ماہ تک کھانے کا معمول بدل کر مجھ



سے رابطہ کریں۔ جب تک بازاری چیزوں سے مکمل پرہیز کریں اور اس پرہیز کو زندگی کا حصہ بنالیں۔ بھی آپ صحت مند طرز زندگی اپنائیں گی۔

☆

یہ تھے اس بار کے سو منتخب سوال۔
بے شمار قارئین نے فون پر ہی راہ نمائی کے لیے بھی 0301-4585405 پر روزانہ ۱۲ بجے سے ۲ بجے تک رابطہ کر سکتی ہیں۔ یہ میرا ٹیکنک کا وقت ہوتا ہے۔ شام میں ہیلتھ ایروکس کلاسز لیتی ہوں، اس لیے فون نہیں سن سکتی۔ یاد رکھیے! ہر ڈائنٹ پلان ہر کسی کے لیے موزوں نہیں ہوتا۔ یہ باقاعدہ قدر، عمر، وزن اور فوڈیکل ایکیونٹی

(جسمانی سرگرمیوں) کے لحاظ سے بالکل دوا کی طرح تجویز کیا جاتا ہے۔ مشورے کے بغیر استعمال سے غلطو بہ فائدہ اور ہدف حاصل نہیں کیا جاسکتا۔
خواتین کے ساتھ ساتھ مردوں کو بھی منا پلے سے شدید مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان میں کولیسٹرول کی سطح بڑھ جاتی ہے، شریائیں تنگ ہوتی ہیں تو دل کے دورے کے امکانات اور خطرات بڑھ جاتے ہیں۔ ذیابیطس، جوڑوں کا درد الگ سے زندگی تنگ کر دیتے ہیں۔

میں اپنے نئے نئے تجربات اور دنیا بھر میں اس وسعت پذیر علم کے حوالے سے کیئی تحقیق سے بے حد فائدہ اٹھاتی ہوں۔ پھلوں کی تعداد اور مقدار سے لے کر خوراک میں معدنی اجزاء کی کمی بیشی سے بہت اچھے نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ ماشاء اللہ میری فائل اپنے کانٹنس کی صحت کے حوالے سے اس قدر قیمتی مشاہدات اور تجربات سے بھر گئی ہے کہ ایک اثاثہ کی طرح اہم ہو گئی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ زندگی میں کسی بھی کام کو شوق بنا لیا جائے اور پھر اس میں مسلسل سوچنا، غور کرنا، تحقیق و جستجو کرنا جاری رکھا جائے تو بے حد عمدہ نتائج حاصل ہوتے ہیں۔

ایک زمانے میں لوگ مذاق میں کہا کرتے تھے کہ کبھی یہ وقت آنے کا کہ ہر چیز کے مخصوص معالج ہوا کریں گے۔ یہاں تک کہ ناک کے دائیں حصے کا مخصوص معالج بائیں حصے کی طرف توجہ نہیں کرے گا اور اس میں حرف آخر ہوگا۔ مجھے لگتا ہے اپنے اپنے شعبے میں ہم جہاں جہاں بھی ہوں جو کام بھی کر رہے ہوں، اس پر ہماری گرفت اس کا گہرا علم اور اس میں ڈوب کر کام کرنا ہمیشہ خوشی، عزت اور برکت کا باعث ہوگا۔ اس دعا کے ساتھ اجازت دیجیے کہ اللہ رب العالمین آپ سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے اور صحت کی دولت سے پوری طرح ہم نوا کرے۔ کیونکہ غور کیجئے تو علم ہوگا کہ اچھی صحت بذات خود کوئی شے نہیں ہے۔ اچھی صحت پا کر اپنے خاندان اور عام مخلوق کی بھلائی کے لیے اچھے اچھے کام کیجیے۔ خالق کو یہی پسند اور مطلوب ہے اور سنا ہے اسی کا حساب کتاب بھی ہوگا کہ اچھی صحت دی تھی۔ اس کا کیا کیا۔ کن کاموں میں بھلا دی..... سدا رہنے والی زندگی ملنے سے پہلے ایک لازم سوال صحت کا ضرور ہوگا ضرور.....



یہی ہے قصہ کوئز



دلچسپی، معلومات
اور کچھ کرگزر نے کا جذبہ،
یہی ہے اس
کوئز کا اصل مقصد

درست جوابات پر انعامات آپ کے منتظر ہیں

کوئز ہر اسلیم ہر اعلیٰ دانش مند سے اپنے دلچسپ تھمن کا انتخاب ہے جن کا مقصد جاننے والوں کو بے شمار کاموں اور آسان اور دلچسپ کاموں کا شعور دلانے کا شعور ملے کرتا ہے۔
جسکی معلومات اور کھانہ کرانے کا جذبہ اس کی آواز دیتی ہے۔ ان تھمن کو یہ خبر پائیں کہ جسے کے ان تھمن سے اپنے تھمن کے ۲۰۱۳ء کے سال کی اپنا تھمن کو ملے۔ اور اسے
اپنا کس کا جواب دینے، درست جوابات دینے والے کو دے دے اور اسے تو قرعہ اندازی کی جانے کی اور خوش نصیبوں کو ۲۰۱۳ء کے سال کی انعامات اور انعامات کی تھمن کے ساتھ
پس منشی کی غرضی کی ۲۰۱۳ء کے سال کی انعامات اور انعامات کی تھمن کی جانے گی۔

جوابات بھیجئے گا پتہ: **مدیر ماہنامہ اردو ڈائجسٹ 325 G-III، جوہر ٹاؤن لاہور**

گزشتہ ماہ قصہ کوئز کے درست جوابات دینے والوں کے نام:

مریم کی بی بی محمد علیہ (لاہور)، اذکر محمد امجد (لاہور)، اذکر محمد عرفان (لاہور)، پرویز محمد طاہر (سرگودھا)، محمد عزہ قادری (حیدرآباد)
فخر النساء بی بی خالد محمود (جکبہ معلوم)، محمد عیسیٰ چوہدری (ضلع جہلم)، اقبال احمد خان (کراچی)
عجیب اللہ خان سعدی (ضلع جہلم)، اویس علی (ضلع آباد)

سوال (۲) قائد اعظم محمد علی جناح (ب) پاکستان بنایا
سوال (۳) سیکھتین (ب) فرونی

سوال (۱) عطاء اللہ شاہ بخاری (ب) ملتان
سوال (۳) افغانستان (ب) اذکر امجد اور امجد
سوال (۵) جون آف آرک (ب) لڑوہ قادری کی

گزشتہ ماہ کے
درست جوابات

قرعہ اندازی کے ذریعے جنوری ۲۰۱۳ء قصہ کوئز میں انعام پانے والے خوش نصیبوں کے نام
پروفیسر محمد طاہر (52 سلطان کالونی، کالج روڈ، سرگودھا)
محمد عزہ قادری (C17، 1194، انٹر ملی شاد بازار، کھٹک، پانچ تھن، حیدر آباد)
آپ دوستوں کو انعام مبارک ہو

قصہ کوئٹہ ۱۰

(۱) اللہ کا واقعہ ہے جب اس نے افریقا میں اپنی فتوحات کے جھنڈے گاڑنے کے بعد اس آبائے کو عبور کرنے کا فیصلہ کیا جو افریقا اور یورپ کو ایک دوسرے سے ملحدہ کرتی ہے۔ اس کے ساتھ عربوں اور بربروں پر مشتمل بہادر سپاہیوں کی ناقابل تیز فوج تھی۔ اس کا جہز سمندر کے پار والا علاقہ تھا۔ سمندر کی تندہ تیز موجوں سے لڑتے ہوئے آخر کار آبائے کو کامیابی سے عبور کر لیا گیا۔ اس سے قبل کہ وہ فوج کی صفوں کو ترتیب دیتا اور لشکر کشی کرتا، اس نے محسوس کیا کہ فوج کے بعض افسر ہم کو خطرناک اور ناقابل فتح سمجھ رہے ہیں۔ لہذا اس نے ایک عجیب و غریب حکمت عملی اختیار کرتے ہوئے اپنی تمام کشتیوں کو نذر آتش کر دیا۔ اس کے بعد اس نے ایک سحرانگیز تقریر کی جس نے پوری فوج کے جذبات میں طغلام پیدا کر دیا۔ اس نے کہا "یاد رکھو! ہمارے سامنے دشمن ہے اور ہمارے عقب میں سمندر، ہمارے سامنے بھی موت ہے اور پیچھے بھی موت، تو پھر کیوں نہ ہم آگے بڑھ کر اس دلیری سے لڑیں کہ دشمن بھاگ کھڑا ہو۔ یاد رکھو یہ پوری زمین اللہ کی ہے اسی لیے میں یہ کہتا ہوں کہ زمین کا ہر خطہ ہمارا خطہ ہے۔" اس کے بعد پوری فوج نے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیے کہ جنگ کا لٹیرہ بدل گیا۔ مسلمان غالب آئے اور دشمن بھاگ کھڑا ہوا۔

(الف) بتائیے یہ کس فاتح جرنیل کا ذکر ہے؟

(ب) مسلمانوں نے یورپ کا کون سا شہر فتح کیا؟

قصہ کوئٹہ ۲۰

(۲) ۱۹۱۰ء میں انگلستان میں "جوینر ورلڈ لگ چیمپین شپ" کا آغاز ہوا۔ ۲۸ سالہ ہندوستانی پہلوان بھی اس چیمپین شپ میں شرکت کرنے پہنچا مگر چھوٹے جسم کے باعث اسے مقابلے کے لیے فیروز موزوں قرار دے کر خارج کر دیا گیا۔ جیوری کی رائے اسے اپنے لیے ذلت اور رسوائی کا فیصلہ محسوس ہوئی۔ اس نے اعلان کر دیا کہ جو پہلوان اس کے سامنے مسلسل ۵۰ مرتبہ تک ٹک کر دکھائے گا وہ اسے ۳ پاؤنڈ بطور انعام دے گا۔ یکے بعد دیگرے ۳۰ پہلوان آئے اور باری باری چٹ ہوتے رہے۔ پھر اس چیمپین شپ کے مشہور پہلوان اکھاڑے میں اترے مگر کوئی بھی ۲۲ یا ۳۰ مرتبہ سے زیادہ وہ تک نہ ٹکھڑا۔ اس واقعے کے بعد اس کا نام کا شہرہ جیوری ٹیکل گیا۔ مجبوراً جیوری کو اپنا فیصلہ تبدیل کرنا پڑا۔ اس چیمپین شپ میں

اس کی سب سے مشہور کشتی پولینڈ کے مشہور پہلوان "زوسکو" سے ہوئی۔ اس نے چند سیکنڈ میں "زوسکو" کو زمین پر دے مارا مگر کشتی کا فیصلہ نہ ہو سکا۔ لہذا کشتی کا ایک اور دن رکھا گیا۔ اس روز پولینڈ کا پہلوان بھاگ گیا اور مقابلہ نہ آیا۔ اس طرح "جوینر بل بیلٹ" ہندوستانی پہلوان نے جیت لی۔ اس نے ۳۰ سال سے زیادہ عرصے تک اکھاڑے پر اپنی اجارہ داری قائم رکھی۔ ایک ہزار سے زائد پہلوانوں سے کشتیاں لڑیں اور کبھی شکست نہ کھائی۔

(الف) اس ناقابل شکست پہلوان کے اصل اور معروف نام، دونوں بتائیے۔

(ب) ان کا تعلق ہندوستان کے کس علاقے سے تھا۔

قصہ کوئٹہ ۳۰

(۳) پاکستان قائم ہوئے ابھی سال بھر بھی نہیں ہوا تھا کہ کشمیر میں بھارتی فوج کے ایک دستے نے فوجی اہمیت کی ایک پہاڑی پر قبضہ کر لیا۔ پاکستانی فوج کی پنجاب رجمنٹ کو پہاڑی واپس لینے کی مشکل مہم ملی۔ پنجاب رجمنٹ کی جس کمپنی کو پہاڑی کا قبضہ واپس لینے کے لیے بھیجا گیا، یہ فوجیوں اس کمپنی کا کمانڈر تھا۔ ۲۷ جولائی ۱۹۴۸ء کو وہ اپنی کمپنی کے جوانوں سمیت آگے بڑھا۔ نصف شب گزر جانے کے بعد سخت اندھیرے اور دشوار راستوں کی تحقیق کے باوجود آگے بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ دشمن کے مورچوں سے یہ مشکل تمام ۵۰ گز کے فاصلے پر جا پہنچا۔ کسی آہستہ سے دشمن بیدار ہو گیا اور اس نے اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ فائرنگ کے باوجود آگے بڑھنے کا سفر جاری رہا۔ اس کا بازو گولی لگنے سے سخت زخمی ہوا مگر اس نے پرواہ کی۔ خداداد ناروں نے اسے ابھی میں نہ دیا اور آخر کار وہ شہید ہو گیا لیکن آخری سانس تک آگے بڑھنے کا سفر جاری رکھا۔

اس کی شہادت کے بعد جانثار ساتھیوں نے دلیری اور شجاعت کا ایسا مظاہرہ کیا کہ دشمن بھاگ کھڑا ہوا۔ پہاڑی واپس لے لی گئی۔ شہید کمانڈر کو بعد از شہادت ملک کا سب سے بڑا فوجی اعزاز عطا کیا گیا۔

(الف) ہم کس بہادر جوان مرشد شہید کا ذکر کر رہے ہیں؟

(ب) انھیں شجاعت کا کون سا اتفاق اور ترتیب میں کس نمبر پر دیا گیا؟

کتاب
گھر

زندگی کی سب سے قیمتی چیز
اچھی کتاب
لیا دیجئے کچھ اور نہیں

آئیے دوست! ہوں کی محبت میں مکہ و مدینہ گزرا رہے
یہ عالم آپ کو کتنوں پر تبصرے سے کافی مختلف لگے گا۔
اس میں کتاب اور صاحب کتاب
دونوں کا تذکرہ کر رہے گا اور ہر بار غور و فکر
کے لیے کچھ موقوفی آپ کی ہند
کرتے رہیں گے

مطالعے کی مسیّر پر

نویس اسلام صدیقی

ادب زندگی کا حسن ہے۔ اسی سے زندگی کی تہذیب ہوتی ہے اور مہذب معاشرے وجود پذیر
ہوتے ہیں۔ ادب اور شاعری کی خوبصورت تصویروں سے بہتر کوئی اور چیز زندگی کو خوبصورت
بنانے والی نہیں ہوتی۔ ایسے اہل مسلم کی تخلیقات یہ صرف زندہ رہتی بلکہ ہمیشہ تر تازہ
رہتی ہیں۔ ایسی نئی شے سوچ رکھنے والے اہل مسلم کی بلند پایہ کتب
کا تعارف آپ سے کروا رہے ہیں

شعور حیات

میں جا بجا نظر آتی ہیں۔ آپ کی دلچسپی کے لیے کچھ
واقعات ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں:

عاجہ اقبال نے زندگی کے آخری ایام میں اپنے ایک
موزیک کو قبول اسلام کے واقعات جمع کر کے اور کتاب
ترتیب دینے کا مشورہ دیا اور پھر خود ہی دو نہایت مؤثر
واقعات بھی سنائے۔

”بیمبئی میں کسی خوش حال مسلمان نے اپنے
حلقہ تعارف کے کچھ اونچے لوگوں کو کھانے پر بلوایا۔ ان
میں ایک عیسائی انگریز بھی تھا۔ دسترخوان پر طرح طرح
کے کھانے پنے ہوئے تھے اور قاب میں پلاؤ بھی تھا،
عیسائی انگریز نے پلاؤ نہایت شوق سے کھایا، کھانے سے
فارغ ہو گئے اور گفتگو چھڑی تو انگریز عیسائی نے نہایت
تجذیبی کے ساتھ صاحب خانہ سے درخواست کی کہ مجھے

کئی کتابیں اس قابل ہوتی ہیں کہ قاری انہیں
خوبصورت سے خوبصورت انداز میں دیکھنا چاہتا ہے۔
پلاؤ مبالغہ محمد یوسف اصلاحی کی تحریر کردہ شعور حیات
کے بارے میں بھی یہ بات کہی جا سکتی ہے۔ قابل اڑیں یہ
کتاب تین حصوں میں شائع ہوئی رہی ہے لیکن اب تمام
مضامین کو اعلیٰ معیاری گریٹ اپ اور سیرٹ اپ کے ساتھ
ایک جلد میں جمع کر دیا گیا۔

مولانا یوسف اصلاحی کو اللہ تعالیٰ نے زبان و بیان پر
ایسا مہر دیا ہے کہ ان کی تحریر سیدھی دل میں اتر جاتی ہے۔
آپ نے اپنی بات سمجھانے کے لیے قرآن و حدیث کو ہر
جگہ اپنے خوش نظر رکھا، نیز دلچسپ واقعات و امثال کتاب



کلمہ توحید پڑھا کر دائرۃ اسلام میں شامل کر لیجئے۔

صاحب خانہ حیران تھے عام قسم کی دعوت میں کسی چیز نے انگریز کے دل کی دنیا بدل دی۔ اس نے حیرت و مسرت کے طے جلے جذبات کے ساتھ سوال کیا، آپ کو کس چیز نے اس وقت متاثر کیا؟

”پلاؤ نے۔۔۔ پلاؤ کھاتے وقت میرے ذہن نے یہ سوچا کہ جس قوم کا ذوق کھانے کے معاملے میں اتنا اچھا اور اونچا ہے، دین کے معاملے میں اس کا ذوق کتنا حسین اور بلند ہوگا۔ چنانچہ میرے دل نے اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا۔“ انگریز نے جواب دیا۔

حاضرین کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی اور سبحان اللہ کی صدا میں بلند ہوئیں۔ صاحب خانہ نے خوشی میں کہا ”پلاؤ زندہ باد!“

انگریز نے جواب دیا، ”نہیں اسلام زندہ باد!“ علامہ اقبالؒ نے اپنے عزیز کو دوسرا واقعہ سناتے ہوئے کہا:

”ایک غیر مسلم کسی اونچے عہدے پر فائز تھے، مگر

میں ہمیشہ وعظرت اور آرام و آرائش کا ہر سامان موجود تھا، اونچی سوسائٹی میں عزت حاصل تھی۔ ایک دن یہی افسر گھر آئے تو ان کی بیوی نے کہا، میں نے تو اسلام کا کلمہ پڑھ لیا، آپ بھی پڑھ لیجئے اور اپنے اللہ سے ہی بندگی کا عہد کیجئے۔

افسر دیر تک بیوی کا منہ نہ کھلتے رہے، پھر بولے آخر کیوں؟ اس انقلاب کی وجہ کیا ہے؟

بیوی نے کہا ”ہمیں دنیا لگی ہر نعمت حاصل ہے، زیور کی کمی ہے نہ زرق برق لباس کی، پھر جن لوگوں سے ہمارا رابطہ ہے، وہ بھی خوش حال اور دولت مند ہیں، میں جس تقریب میں بھی لگی ہے فخری کے قہقہے سنے، زرق برق لباس دیکھے، سونے کے زیور دیکھے، میٹھ کے نغے سنے، لیکن یہ عجیب و غریب بات ہے کہ پٹے پٹروں اور ٹوٹی پچڑوں میں آنے والی غریب و محروم کی زندگی میں جو اطمینان، سکون اور خوشی میں نے دیکھی، وہ مجھے نہیں دیکھنے کو نہیں ملی۔ میں اس سے پریشان حالی کی بات کرتی ہوں اور وہ نہایت اطمینان کے ساتھ مسکرا کر جواب دیتا ہے ”اللہ مالک ہے، اس کا بڑا شکر ہے، وہ بڑا مہربان ہے، اس کے شکر کا حق ادا نہیں ہوتا، بی بی کوئی فخر کی بات نہیں، سب کا اللہ مالک ہے۔“

اور میں سوچنے لگتی ہوں کہ جو خوشی اور اطمینان اس غریب اور سخت حال و محروم کو حاصل ہے، دنیا کی ہر چیز ہوتے ہوئے بھی مجھے وہ حاصل نہیں۔ ضرور یہ اس کے دین کی برکت ہے اور اس کا دین واقعی اللہ کا سچا دین ہے۔ اسی لیے میں نے اپنے اللہ کا کلمہ پڑھا اور اس پر ایمان لایا۔ آپ بھی اپنے اللہ کا کلمہ پڑھیں اور اس پر ایمان لائیں۔“

ہندوستان کے مایہ ناز محدث حضرت مولانا انور شاہ کاشمیری کے ایک اہل حق شاگرد مولانا علی احمد بھی حدیث پر گہری نظر رکھتے تھے، آپ نہایت ہی معمولی اور کمزور جتنے کے مالک تھے۔ چھوٹا سا قد، سیاہی مائل رنگ، معمولی ناک، آتش کمزور و ناتواں، بظاہر ان کی شخصیت میں کوئی کشش نہ تھی۔

بد ضرور کرو۔ اگر کچھ اور نہیں کر سکتے تو کسی سے ہمدردی کے دو بول ہی بول لو۔ دو ٹھیکے لفظ بولنے سے تمہیں اپنی زندگی قابلِ فخر محسوس ہوگی۔

ہاں دنیا میں پیسا ہی سب کچھ نہیں۔ بہت ساری چیزیں ایسی بھی ہیں جو پیسے سے بھی قیمتی ہیں۔ ان پر کچھ بھی خرچ نہیں ہوتا۔ انہیں دینے کے لیے صرف انسان میں دل چاہیے۔

ضرورت سے زیادہ وقت کی پابندی بھی مصیبت بن جاتی ہے۔ خاندان گھر دیر سے آئے یا بیچ سکول سے تاخیر سے آئیں تو کیا آنت آجاتی ہے؟ نوکر بازار سے کچھ لے کے آنے میں کچھ منٹ زیادہ لگا دے تو کون سا پہاڑ ٹوٹ جائے گا؟ اس قسم کی فکروں سے زندگی گزارنے کے لائق نہیں رہتی۔

ہاں زندگی سے بہت کچھ لینا سیکھو۔ اس کے لیے سب سے ضروری بات یہ ہے کہ آپ کسی چھوٹی موٹی کامیابی کو لے کر مطمئن نہ ہو جاؤ۔ اپنی امیدوں کی جھوٹی ہمیشہ اتنی پھیلائے رکھو کہ وہ بھی پوری طرح بھر نہیں پائے تاکہ آپ مطمئن ہو کر نہ بیٹھ جائیں۔

دنیا میں آج تک جتنی بھی ترقی ہوئی ہے اور تعلیم و تعلم کی جتنی بھی نئی تحقیقات ہوئی ہیں، ان سب کے پیچھے سب سے بڑا سبب یہی رہا ہے۔ محققین اور ماہرین تعلیم نے بھی اطمینان کا سانس نہیں لیا اور زندگی کی آخری سانس تک بے اطمینانی کی آگ لیے آگے بڑھتے چلے گئے۔ ہم میں سے زیادہ تر لوگ اپنے ارد گرد و بار بھینٹ رہا لیتے ہیں۔ ایسا صرف ہماری غلط سوچوں کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ہمارے چھوٹے اور گھٹیا کاموں کی وجہ سے ہوتا ہے اور دیوار میں چٹنی اینٹوں کے نام ہیں: شک، حسد، ملین، مایوسی اور وہم اور ان اینٹوں کی تعمیر ہوتی ہے فکر مند کی گارے سے۔ یہ دیوار ہم اتنی اونچی بنا لیتے ہیں کہ سورج کی کرنوں کی روشنی ہم تک نہیں پہنچتی اور ہم ایک دم اندھیروں میں گھر کے رہ جاتے ہیں۔

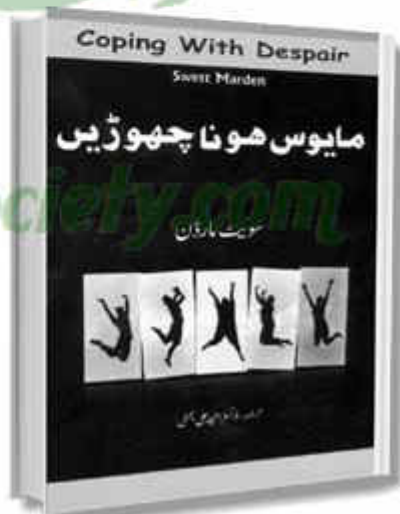
تصویر کی آواز: آپ کے اندر کی آواز سے بڑھ کے

ذیل میں کتاب سے کچھ منتخب تحریریں آپ کی دلچسپی کے لیے پیش ہیں۔

مسکراہٹ: جس طرح ہم کمانے کی طاقت بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں، اسی طرح ہمیں مسکرانے کی طاقت کو بھی بڑھانا چاہیے۔ کیونکہ اس سے بڑھ کر انسان کو اُٹھانے والی طاقت کوئی اور نہیں۔ انسانی پریشانیوں کی اس سے بڑی دوا آج تک نہیں بن سکی۔

ہر طرح کے حالات میں لطف اندوز ہونے کی عادت اپنالینے سے ہماری زندگی کی کایا ہی بدل جاتی ہے، ہم ہر بات، ہر چیز کو نئی روشنی میں دیکھنے لگتے ہیں۔ یہ کوئی انوکھی عادت نہیں بلکہ خوش مزاجی کا ہی نیا روپ ہے۔ چھوٹے بچوں میں ہنسنے، کھانیاں مارنے کی قدرتی عادت کو دبائے کی کوشش کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔ بچوں کے چہرے پر جمیدگی کی تو تمنا بھی نہیں کرنی چاہیے۔ کسی معصوم کے لٹکے چہرے کو کون دیکھنا پسند کرے گا؟ یہ تو قدرت کے اصولوں کے خلاف ہے۔

ہاں نیکی کرنے کی عادت اپناؤ۔ ہر روز کسی نہ کسی کی





دنیا میں کوئی نہیں جس کے ساتھ آپ اپنی کارگزاری یا نیکے پن کا تجزیہ کر سکیں۔ آپ کچھ بھی کرنا چاہتے اور شش و پنج میں ہیں کہ کروں یا نہ کروں تو کسی فکر میں پڑنے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی کسی کے ساتھ مشورے یا حوصلہ مندی لینے کے پکر میں پڑیں، بس صرف اپنے اندر جھانک کے اپنے مٹی کی بات پر کان دھریں۔

باطن کی منظوری حاصل کرنے کے لیے ایمانداری بہت ضروری ہے۔ ایمانداری نہیں برقیں گے تو روح کی منظوری نہیں ملے گی۔ بے ایمان آدمی کو بھی اس کا ضمیر ہر وقت کو ستا رہتا ہے، لیکن وہ اپنے ضمیر کی پینہ کاہل سننے کا عادی ہو جاتا اور پچھوٹے موٹے فائدوں کے لیے اسے بچتا پھرتا ہے۔ لیکن یہ مطلب نہیں کہ وہ پُرسکون رہ پاتا ہے۔ ایک مٹی کے لیے بھی اندرونی سکون اسے نصیب نہیں ہوتا۔ لیکن اگر کوئی اپنے ضمیر کی آواز سن کر چلتا ہے تو وہ دھابے جو بھی کھودے پھر بھی امیر رہتا ہے کیونکہ اس کے پاس خوشی کا خزانہ موجود ہے۔

صفحات: ۱۶۵

قیمت: ۲۰۰ روپے

ناشر: فکشن ہاؤس، مزنگ روڈ، لاہور

اور پاک صاف ہوں۔ مہربانی سے مجھے صرف دیکھنا ہے کہ اس کی کتابت کیسی ہے لیکن وہ محترم قرآن پاک کو تھامے دور کھڑے رہے اور مجھے دیکھنے تک نہ دیا۔ بس ایک بات بار بار کہہ رہے تھے کہ وضو کر لیں قرآن کو وضو کے بغیر پتھو بھی نہیں سکتے۔“

انسان خدا سے زیادہ اپنی رائے پر اصرار کرتے اور اسی کو دین بنا لیتے ہیں۔ سیدھی بات میں باریک باریک کتنے نکالنا اور دنیائیں دینا مشغلہ ہے۔ جس طرح قرآن پاک میں کائنات کے ذوق و قربانی کا ذکر آیا، کہ ایک سیدھے سادے حکم پر بنی اسرائیل نے بے شمار سوالات اٹھائے۔ حضرت موسیٰ کا ذوالقرنین سے بار بار سوال کرنا یا جیسے اصحاب کہف کے قہسے میں اس بات کا ذکر نہیں کہ وہ غار کہاں ہے۔ پھر بھی مفسرین نے اس کی تکلیف اٹھائی ہے۔ کوئی کہتا ہے عیننی کے پاس ہے، کوئی کہتا ہے روم میں ہے، بلقا میں ہے جبکہ اصل علم اللہ ہی کو ہے کہ وہ کہاں ہے۔

دیکھا جائے تو اگر اس میں کوئی دینی مصلحت یا ہمارا کوئی مذہبی فائدہ ہوتا تو یقیناً اللہ تعالیٰ ہمیں بتا دیتا اور

قرآن، اسلام اور عفتانہ

تتمتہ بہت زائد کی تحریر کردہ یہ کتاب اتفاق سے نظر سے گزری۔ انہوں نے اپنا اس چھوٹی سی کتاب میں کچھ بڑے بڑے نکات اٹھائے ہیں۔ پہلے اُن کا بیان کردہ ایک واقعہ پڑھیے:

”میں ایک ملنے والے پاکستانی کے گھر گئی۔ وہ محترم کچھ دن پہلے پاکستان سے واپس آئے اور وہاں سے ایک قرآن پاک بھی لائے۔ ہاتھوں کا سلسلہ چلا تو میں نے قرآن پاک دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا، وہ محترم قرآن پاک لے کر آئے۔ میں نے پکڑنا چاہا تو بھڑک اٹھے اور کہنے لگے کہ آپ پہلے وضو کر کے آئیں پھر ہاتھ لگائے دوں گا۔ میں نے بار بار کہا کہ میں نہادھو کر آئی ہوں

۴ روپے دوزانہ

قلب الدین ایک بیکار کھیلنے ایک کھیت میں جا بیٹھا۔ وہاں اسے ایک کسان مل چلا تے ہوئے نظر آیا۔ اس نے کسان سے پوچھا ”تم ان میں کتنا کماتے ہو؟“ کسان نے جواب دیا ”حضور! ۴ روپے دوزانہ کماتا ہوں۔“
بادشاہ نے دو بار سوال کیا ”تم ان روپوں کو کس طرح خرچ کرتے ہو؟“
کسان بولا ”حضور! پہلا روپ خرچ کرتا ہوں۔ دوسرا ادھار دیتا ہوں۔ میرا تیسرا روپ قرض اتارنے میں صرف ہوتا ہے اور چوتھا روپ یہ کہیں میں چھپک دیتا ہوں۔“ بادشاہ کسان کی باتیں سن کر حیران رہ گیا اور بولا ”میں تمہاری ان باتوں کا مطلب نہیں سمجھتا۔“
کسان نے کہا ”پہلا روپ مجھ پر اور میری بیوی پر خرچ ہوتا ہے۔ دوسرا روپ یہ میں اپنے بچوں پر صرف کرتا ہوں۔ تیسرا اپنے والدین پر خرچ کرتا ہوں۔ چوتھا انھوں نے مجھے پالا ہے، لہذا ان کا قرض ادا کرتا ہوں۔ چوتھا روپ یہ خیرات کرتا ہوں اور وہ ان میں اس کا انعام نہیں جانتا۔“
(محمد راشد سیال، بہتان)

امام محمد کا مذہب ہے، عطا کا قول ہے، زہری کہتے ہیں، امام مالک فرماتے ہیں، امام شافعی کا مذہب ہے۔

بیان کو اپنے ناموں کے ساتھ منسوب کرنا کیا ضروری تھا اور ہے؟ ہم یہ کیوں نہ پڑھیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں یہ فرمایا ہے۔ یہ کیوں پڑھیں کہ فلاں امام، محدث، محقق، مفتی اور عالم کا قول ہے۔ یہ تو پھر قرآن کے اصل معانی چھوڑ کر ان محترم حضرات کے معانی و مطالب اور فہم و فراست کی پیروی ہوئی۔ ایسا کیوں نہیں ہے کہ جو صریح بیانات قرآن پاک میں بیان ہوئے، انہیں بلا چون و چرا مان لیا جائے۔

سورہ قمر (آیت ۱۷) میں ارشاد خداوندی ہے ”یقیناً ہم نے قرآن کو آسان کر دیا، فصاحت والوں کے لیے، پس کیا کوئی فصاحت حاصل کرنے والا ہے۔“ (پھر مشکل کیوں بنا دیا؟)

اور آخر میں یہ بھی پڑھیں... پھر ایک کتاب ”مصرعے کے بعد کیا ہوگا“ منظر عام پر آئی۔ لکھنے والے نے ایسے لکھی کہ جیسے محترم نے وفات پا کر خود مشاہدہ کیا اور پھر زندہ ہو کر اپنے مشاہدے کو لوگوں تک پہنچایا۔ ایسی منظر کشی اللہ اللہ!

صفحات: ۱۴۰

قیمت: ۱۵۰ روپے

سناکٹ: افتخار اینڈ سنز، اردو بازار، لاہور

اپنے رسول حضرت محمد ﷺ کی زبانی بیان کرا تا۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے:

”تمہیں جو جو کام اور چیزیں جنت سے قریب اور جہنم سے دور کرنے والی تھیں، ان میں سے ایک بھی ترک کیے بغیر میں نے بتا دی ہیں۔“

اب یہ بات نہ جانے کس نے پھیلائی اور منہ در منہ نسل در نسل چلی آ رہی ہے کہ حضرات آئمہ نے اناج کا دانہ کھایا اور جنت سے نکال دیے گئے۔ قرآن پاک میں اللہ کا فرمان ہے ”پس ان دونوں نے جو درخت چکھا کھا کر ہو گیا ان دونوں کے لیے پردہ ان کا۔“ (سورہ الاعراف آیت ۲۳) اور بھی جگہ لفظ ”اشجرۃ“ آیا۔ اشجرۃ درخت کو کہتے ہیں جبکہ اناج زمین میں اگتا ہے نہ کہ درخت پر۔ اس طرح انجیل میں ہے کہ مسیح کا درخت تھا۔ بھی آئی بحث کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ کوئی پھل ہوگا جو حضرت آدم و حوٰا کے کھایا، چکھ لیا۔ کیا ان یار یک جنوں میں جائے بغیر اسلام کا راستہ اختیار کرنا اور اس پر چلنا دشوار کن ہے؟

ہر دور میں محدثین، مجتہدین، علما و فقہاء پیدا ہوئے، کتب لکھی گئیں، مستند امام بھی ہوئے اور محدث بھی۔ ہر ایک کا نظریہ الگ الگ لیکن سب قرآن کی تحریر اور اس کی سچائی پر متفق رہے۔ سب کا دین اور مذہب تو ایک ہی ہے، پھر ان حضرات کے نام پر مذہب کیوں بنا لیے گئے؟ تقابیر پڑھیں تو لکھا ہوتا ہے:

ایک شکوہ، ایک شکایت

ادبی، معلوماتی، دینی، سیاسی، معاشرتی تحریریں
پڑھ کر ہمیشہ میرا شوق رہا ہے۔ بلاشبہ
اردو ڈائجسٹ نے مجھے ایک نئی مقام پر
سب کچھ دیا جو اعلیٰ ترین ہے۔ کج
تویہ ہے کہ میری زندگی میں
میرے کردار میں
اردو ڈائجسٹ کا بہت
بہت عرصہ ہے۔ لیکن
مجھے ایک شکایت بھی
ہے، نگہ بھی ہے۔
رسالہ میں سب کچھ
ہے نہیں ہے تو
زراعت کے لیے کچھ
نہیں۔ حالانکہ ایک
زرعی ملک ہونے اور
۸۰ فیصد آبادی کا

زراعت سے وابستہ ہونا اور ایک کثیر الاشاعت ماہنامہ میں کچھ
صفحات زراعت، باغبانی، بھل پانی کے لیے بھی ہونے چاہئیں۔

(میر صاحب! تجویز اچھی ہے۔ آپ آتا ذکر کریں۔ مگر کارڈن اور
ممن میں لکائی جاتے والی چیزیں بہرہ ور ہوتی ہیں۔)

(میر صاحب! تجویز اچھی ہے۔ آپ آتا ذکر کریں۔ مگر کارڈن اور
ممن میں لکائی جاتے والی چیزیں بہرہ ور ہوتی ہیں۔)

ارفع - اللہ کا احسان تھا۔ اسی کا مال تھا

ارفع کریم پرنسپل بے حد متواضع اور معیاری اور تفصیلی تھا۔
ہمیں تو اس بچی کے بارے میں زیادہ پتا ہی نہیں تھا۔ حد یہ
ہے کہ بی بی سی لندن کے وسعت اللہ خاں نے اس پر ایک
تقریری مضمون لکھا تو اس میں صرف ایک سطر ارفع پر تھی، باقی
سارا مضمون ماسٹر عد کے کانوں اور موت پر لکھ ڈالا۔ ایک
محبت کرنے والے باپ نے اس کی قدر کی، محبت کی، اس پر
توجہ دی باقی تو سارا اللہ کا احسان تھا۔ اس نے کیا۔ اس کا مال

چمن خیال



قارئین کے تبصروں، مشوروں اور باتوں سے سب کمال

تھا اس نے واپس لے لیا۔ بہر حال اردو ڈائجسٹ نمبر لے
گیا۔ جس جس نے پڑھا، پسند کیا۔

(محمد ایوب - جامعہ دارالعلوم کراچی)

سور اُسس کی مریضہ کے مسئلہ کا حل

فردوسی کے شمارے میں ”مشورہ حاضر ہے“ میں
سور اُسس کی مریضہ کا مسئلہ شائع ہوا جو کہ بی ایس سی کی
طالبہ ہیں۔ میں اس مسئلے میں اپنی معلومات قارئین کو فراہم
کرنا چاہتا ہوں۔ ڈیڑھ ماہ قبل میں نے ایک روزنامہ میں
پڑھا تھا کہ اس مرض میں سالہا سال سے مبتلا ایک صاحب
نے لاکھوں روپے اس مرض کے علاج پر خرچ کر دیے لیکن شفا
نہاورد۔ ان کے بقول ایک حکیم صاحب نے انہیں مسلسل مولی
کھانے کا مشورہ دیا۔ مسلسل مولی کھانے سے کچھ عرصے کے
لیےفاقہ ہو گیا لیکن جب مولی کا موثر ختم ہوا تو مرض پھر عود آیا۔

آرفع کی موت میں سازش تھیوری

میں احتیاطاً یہ نہیں لکھ رہا کہ بل ٹیکس یا امریکیوں نے آرفع کریم کو کھانے میں ملا کر ایسی دہریلی دیر سے اثر کرنے والی مہلک دوا میں ملائی ہوں گی جس کی وجہ سے اس کی یہ نازک حالت ہو گئی۔

ایک صحت مند، چاق چو بند اور جسنانی لحاظ سے مضبوط لڑکی کو ایسا تک کیسے موت کی وادی میں دھکیلنے والے عوارض لاحق ہو گئے؟ ۱۳۲ پروقا ر خالق اور ماسٹر بدن کے بارے میں بھی یہی کہا گیا ہے کہ ان کے دشمنوں کو ان کی عزت و شہرت بضمضم نہیں ہوئی اور وہ کم عمری میں مار دیے گئے۔ یہی کچھ آرفع کریم کے ساتھ امریکا میں ہوا ہوگا، لیکن کیا ہمارے ڈاکٹر اس بات کو افشا کرنے کی جسارت کر سکتے ہیں۔ جو ہر وقت امریکا جانے کے پتھر میں جتنا رہتے ہیں۔
سبع خراش کے لیے تیدول سے معذرت خواہ ہوں۔

(میرالقیوم صاحب ا معذرت سے بقی ہے۔ اگلے حصے اٹھکوں کے سامنے ہونے والے واقعہ میں "سازش تھیوری" آپ نے اس آسانی سے ڈال دی۔ لکھ دیکھوں کہ کابھی ہیں۔ انہیں بدوں کو دہاں جانے کے لیے کئی سازش یا سازش کروانے کی ضرورت ہے۔ اس کا دل تھا، دہاں لے لیا۔
آٹھ میں بھی تو ان پر قرار دینا مسلمانوں پر واجب ہے۔ ہمیں تو قسمیں اگلی تین دن کا بتا دیا گیا۔ بہت بڑے سکاڑ اور مصنف خرم ہوا مراد نے اپنے بیٹے حسن صاحب مراد کے نام تھیری بارول کا آپریشن کروانے کے لیے لندن چلے گئے تھے ایک وصیت نامی تھی کہ جتنا اگر اللہ نے مجھے دہاں باز لیا تو تجھ سے کہنے کے لیے آئے والے کوئی آپریشن کو میرے مرنے کی وجہ بتائے گا۔ کوئی ڈاکٹر ان کو اجازت دے گا۔ تھی کہ وہاں مرنے کو میرے لیے موت کا فیصلہ لکھ دیا ہوگا، اپنے وقت پہ ہوگا۔ کسی بھانے کی نہ حاجت ہے نہ ضرورت۔ اس دل سے مانا ہی اہل ایمان پہ واجب ہے۔)

کیا کوئی گونگی قوم بھی ترقی کر سکتی ہے؟

میں ایک ایسے پہلو کی طرف توجہ مبذول کرانے کے لیے لکھ رہا ہوں کہ جسے ہم بھولے ہوئے ہیں۔ وہ ہے ہمارا

موصوف کسی کہنی میں ملازم تھے۔ وہ اپنے کسی کام کے سلسلے میں لاہور دوامیں بنانے والی ایک کہنی میں گئے۔ کہنی کے مینیجر بھی اس مرض میں مبتلا رہ چکے تھے۔ مینیجر صاحب نے انہیں بتایا کہ آپ وہ نامن ای کا مسلسل استعمال کریں، ان شاء اللہ شفا ہوگی۔ وہ لگتے ہیں کہ جب میں نے وہ نامن ای کا استعمال کیا تو میرا مرض غائب ہو گیا اور آج میں ایک صحت مند زندگی بسر کر رہا ہوں۔ وہ انھوں نے وہ خرقہ کر پٹے تھے لیکن ان کی شفا ایک عام وہ نامن میں ہو گئی۔
آخر میں اخبار کے زمین سٹے پر لکھا تھا کہ یہ مسئلہ مفاد عامہ کے تحت شائع کیا جا رہا ہے۔ آردوڈائجسٹ کی وساطت سے میرا بھی ایک جسنانی مسئلہ جو کہ دردوں کے متعلق تھا حل ہوا تھا، تب وہ عادی تھی۔ اسی فکر مندی سے حل سمجھ رہا ہوں۔

(سید طیب علی۔ یک ہمدانی، دہلی)

ابامیاں کی یاد میں

ڈھاکہ سے ۸۰۰۰ پاکستانی جنگلی قیدی جس میں فوجی اور سولین عورت، مرد اور بچے بھی شامل تھے، میرٹھ کے امریکہ یوں میں رکھے گئے۔ جب حافظ نظام الدین کو یہ اطلاع ملی کہ ان کے ڈھاکہ کے ایک عزیز بھی اس گپ میں ہیں، آپ اسے ملنے قیدیوں کے گپ میں گئے۔ آپ نہ صرف اپنے عزیز سے ملے بلکہ دوسرے قیدی بھی ایک سولین کو دیکھ کر پاس آگئے اور کبھی اپنی اپنی درد بھری پریشانیوں، مشکلات اور پھر ضروریات بتاتے گئے۔ ان پاکستانی قیدیوں کے حالات اور ضرورتیں دیکھ کر آپ ان کی مدد سے انکار نہیں کر سکتے۔ ان قیدیوں کی ضروریات اس وقت تک پوری کرتے رہے جب تک قیدی واپس پاکستان نہیں چلے گئے۔ یہی مزاح تھا میرے ابامیاں کا، جن پر اب میں نے اور میری بہن نے "ابامیاں" کے نام سے کتاب لکھی ہے۔ اس میں آردوڈائجسٹ کے قارئین کے لیے بہت کچھ ہے سیکھنے اور پڑھنے کو۔

(شیخ صاحب انہم نے کتاب پڑھاؤں ہے۔ دلچسپ اور دلچسپ کر دینے والی یادیں ہیں۔)
(شیخ الدین شیخ۔ پریٹک امریکا)

کیریکولم سلسلہ پر مضمون بھی ہم طالب علموں کے لیے بہت مفید ہے۔ اس کے لیے زیادہ صفحات مختص کریں۔ مزید یہ کہ اس شعبے میں درجیش پبلشرز بھی جتا دینے چاہئیں۔ بالی وڈ میں اردو کے انجیل کے محققوں پر مضمون لکھ کر آپ نے بہت سے لوگوں کی سوچ کا دائرہ وسیع کر دیا ہے اور معاملات کو مثبت طریقے سے دیکھنے کا سلیقہ سکھایا حالانکہ آج تک بالی وڈ کے مسلمان اداکاروں پر تحقیقی نکتے کوئی ہے۔ اسی باتوں کی ضرورت کنٹرول کرنے کی جرات بھی بہت کچھ سونپنے پر مجبور کر رہی۔ مجموعی طور پر رسالہ بہت اچھا تھا تاہم پاکستان ٹوڈے کے اشتہار کے حوالے سے آپ کو قوم کے عقائد کا خیال رکھنا چاہیے۔

(ادس علی۔ فیصل آباد)

۳۔ سادہ سی تھاپ ویز مگر

آرڈوڈائجسٹ کے لیے ۲۰ رجسٹریڈڈ سروسز فراہم کرتے ہیں گے۔ آپ پر پے میں تلفی کے بہتر ادائیگی کے لیے تمام الفاظ پر اعراب کے لیے کوشش کیجیے۔ دوم پر پے میں لسانی اصولوں کے مطابق جدید الفاظ کو رائج کیجیے۔ آرڈوڈائجسٹ میں اعراب اور جدید الفاظ کے رواج سے جھڑپیں قادی کے لیے آسانی ہوگی۔ زبان و ادب کے طلبہ و اساتذہ کے لیے اس کی نوعیت انفرادی خصوصیت کی حامل رہے گی۔ اس منفرد تجربے سے ڈائجسٹ کی اشاعت و مقبولیت میں نمایاں ترین اضافے کا سرورامکان ہے۔

[illegible]

(حسن راشد۔ سیکرٹری اطلاعات، جماعت اسلامی شائع حیدرآباد)

زیادہ کتابوں کی رسید

ادارہ کی ایک کتاب تجربہ کے لیے حاضر ہے۔ ایک گزارش اور یہ کہ ہمارا ادارہ ہر ماہ ۲۰ سہ ماہی کتب پیش کرتا ہے۔ میں وقتاً فوقتاً آپ کو بھیجتا رہوں گا۔ آپ کے پاس کافی کتابیں آتی ہوں گی۔ مناسب ہو گا کچھ سہ ماہی کتابوں پر تجربہ

تعلیمی پالیسی - ہماری تعلیمی پالیسی میں تبدیلی سے نہ صرف ہم بحیثیت قوم ایک جانے جاسکتے ہیں بلکہ قوم کو الگ الگ اعلام تعلیم نے جس طرح توڑ رکھا ہے، اس کا بھی الزام ہو سکے گا۔ ہمارا مسئلہ ایک جامع تعلیمی پالیسی کا ہے جس کی بناء پر ہم نہ صرف اپنے وطن سے محبت رکھنے والے بلکہ اس کے نظریے کو بھی اپنائیں اور تحقیق کے میدان میں آگے جا سکیں۔ ہمیں اپنی تعلیمی پالیسی میں خاص طور پر اساتذہ کی تربیت، ادھر سے سترہ تعلیمی نظام کے نفاذ اور قومی زبان کو بطور ذریعہ تعلیم اختیار کرنے کے لیے قویت دینا ہوگی۔ ساری قوم انگریزی پر بڑھ کر پڑھ کر پاگل ہو رہی ہے۔ کیا سب نے انگریزوں کی خدمت کے لیے ہر طائفہ چلے جاتا ہے یا ساری دنیا سے سیاح سارے کام چھوڑ کر ہماری طرف آنے والے ہیں کہ انگریزی کے بغیر سنبھال نہیں جاسکیں گے؟ انگریزی تو کیا آتی ہم اردو سے بھی گئے۔ کیا کوئی قوم بھی ترقی کر سکتی ہے؟

(ماہنامہ ترجمان اسلام آباد)

مضمون ضبط تحریر میں آچکا ہے

بہت عرصہ قبل ایک مضمون بعنوان "کھلی داؤدی" ارسال خدمت کیا تھا۔ شاید گنجائش نہ ہونے کے باعث شائع نہ ہو سکا۔ دوسرا مضمون بعنوان "گلاب" تصدیق تحریر میں آ چکا ہے۔ اگر اشاعت میں گنجائش ہو تو ان دونوں فرما کے تاکہ ارسال کر سکوں۔
(علی شہد احمد - گجرانوالہ)

(آپ اپنی مختصر مضمون اور ضروری تصاویر ضرور لکھو اور سب سے پہلے یہ بھی کوئی ایسی چیز لکھیں جو قانون پر بات کرے کیونکہ اس کی طرف سے سب سے پہلے اور بالکل سب سے پہلے فیض ملے گا۔)

اُردو کے اُنجانے محافظوں پر تحریر

جہاں تک نئے سلسلوں کا تعلق ہے، مجھے اس سلسلے بہت زیادہ پسند آئے۔ ان میں سے پہلا، نوجوان قیادت اور برکس میں ترقی کرنے والے پُر عزم لوگوں کی داستان اور انٹرویوز ہمیں بھی مستقبل میں کچھ کرنے کے لیے ابھارتا ہے۔ دوسرا منفرد سلسلہ قصہ گوئز کا ہے جو تحقیق کی جانب ہمارے قدم بڑھانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ تمبیرا

کرتے کے بجائے وصولی کی رسید اور مختصر سا احوال دے دیا کریں۔ اس سے زیادہ کتب کا تذکرہ ہو سکے گا۔

(شعریہ)۔ یہ حد مناسب مشورہ ہے۔ ان شاء اللہ اگلے ماہ سے ہی عمل کرستے ہیں۔
(رضوان اشرف۔ ریشل ہاؤس آف پبلیکیشنز، راولپنڈی)

اس پر مکمل کربات کرنی پڑے گی

آرڈوڈ انجسٹ سے

میرا ناتا بہت پرانا

ہے۔ جب آرڈو

ڈانجسٹ جناب

الطاف حسن قریشی کی

ادارت میں ایک نئی

سج دج سے شائع ہوا

تھا۔ اس وقت ادبی

پرچوں کا سورج تقریباً غروب ہو رہا تھا اور ایک نئے پرچے کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی تھی۔ یہ آرڈو کا پہلا پرچہ تھا جس نے زندگی اور زندگی کے ہر شعبے کی شائع کی گئی تھی۔ ہر طبقہ فکر کے لوگوں کا اس طرف رجوع ہو گیا تھا۔

اس کے بعد کراچی اور لاہور سے بے شمار ڈانجسٹ لکھنا شروع ہوئے مگر بانی آرڈو ڈانجسٹ ہی رہا۔ میرے جیسے نو آموز لوگوں کو اس میں گھسنے کی بھی بڑی تمنا پوری بھی ہوتی رہی۔ قریشی صاحب نے صحافت اور ادارت کو ایک نیا رخ بخشا۔ لاہور میں بڑے بڑے موضوعات قیاسیات اور بھی منعقد کرنے سکے۔ مجھے بھی یہ عزت اور تحریک کرنے کا موقع بھی دیتے تھے۔ گویا آرڈو ڈانجسٹ کے ساتھ قلم اور تعلیم کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔

مگر خدا جانے سلسلے ہمیشہ ایک جیسے کیوں نہیں رہتے۔ درمیان میں ایک ایسا عرصہ بھی گزرا جب آرڈو ڈانجسٹ کی ترسیل..... موجودہ دور کی لوڈ شیڈنگ کی طرح ہو گئی۔

یہ سب بتانے کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ جب تیسری بار مجھے ملفوف اور محفوظ شمار و ملا تو میں نے فوراً پہلا صفحہ کھول کر دیکھا..... کہ یہ کون ہے..... جو ذہن پر دستک دے

چلا جا رہا ہے..... قہرانا نام و کچھ کر میں منکر آدمی.....
آرڈو ڈانجسٹ کی نشاۃ ثانیہ شروع ہو گئی ہے۔ اللہ تمہیں اور سارے عہد کو یہ خوبصورتیاں، صحت و سلامتی کے ساتھ فزوں ترک کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

میں ادب پرانے زندگی کی قائل رہی ہوں۔ فنون لطیفہ کی جتنی اصناف ہیں وہ زندگی کو سمجھنے، سمجھانے، برستے، محسوس کرنے اور راست دکھانے کے لیے ہوتی ہیں۔ ان میں سے اگر اخلاقیات نکل جائے تو وہ زندگی کی طرف لے جاتی ہیں۔ تمہارے سوالات اٹھاتے ہو اور بہت اچھا کرتے ہو۔ ایک بات قابل تشویش ہے کہ ہمارے ہاں انسانی رویے متغی ہوتے جا رہے ہیں۔ دوسروں کو ہنر مارنے کی کھلی اجازت ہے مگر کوئی اسے گریبان میں جھانکنا پسند نہیں کرتا۔

ایکٹروٹک میڈیا کی یلغار میں تربیت کا عنصر غائب ہو گیا ہے۔ ۳۳ ادارے تھے، جو کردار سازی کا فریضہ ادا کرتے تھے۔ والدین خصوصاً ماں، اساتذہ اور مساجد۔ اب تربیت سازی ایکٹروٹک میڈیا کر رہا ہے۔ ایہادات انسان کی بہتری کے لیے آئیں مگر مفاد پرستوں نے انہیں نشکا کا قبیلہ بنا چاہا۔ ہمارے انفرادی متغی رویے سے پاکستان کی ساکھ کو کتنا نقصان پہنچ رہا ہے اور ہمارے اجتماعی فیروزے و ارادہ روئے سے پاکستان کی معیشت کو کتنا نقصان پہنچ رہا ہے، اس پر مکمل کربات کرنی پڑے گی۔

ایک لولا ملک کے اندر ہمیشہ ہوتا ہے۔ جو مفاد پرست، ابن الوقت، راشی، بد معاہدہ اور خود غرض ہوتا ہے۔ اپنی کمائی ہوئی ساری گندمی بھی حکومت کے دست بین میں ڈال کے سرخرو ہو جاتا ہے۔ حکومتیں عارضی ہوتی ہیں، افراد مستقل ہوتے ہیں۔ اب تم آرڈو ڈانجسٹ کے ذریعے ایسے کمروہ رویوں پر بات کرو۔ وہ رویے جو ہمارے بزرگوں کی میراث تھے۔ رویے جنہوں نے پاکستان بنایا، پاکستان کے لیے خون بہایا۔ رویے جو آج اجداد کی حویلیاں پاکستان پر قربان کر کے آئے۔ جنہوں نے نظریہ پاکستان پر حلف اٹھایا، صداقت، دیانت، امانت اور محبت والے رویے! ان کو دہرانے کی ضرورت ہے۔ معاف کرنا میں خط لکھتے ہوئے جذباتی

ہوگئی۔ تمہارے لیے بے شمار آن گنت دعا کیں۔

(شرقی زمین۔ وطن دوست، برقی قومی، اسمبلی لاہور)

وزیر اعلیٰ پنجاب کی توجہ کے لیے

ملتان روڈ کے ساتھ سروس روڈ کی ضرورت

آپ کے موثر رسالے کی وساطت سے وزیر اعلیٰ پنجاب کو ایک نہایت اہم مسئلے کی طرف توجہ دلا نا چاہتا ہوں۔ گروڑوں روپے سے تعمیر کردہ ملتان روڈ کے دونوں اطراف سروس روڈ کی کمی شدید طور پر محسوس ہوتی ہے۔ براہ کرم اس طرف توجہ دیں۔ سینئر ٹیکسٹری اور واپڈا کے دفتر کا کچھ حصہ سروس روڈ کی زمین پر تعمیر کیا گیا ہے۔ اسے اگر ملتان چوکی سے سکیم موڑ تک بالکل سیدھی سڑک بن جائے گی۔ اس طرف فوری توجہ دیں، آپ ہی یہ کام کر سکیں گے۔ جس طرح آپ نے ملتان روڈ کا بظاہر ناممکن کام ممکن کر دکھایا۔ لیکن سڑک کے درمیان سے جگہ جگہ گٹ اور موٹر سائیکل سواروں کی ملتان چوکی سے مسلسل ون وے کی خلاف ورزی کی گئی تھیں حادثات کا باعث بن چکی ہے۔ میری تجویز ہے کہ دو چار روز منصوبہ چوک پر شام کے بعد چوکی وارڈن حضرات کی ذمہ داری لگی رہے تاکہ انتہائی خوفناک طریقے سے ون وے توڑ کر گلزار منصورہ مرنے والے سواروں کو روکا اور سمجھایا جاسکے۔ یہ ان کی جان کی سلامتی کے لیے ضروری ہے اور قانون کی قفل داری کے لیے بھی۔ اسی طرح سبز و زار مرکز کی تالے (بکر منڈی) کے محل سے سڑک کا تھوڑا سا حصہ باقی ہے۔ اسے ہٹا دیا جائے تو لاہور پانی پانی شیر ااکوٹ ٹول پلازہ تک پہنچنا بے حد آسان ہو جائے گا۔ جب شیم خانہ اندر پاس بنے گا تو یہ بے حد مناسب متبادل راستہ بن جائے گا۔

(اویس خان، سبز و زار، لاہور)

کتاب بینی کا مستقبل

رسالے کی بہت بڑی فانی قاری ہوں۔ اب اس میں تبدیلی اور موضوعات کی تبدیلی بھی بہت اچھی لگ رہی ہے۔ مگر ایک بات سوچ کر دل بہت پریشان ہوتا ہے کہ اب کتنے

لوگ ہیں جو اخبار اور رسائل کا شوق رکھتے ہیں۔ ہم تعلیم یافتہ لوگوں کو بھی دیکھیں تو وہاں اخبارات اور رسائل کی طرف سے توجہ سے کم ہو کر فی وی ساری توجہ کا مرکز بننا نظر آ رہا ہے۔ گھر میں رکھی کتابوں کو دیکھ کر دل ڈوب جاتا ہے کہ ہم جس قدر شوق سے اپنی کتابوں کی الماری سیٹ کرتے اور کتب پڑھتے ہیں، ہمارے بچے کمپیوٹر اور موبائل کے اس قدر شوقین ہیں۔ یہ ہی نہیں ان کے وقت کا بیشتر حصہ صرف جاننے پر خرچ ہوتا ہے۔ ان معلومات کو وہ کہاں استعمال کریں گے یا کر رہے ہیں ہمارے لکھنے والے اور آج کا متحرک اور غالب میڈیا وہاں خاموش ہے۔ کوئی نہیں بتاتا کہ اس قدر معلومات فائدہ مند بھی ہیں یا نہیں۔ معلوم نہیں ان معلومات سے معاشرہ، اخلاقیات، فرد پر کیا اچھے یا بُرے اثرات مرتب ہو رہے ہیں؟ بظاہر اس کا جواب ہمیں ہر روز سڑک، مارکیٹ اور عام میل جول میں مل جاتا ہے۔ دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو سراسر علم اور جاننے کے شوق سے بے پیر ہیں۔ لہذا ان کی اخلاقیات، معاشرت دونوں ہی سوالیہ نشان ہیں اور بحیثیت مجموعی یہ ہمارا غم ہے کہ علم بھی ہے مگر عمل اور عمل صالح دونوں ناپید ہو چکے۔

(علوی نصیر ملک، لاہور)

خوفزدہ کر دینے والے سپید

بریکروں سے بھرا شہر

میں ڈرائیونگ میں اتنی فی بھی نہیں ہوں۔ گاڑی اچھی چلا سکتی ہوں بچوں کو سکول لے جاتی ہوں مگر سڑک کے گھر مٹنے جانا چلو سو مار سو چٹا پڑتا ہے۔ برقی میں ۱۰ مار سے ۲۰ جگہ انتہائی فضول قسم کے سپید بریکر بنے ہوئے ہیں۔ یہ کیسا شہر



حوالہ میری پسند کا - احتجاج احتجاج!

ماہ فروری کا ڈائجسٹ لیا، تو سب سے پہلے اپنا پسندیدہ سلسلہ دیکھا مگر وہ جنیں ملا۔ حوالہ میری پسند کا نام بھی اچھا تھا اور کلام اور انداز خوش کش تو ہے حدِ عمدہ تھی۔ جناب سے گزارش ہے کہ اس سلسلے کو جاری رکھیں۔

(خلک صاحب! سلسلہ تو یہی ہے حدِ پسند ہی ہے شروع کیا تھا بحرِ بحرین اکثر شعرا کا مطالعہ ہوتا ہے کہ ہماری اپنی شاعری سنے لیں، وہ سرائی کی شاعری نہ سنے اور پسند کرنے پر مجبور نہ کریں۔ پہلے تو ہر مذاق دیکھتے تھے مگر وہ تو کلام اس سلسلے سے توجید ہوتے ہیں۔ نثر پھر سے کوشش کرتے ہیں۔) (سین الاذ خلک! بیگم کوٹ (لاہور))

قومی لباس کی بے توقیری بند کرو! نعیم

ایک بات معاشرتی حیثیت سے جس کا تعلق ہے جس کی طرف کسی کی اپ توجہ نہیں گئی، وہ آپ کے ذریعے اور آپ اختیار کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔ رسالوں، اخبار اور ٹی وی کے ذریعے دیکھتا ہوں کہ نہ صرف قصر صدر، قصر وزیراعظم اور اعلیٰ درجے کے ہوتلوں میں سیاسی رہنما سوٹ پہن کر کرسمس پر براہِ جہان ہوتے ہیں جبکہ قومی لباس شیر وانی گاڑی یا جناح کیپ پہنتا کر چوکیداروں کو ان کے پیچھے کھڑا کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ عدالتوں میں بھی یہی حال ہے۔ اس طرف توجہ کی ضرورت ہے۔

(ذہر صاحب! بہت اچھی رنگ پر ہاتھ دکھاتے آپ نے۔ عدالتوں کے اندر معزز ججز کو قومی لباس پہنا کر اس لباس کو عزت اور وقعت دینی چاہیے۔ مجلسِ مجسٹریٹس سے ججز کے لباس پہن کر پادروں و قارندیس گے۔ وہ پانچ بجے ہوتے ہیں کہ ہر ہون یا ہونوں کی راہروں میں قومی طور پر ان کو خرمی قلم سوٹ پہنا دینے چاہئیں۔ ماز اور رنگ چھوٹا نہ کریں۔ چاہے تو سر پر ہیبت بھی کو پہنا دیں کوئی مصلحت نہیں۔ طالعِ ستار ہونوں کے اندر و بیروں کو لٹے، چھوٹے، عجیب عجیب طرح اور رنگوں کے سوٹ پہنا دینے چاہتے ہیں۔ وہ پانچ کالو کا پڑا یاں اور شیر وانی پہنا کر وہ انوں پر کھڑا رکھنا جان بوجھ کر یا ناواقفانے لباس اور شجر کی تین کرتا ہے۔ اسی طرح چوب داروں کو واسکت پہنانا اور پاؤں کو سوٹ اور پتلونیں سوٹ نہ کر دانا اس کو بھی سدھارنے کی ضرورت ہے۔ خاص طور پر ملازمین کی وجہ بدعنوانی میں ازم کر کے بے وقوف کرنا ہر حال پائے نہیں۔) (سیہ محمد ذہر، کراچی)

ہے جس کا جی چاہے اور جب چاہے سرگ پر قبوستان کر رہا رہے بند کر دے۔ نہ کسی اجازت کی ضرورت نہ عوام کی مشکل اور وقت کا خیال۔ اسی طرح اپنے اپنے گھروں کے باہر انوں کو جوڑ کر اوپر سینٹ، بجری قنوپ کر سپیڈ بریکر بنادیتے ہیں۔ حکومت کو چاہیے اس لاقانونیت اور شہریوں کے حقوق کے خلاف کیے گئے کام کو فوری طور پر ایک بلڈوزر چلا کر سرکیں اور گھیاں صاف کر دے۔ یہ اندامیں مجھ سے تو کیلک جگہ ہر سپیڈ بریکر پر گاڑی بند ہو جاتی ہے۔ کئی بار لوگوں کو موت کے عمل کرتے دیکھ کر میں کتنی دیر خوفزدہ بھڑکی رہتی ہوں۔ تنگ آکر خدا اللہ رہی ہوں۔ سمجھ نہیں آتی یہ مسئلہ کس سے حل کروایا جائے۔ جو سب کا مسئلہ ہے۔ حکومت کو ٹی فون نمبر ہی دے دیا کرے۔ (یعنی ٹی۔ نیو مسلم ٹاؤن، لاہور)

اللہ کرے مجھ پر بھی خیر کا سایہ پڑے

میں آپ کی تدوین سے شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے ۲۰۱۲ء کے پہلے شمارے میں ان شخصیات کی فہرست میں شامل کیا کہ جن کے ساتھ اپنا نام دیکھ کر نہ صرف مجھے بہت خوشی ہوئی بلکہ یہ احساس بھی ابھرا کہ یہ لوگ مجھ سے کہیں بہتر اور آگے ہیں، میں آپ کی بہت ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے پاکستان کے عظیم لوگوں کے ساتھ وابستہ کیا۔ اللہ کرے ان لوگوں کی وسالت سے مجھ پر بھی خیر کا سایہ پڑے۔

کیا کہوں، آپ کا ڈائجسٹ اور اس میں شخصیات کا یہ ہالہ ہر اعتبار سے قابلِ قدر ہے۔ یقیناً پچھلے ۵۲ برس میں جو خدمات اُردو ڈائجسٹ نے قارئین اور پانچوم امت کے لیے کی ہیں وہ قابلِ ستائش ہیں۔ اللہ آپ کو آسائیاں عطا کرے اور آسائیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ آمین۔

(بالو قدسیہ - داستان سرا کے ماڈل ٹاؤن، لاہور)



ایسا کل میرے کس کام کا

بچایا گیا جائے۔ سی این بند کر کے دوسرا چینل آن کیا گیا تو وہ ہندی ڈانگ میں تھا۔ بچیوں کو خوب پسند آیا۔ ہر بات سمجھ آ رہی تھی اور ساتھ میں ہندی بھی زبانوں پر آ رہی تھی۔ یہاں سے ”پاکو“ پر منتقل ہوئے۔ بظاہر بڑا تعلیقی شخص ہے۔ بچوں میں مقبول بھی بہت ہے۔ نام اور چیری سے، پوپائے دی سٹرنگ کو معاملہ ٹھیک رہا پھر اچانک ”کرشنا بطرام“ آ گیا۔ ۲۴ رومنٹ دوراے کی یہ ۲۶ کہانیاں تھیں اور ان کا ہدف یا ٹارگٹ آؤٹنیز تھے ۶۷ سے ۱۲ سال کے بچے۔ کرشنا ہندوؤں کا جھواں اداکار ہے۔ اسے ایک Devine Hero، اچھے بچے اور مثالی دور (Lover) اور Pranstar کا رول بخش گیا۔ یہ ڈیٹکو ہارواؤں کو ہرانا ہے۔ بطرام اس کا بڑا بھائی ہے۔ واسو دیو اور دیو کی کا ساتواں بچہ جو ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق ”عجراتی طور“ پر دیو کی کے پیٹ سے روٹی کے پیٹ میں منتقل ہو گیا تھا۔ وہ بھی واسو دیو کی بیوی تھی اور کوئل میں رہتی تھی۔ بطرام کو پیٹے رانا کہتے تھے اب طاقت کے سہل کے طور پر بطرام کہا جاتا ہے۔



در دل پیہ
دستک
اختر عباس

یہ ۲ بڑا رسالہ اپنی ہندوستان کی ایک ریاست ڈھولک پور کے راجہ اندور اور اس کی بیٹی اندوتی کی کہیں بلک ان کی رعایا میں سے ایک بہادر بیٹے بھیم کی ہمت، طاقت اور شجاعت کی داستان تھی۔ ۹ رسالہ بھیم کو راجہ نے چینی ریاست کے راجہ کی درخواست پر ہاں نہیں کہا تھا جہاں جا کر بھیم نے کٹافو سے لے کر ہر ضروری چینی داؤ پیچ سیکھا اور پھر وقت مقررہ پر ریاست کے دشمن سے لڑ کر اسے شکست سے دو چار کیا۔ چینی ریاست کا راجہ کٹافو بڑا درگ و عوام بھی اس جت پر تائیاں، ہمارے بچے کہ بھیم نے کس خوبی اور مہارت سے دشمن کو خاک چٹا دی تھی۔ تائیاں بچانے والوں میں میری ۳ رسالہ ”پنی“ اور ”رے ترشین“ (ٹیکوں کی روشنی پھیلانے والی) بھی شامل تھی۔ جس نے گھر پہنچ کر بریف کیس رکھتے رکھتے مجھے کھینچا تھا۔ ”بابا! بھیم آن چین گیا ہوا تھا۔ ان بے چاروں کی مدد کرنے۔“ یاد رہے بھیم ان ”چینی بے چاروں“ کی مدد سے ایک دورہ دے پہلے عربوں کی مدد کے بڑے کامیاب دورے سے لوٹا تھا۔ ”پاکو“ چینل سے ٹیلی کاسٹ ہونے والی ”چینا تا بھیم“ کی جدول میں بڑی سی کہانیاں میرے بچے کچھ حرفہ لفظ لفظ بلکہ سینا سینا (مراؤ سین ہیں) دکھائی دیتے تھے۔ ان سے تو میں نے نہیں کہا، کیوں بھی تو کیا، میری البیہ کہتی ہیں اس طرح کی بات سمجھنے کے لیے بچے بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ اسی لیے وہ انہیں کچھ کہنے کے بجائے چینل بدل دیتی ہے۔

کارٹون نیٹ ورک (CN) پہ بچوں کے کارٹونوں پر ہر کچھ دیر بعد کارٹون بچوں کو بڑے سکون سے Kissing کرتے دیکھ کر بچوں کو کم بڑوں کو کوفت زیادہ ہوتی ہے۔ کارٹون کردار اگر لڑکے تو پورے پکڑے اور اگر لڑکی ہے تو ان کی کوشش ہوگی کہ کپڑے نام کی دھجی بنانے پر جتنا رنگ لگتا ہے، اس کو بھی

اس سے فوراً بھاگے تو سامنے چھوٹا بھیم سگڑا کھڑا تھا۔ یہ بڑے دل والا، ہمیشہ دوسروں کی مدد پہ آمادہ رہنے والا، ۹ رسالہ لڑکا ہے۔ اسے لہو بڑے پسند ہیں اور پاپائے دی سٹرکی پالک کی طرح لہو کھا کر طاقتور ہو جاتا اور دشمنوں کو فنا کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔ یہ لہو اس کی دوست چنگلی اسے دیتی ہے۔ اس کے ۲ دوست اور بھی ہیں۔ ۵ رسالہ راجو (جو ڈھولک پور کی فون کے بیٹا چچی (سپر سالار) کا بیٹا ہے اور بھیم کو رول ماڈل سمجھتا ہے۔) جکو (ہندو ہے اور انسانوں کی طرح بولتا ہے)۔ یہ سب ہر مشکل میں ساتھ رہتے اور ایک دوسرے کے کام آتے ہیں۔ کالیالوں سے اور ان کو تکلیف پہنچانے کا کوئی موقع جانے نہیں دیتا مگر بھیم

ہر بار ان کو بچا لیتا ہے۔ مجیم نے سختی ہی بار اپنی ریاست کے دشمنوں اور حملہ آوروں کو شکست دی ہے۔

دل کی بات کہوں تو مجیم نے ہم سب کو بھی شکست سے دوچار کیا ہے۔ ہمارے فکری راہنما مذہبی سیاسی جماعتیں، میڈیا کے بڑے بڑے گروپ، سب کو کھچ چا رہے کے ہرایا ہے۔ شکست کو ماننا اتنا آسان نہیں ہوتا مگر یہ ہوا ہے۔ چلیں چھپلے ۶۰ سال کو چھوڑ دیتے ہیں۔ میڈیا کے عروج اور افتخار کے دنوں کو ہی دیکھ لیں۔ کوئی ایک ڈراما، کوئی ایک کہانی، کوئی ایک کارٹون ہی قوم کو ایسا دیو کہ آپ کے بیٹے دیکھ رہے ہوں اور آپ کو ٹی، آسمانی اور اطمینان کا سانس لے سکیں۔ کوئی کارٹون کچھ کر جسے تحقیقی طور پر نگل گیا ہوتا۔ بہترین دماغوں نے سوچا اور بنایا ہوتا۔ پرفیشنل تیار کیا گیا ہوتا۔ خبروں کے سچ میں ہندوستانی فلموں کے کانوں کے نوٹے چلانے میں کون سی تحقیقی سوچ کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ فلموں کے آئینم ساز جو اپنے بچوں کو کیا چیزوں کو بھی دکھاتے ہوئے سو پار سو چتا ہے۔ آپ نے معمول کی خبروں کا انٹرمیٹ کے نام پر حصہ بنا کر گھر پہنچا دیا اور پوری قوم کی جھجک اور شرم ہی ختم کر دی۔ کسی ایک پروڈیوسر کی ذہنی قی کے ایسے مقابلے پر ہم کیسے غفلت سمجھتے ہیں اور پھر اس دوز میں شریک ہو جاتے ہیں۔ انڈیا کے بچے پیدا ہونے کی تسخیل سے لے کر پاشا پاسو کے بغیر شادی کے مختلف لوگوں کے ساتھ رہنے کی تصویریں جھلکیاں دکھانے میں کون سی خبریت اور تخلیقی پن کا اظہار ہوتا ہے۔ انسوس کی بات تو یہ ہے کہ ایسی حرکتوں پر شرمندہ ہونا تو دور رہا افسردہ بھی نہیں ہوتے۔ کانوں کے ٹوٹوں سے جو سلسلہ شروع ہوا تھا اب بغیر قنونی یا قانونی طور پر ہر چھوٹی سے روزانہ بھارت کی نئی فلمیں دکھانے کی دوز تک جا رہا ہے۔

۹۰ کی دہائی میں مجھے کئی سال روزنامہ نوائے وقت کے ٹچرل صفحے پر کالم لکھنے کا موقع میسر رہا۔ بی بی سی دہلی اور سنٹر آتے جاتے پتا چلا کہ ہر پروگرام، ڈرامہ اور سٹی کی اشتہار بھی سنہر ہوتا ہے۔ اشتہار ریڈیو ہونے کے باوجود لیبل کا سٹ نہ ہو سکتا تھا جب تک اسلام آباد مرکز سے سنہر ہو کر اجازت نہ مل جاتی۔ اسی ہفتے رات دیر گئے گھر پہنچا تو چھین بدلتے ہوئے "ہم" پر رکنا پڑا۔ تیش دیش کھی فلم کا آغاز ہو رہا تھا اور وہ دفتر جانے سے پہلے دیوار پر لگی ایک نیم مریاں نہیں مریاں تصویر کی ناگھوں کو

برکت کے لیے پوج کر مقررہ رات ہو رہا تھا۔ اس کی تسلی نہیں ہوئی تو دوبارہ پلٹ کر آیا پھر اسی عمل کو دہرایا۔ یاد ہے یہ چینل پاکستانی شواتین کا چینل ہے۔ اس کی سربراہ ایک خاتون سلطانہ صدیقی ہیں۔ اس کی پروڈیوسر ڈان کی ۲۰ بہنیں ہیں۔ کیا انہوں نے کسی "سیلف سینٹر" نام کی کمی چننا یا کھانا نہیں سنا۔

کچھ عرصہ قبل انڈیا جانے کا اتفاق ہوا۔ رات شملہ میں گزری، منجائی و فی آئی کیا تو سم سے کم ۱۸۰ چیل ایسے تھے جن پر ان کی مذہبی رسومات اور جن جاری تھے۔ آپ جن کو رول ماڈل بناتے ہیں، جن کی پیروی کرتے ہیں، انہوں نے اپنی مہابھارت سے لے کر شیوایی کو اس خوبصورتی سے بنایا اور چلایا ہے کہ بقول ان کی سب سے نمایاں پروڈیوسر ایکٹایو کے "ہمارا فرض تھا کہ اپنی اقدار کو دامنوں کا حصہ بناتے۔ ہم نے مہابھارت کے کرداروں کو بھی آج کے عہد کے دلائل دے کر قابل قبول اور پسندیدہ بنا دیا ہے۔"

دور کیوں جاتے ہیں مجیم کو ہی لے لیں۔ آدھرا پردیش کے ایک قصبے سکندر آباد میں قائم گرین کولڈ اپنی میڈیٹھ نے ۲۰۰۸ء میں ایسے ای ائی اور ایجوچیکل کے ایڈلے پر بچوں کے لیے اس تخلیقی کریمینے کا کام شروع کیا۔ یہ مہابھارت کے مشہور کریمٹر کا بچپن ہے جو دنیا کا سب سے مضبوط انسان مانا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں نہیں اس پر فخر ہونا چاہیے کہ چھوٹا مجیم انڈیا کے کچھ اور روایت کا اظہار ہے۔ چھوٹا مجیم اس وقت انگریزی، ہندی، تیلگو اور تامل زبانوں کے بچوں کی پرائیویٹ اسکول میں دستیاب ہے اور مقبول بھی۔ آئی پیڈ پر اس کی آئی ٹیوٹز دستیاب ہیں۔ انڈیا کے چھوٹا مجیم کے جن شیڈز، گھڑیاں، سکول، بیگز، کی پین، وی وی وی وی، ڈی ڈی، فوٹو فریم، بیس بیگز، بیس جیس، ایکٹیوٹی بکس اور شرس دستیاب ہیں۔

۱۰۰۰ سے زائد بچوں کی فری گیمز کے علاوہ کوئی وی پر ۲۲ منٹ دورانیے کی مجیم کی وہ تمام کہانیاں بھی جو ملی کا سٹ ہو چکی ہیں، دنیا بھر کے بچوں کے لیے موجود ہیں۔ چھوٹا مجیم اور اس کے معروف کرداروں کی ایک لاکھ بارہ ہزار تصاویر کا البم الگ سے ڈاؤن لوڈ کیا جاسکتا ہے۔

ہندوستان کے ہندو حلقہ کاروں کی طرف سے اپنی قوم کے لیے یہ ایک یادگار اور بقول ان کے عظیم تحفہ ہے جس نے ان

سربراہ پرویز مشرف صرف سیاسی ترقی دینے کے لئے اور بے مغز و خائنیت دینے میں ۱۲ سال گواہ بنے ہیں۔ پوائنٹ سکورنگ سے بھی کبھی زندگی کی سنجیدہ مسائل حل ہوتے ہیں۔

جماعت اسلامی اپنی پرانی اور نئی محنتوں کو ترازو میں ڈالنے اور برابر رکھنے میں مصروف ہے۔ امیر اعظم فیوجہ وطن میں کچھ کر سکتے تھے۔ سالوں پہلے ایرانی فتنوں کی آواز دے دینا پڑا انہوں نے کام شروع کیا تھا جو سیاسی مصروفیات نے کھالیا۔ کراچی میں ادارہ معارف اسلامی کے سربراہ شاہد باغی پیش رفت کر سکتے ہیں اور کس سے کہوں، کس کا سوچوں۔ کاش کسی پروڈکشن ہاؤس کے مالک کو سمجھا سکتا۔

کبھی کی سوچوں کے جہاز اپنے مطلب کی سوار یوں سے بھرے کھلے سمندروں میں بے سمت چلے جاتے ہیں۔ کیا براہ راست ”شیپنگ ڈیفوج“ تعمیر مستقبل کا پرچم لہانے والے، باکمال ادارے آفاق کے کسی ای او ای، ابراہارے سبوں، یا خواہوں کی اٹلی چکرے ملک ملک پھرنے والے شاہد واری کو آواز دوں کہ بحیم نے اپنی مضبوطی سے مجھے، میرے اپنے بچوں کے سامنے مار کر لیا ہے۔ مجھ جیسے کتنے ہی باپ سر جھکائے، ہاتھ پھیلائے، شہر میں کہ اتنی بڑی بڑی سیاسی و مذہبی جماعتوں، اتنے بڑے چیئرمینوں، کاروباری و تعلیمی اداروں، تحقیق کاروں، ہنرمندوں کے جھوم جھوم کسی کا ہاتھ بڑھے، ہمیں اٹھائے، یقین چاہے نہ دلائے کس کچھ کر دکھائے، بہت ہوئی۔ میرے بچوں تک معاملہ رہے تو اچھا ہے۔ بچوں کے بچوں تک بات گئی تو ایسا کھل میرے کس کا کام۔

دکھ اور حسرت میرا دل تو یہ بھی سوچتا ہے کہ ہمارے اکثر کاروباری ادارے اپنی مصنوعات کے اشتہار ہندوستانی اداکاروں سے، صداکاروں، ہندوستانی صداکاروں سے، موسیقی وہاں کے گلوکاروں سے اور سکرپٹ انجی کے تخلیق کاروں سے کروانے دیتی اور ہمیشہ پچھتے ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے کہ جو اس خواہش اور کام کو کارپوریٹ سوشل ریسپانسیبل (CSR) سمجھ کر ہی کچھ ڈرامے اور کارٹون فلمیں ان سے بنوا دے۔ میں نے تو ان کا ہاتھ میوٹ کر لیا ہے۔ کیا کریں تاریخ میں یہی بتاتی ہے۔ اپنے خدا، اپنی تہذیب، اقدار، روایات اور تاریخی کرداروں کو بھلانے والوں کو ہمیشہ دوسروں کے ہی کردار اور پتے نوٹ کرنے پڑتے ہیں۔

کی مہابھارت، اقدار، روایات اور کرداروں کو تھپ زخمہ کر دیا جب سب آؤٹ آف فیشن ہو رہا تھا۔

اس سے اگلے مرحلے میں اب کہانیاں میں بحیم کے ساتھ کرشنا بھی شامل ہوا کرے گا۔ جب یہ ایک Unstoppable Force بن جائیں گے۔ ان کے عقیدے کے مطابق کرشنا بنگالوں ہے۔ وہ ۱۲ سال لڑکے کرشنا کے روپ میں مجبور انسانوں کی مدد کو آتا ہے۔

بحیم بھی کیا لوگ ہیں۔ نہ اپنے خدا کو مانتے ہیں۔ نہ اس کو اپنی زندگی اور کرداروں میں آنے دیتے ہیں۔ نہ اپنی تاریخ اور روایات کو تسلیم کرتے ہیں نہ ان کا تذکرہ ہونے دیتے ہیں۔ نہ اپنے ملک کو مانتے ہیں نہ اس کی جڑوں کی مضبوطی کا سوچتے ہیں۔ ہمیں تو ۲۰ سالوں میں سیاست کرنی بھی نہ آئی کہ ۱۴ لوگوں کو رول ماڈل بنا سکتے۔ نہ ملک چلانا آیا، آواز نہ دینے اور اب آدھے کو بچانے کے لیے چند نو عمر بلوچی لڑکوں کے ہاتھوں پر غلام بننے چاہ رہے ہیں۔ نہ میڈیا چلانا آیا، بات تو جب تھی کہ لوگ آپ کے ڈراموں، براکراموں اور فلموں کو اپنے ہاں دکھاتے۔ اپنی خبروں میں آپ کے کارنامے چلاتے، جوتیہ ہے کہ اپنے بچوں تک کو دکھانے کے لیے ایک کارٹون فلم، ایک کارٹون سیریز تو دور کی بات ہے ایک کارٹون کرینیکل میں بنا پائے کہ جس کو چار بیچ اپنا رول ماڈل ہی بنا لیتے۔ بزنس کرنے والے اس کی فی شرٹوں کو تین تین سو ڈالروں میں ٹیٹ پر بیچ رہے ہوتے۔ چار چار پانوں میں اس کے ترسے ہو کر یک رہے ہوتے، کتابوں، اخباروں میں اس کے پوسٹر ہوتے۔

ہاتھیں سڑک سڑک ڈیڑھ کی اور دعوے سارک اور دنیا بھر کے مسلمانوں کی قیادت کرنے کے اور حالت یہ ہے کہ ایک بحیم نے سب کو کچھ پورا رہے کے مار گرایا ہے۔ ہینڈل پائی، کبھی اس کے اندر بڑے انتہائی لیڈر اور نگہداری ہوتے تھے، نیا سوچتے اور خوب بولتے تھے۔ کوڑے بھی ان کو اپنی سوچ سے نہ بنا سکے تھے، آج ملک کے مالک ہیں۔ شمال سے جنوب تک ان کے پرچم لہراتے ہیں۔ انجی کی داستانیں اور انجی کے کارنامے ہیں۔ کاش اسی کے کسی لیڈر نگہداری کو اپنی قوم کی محبت اور مستقبل میں بھاتا ہوتا۔ میاں صاحبان کی مسلم لیگ (ن) احسن اقبال کی سربراہی میں ۵۰ سالہ وزن سوچا کرتی تھی، سب خواب ہوئے۔ پنی وی کے سابقہ

